UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222854
UNIVERSAL
LIBRARY

جملہ حقوق محفوظ ہیں

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم۔ بی۔ اے

جلد ۴۰ | جنوری سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

تصاویر (۱) الزمخشری (۲) مقبرہ شہنشاہ اکبر (۳) غازی مصطفےٰ کمال پاشا اور انکے ساتھی (۴) سرعبدالقادر اور مسٹر داس اور انکی اہلیہ و فرزند

۱۔ مقبرہ شہنشاہ اکبر
از حکیم عبداللہ قادری صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ایل ٹی ۱

۲۔ دماغی غلامی
از خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں ۱۲

۳۔ ہندوستانی پریس کی حالت
از مسٹر گلبرٹ سی۔ ای۔ ای۔ ۱۹

۴۔ محلات شاہی میں محبت
از مولانا محمد حسین محوی لکھنوی ۲۵

۵۔ شیلے
از منشی افضل رسول چغتائی ۳۱

۶۔ مان یا ڈائن
از مسٹر گوپال کرشن داس۔ ۳۴

۷۔ تنقید کتب
از حضرت آغنی ۵۱

۸۔ سہاگن بیوہ
از حضرت جوش بلیخ آبادی ۵۷

۹۔ سبز باغ
از حضرت ح۔ م۔ ع۔ لکھنوی ۶۰

۱۰۔ لطف سخن
(۱) جناب مرزا یاس لکھنوی (۲) جناب منشی مرزا رسوا (۳) جناب احسن بیگ ۶۲

۱۱۔ رفتار زمانہ
... ... ۶۵

۱۲۔ علمی خبریں اور نوٹ
... ... ۶۹

۱۳۔ عرض حال
... ... ۷۱

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

معمولی اڈیشن

قیمت سالانہ ۴ روپیہ

سندری سہاگ کی تعریف مہنوں کے قلم سے!

وہ کون تیل ہے؟

سندری سہاگ کے بابت غریدار کیا کہتے ہیں؟

جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب اسسٹنٹ سرجن کرنال مہربانی فرماکر چھ شیشی سندری سہاگ تیل اور روانہ فرماکر مشکور فرمائیے پہلے بھی سندری سہاگ منگایا تھا اسے جس جس نے لگایا اُسکے بال گھنے اور لانبے ہوگئے اس لیے پھر دوبارہ تکلیف دیجاتی ہے

سپرنٹنڈنٹ صاحب کورٹ آف وارڈس ریاست اودھین۔ آپکے یہاں سے تیل سندری سہاگ منگایا تھا۔ واقعی عمدہ تیل ہے اشتہاری دواؤں سے اور تیل وغیرہ سے مین ہمیشہ پرہیز کرتا تھا مگر آپکے تیل نے ظاہر کردیا ہے کہ ابھی ہندوستان مین کچھ آپکی باقی ہین اسکے ملاحظہ کے بعد بھی سندری سہاگ منگائینگے تعل ہے؟

ملنے کا پتہ۔ ایس۔ ایل بخشی اینڈ کو موجد سندری سہاگ تیل کوٹھی نمبر ۶ کولوٹولا اسٹریٹ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۱۱ کلکتہ

سندری سہاگ کی تعریف مہنوں کے قلم سے!

زمانہ

Check

مرتبہ و بانی نگم - ایم - اے

جلد ۴۰ | فروری سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

تصویر - اُمید

۱- فاسل
از جناب حیدر یار جنگ سید علی حیدر طباطبائی ۷۳

۲- کھلا ہوا راز
از پنڈت پربھودیال مصرشاں لکھنوی ۸۲

۳- ہندوستان میں روزنامچہ نویسی
از مسٹر مطلب حسین - عالی ۹۱

۴- دیانہ کا مندر
از حضرت نصیر بھاگل پوری ۹۶

۵- باغ جہاں آرا
از حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی ۱۰۰

۶- قربانی (قصہ)
از مسٹر گوپال کرشن یاس ۱۰۴

۷- تنقید کتب
از حضرت اعظمی ... ۱۰۹

۸- پیام دمن
از منشی رگھونندن پرشاد اندر ۱۱۳

۹- بسنت آیا -
از منشی تلوک چند محروم ۱۱۶

۱۰- دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں
از مسٹر صدرالدین سرشار کسنادوی ۱۱۷

۱۱- اپنے وطن پہ صدقے -
از حکیم اعظم گڈھی ۱۱۸

۱۲- جذبات حسن
از حضرت مجنوں گورکھپوری ۱۱۹

۱۳ لطف سخن
(۱) جناب پنڈت لکھنوی (۲) جناب چاند (۳) جناب جوش
(۴) جناب آزاد (۵) جناب نظر لکھنوی (۶) جناب حسن بمبئی
(۷) جناب برق ۱۲۰

۱۴- جلوہ گاہ اثر
از جناب احسن بمبئی ۱۲۳

۱۵- علمی نوٹ اور خبریں
... ... ۱۲۴

۱۶- بزم احباب
... ... ۱۲۸

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت فی نمبر ۱۲ آنہ

قیمت معمولی ایڈیشن
ممالک غیر سے سلے ۱۵ سالانہ ششماہی فی روپیہ - ہندوستان کے لئے ششماہی ۱۲ آنہ

دواخانہ فراق

جناب خواجہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کے کمالات سے سارا ہندوستان خبردار ہے۔ جس طرح آپ ایک انشا پرداز اور شاعر جادو نگار ہیں ایک صوفی صافی ہیں۔ اسی طرح آپ ایک طبیب ایک حکیم ایک معالج باکمال ہیں۔ اور اسی فن کے تجربہ میں ساری عمر گذاری ہے۔ آپ نے ہندوستان اور ممالک میں چل پھر کر اور مقامات کے طول البلد عرض البلد کو جانچ کر دوائیں بنائی ہیں اسی سبب سے وہ خلاصیں کرتی ہیں۔ اور ایک دواخانہ آپ نے قائم کیا ہے جس میں آپ کے مجربات اور ہر قسم کی ادویہ مہیا ہیں اور سب کی سب سچی اور بے ضرر ہیں۔ اس دواخانہ کی غائت یہی ہے کہ مخلوق اُن لوگوں کی جھوٹی دواؤں سے اپنے تئیں محفوظ رکھے جو نہ حکیم ہیں نہ ڈاکٹر ہیں نہ کیمیا ہیں اور روپیہ کمانے کے لئے جال پھیلا رہے ہیں۔ اگر سچی اور اچھی دوا گھر بیٹھے منگا کر صحت و سلامتی کے طالب ہیں تو حضرت فراق کے دواخانہ سے منگائیے۔ اس دواخانہ میں اتنی دوائیں مہیا کی گئی ہیں کہ اگر سب کی تفصیل لکھی جاوے تو بڑی کتاب بنے بالفعل چند مجربات کے نام اور مختصر افعال و خواص ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔ باقی اہل حاجت کو جس قسم کی دوا مطلوب ہو بذریعہ ویلیو طلب فرمائیں۔ فوراً تعمیل ہوگی۔

حب اشراق - یہ گولیاں اپنی تاثیرات میں نادر اور یکتا ہیں انسان کے جملہ امراض اور بیماریوں پر حاوی ہیں۔ عورت مرد جوان بوڑھے بچے کو ہر موسم ہر زمانہ میں مفید ہوتی ہیں۔ سودا دی بلغمی دموی صفراوی ریاحی نکالتیں دور ہو جاتی ہیں۔ خون صاف ہو کر رنگ انار کے دانہ کی طرح سرخ ہو جاتا ہے۔ بھوک لگتی ہے۔ نیند وقت پر آتی ہے۔ قبض کو دفع کرتی ہیں۔ اگر پیٹ نرم ہو تو باندھ دیتی ہیں۔ [illegible] دولا و تندرست پیدا ہوتی ہے۔ ایک چلہ تک انکا استعمال ضرور ہے۔ پرہیز مطلق نہ کیجئے۔ یہ دوا لانانی [illegible] پرانے ناسور بھگندر اور بیرنی زخم ایک چلہ میں جاتے رہتے ہیں۔ جس شیشی میں اتنی گولیاں ہیں اسکی قیمت علاوہ [illegible] اور جس شیشی میں چالیس گولیاں ہیں اسکی قیمت ایک روپیہ محصول اور خرچ بہر حال بذمہ خریدار ہوگا۔

قرص حیات - بسا اوقات میاں بیوی تخلیہ کرتے ہیں اور کچھ لذت و لطف حاصل نہیں ہوتا اور اسی باعث سے اولاد کو ترستے ہیں۔ یہ دوا انکی [illegible] لطف انگیز ہو اور عیش پرستوں کیلئے تو گویا لطف جنت پیدا کر دیتی ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

عرق - [illegible] ہر قسم کے بخاروں کیواسطے سوائے دق کے بخار کے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت فی شیشی خورد ایک روپیہ۔ بڑی شیشی دو روپیہ علاوہ محصول

آنکھوں کا اچھا علاج - آنکھوں میں پانی نہیں اترنے دیتا اترا ہوا روک جاتا ہے۔ جالہ۔ دھند۔ نگاہ کی کمزوری۔ رتوندہ۔ یا منی رکھائی۔ ناخنہ۔ اور ہر طرح اور ہر قسم کی آنکھوں کی بیماریاں کھو دیتا ہے۔ رعایتی قیمت ایک روپیہ (عہ)

طلائے احمر تکمید - مقوی باہ دوا ہے۔ اسکی خوبی اسکے نام سے ظاہر ہے۔ قیمت فی شیشی تین روپیہ (عہ)

سانس دمہ ضیق النفس - تر ہو یا خشک نیا ہو یا پرانا تین روز میں افاقہ ہو کر صحت ہو جاتی ہے۔ رعایتی قیمت اکبر روپیہ (عہ)

امساک - بسبب رقت اور کمزوری کے سرعت انزال کی شکایت پیدا ہو کر اولاد نہیں ہونے دیتی آزما کر دیکھئے عجیب چیز ہے قیمت رعائتی ایک روپیہ عہ

سلیمانی - سیفہ۔ بلغمی۔ قے۔ طاعون۔ اور حشرات الارض کے کاٹنے کو خون کے فساد معدہ کی خرابی کو دور کرتا ہے قیمت عہ

المشتہر بحکیم سید ناصر خلیق بن حکیم سید ناصر نذیر فراق شاگرد حکیم حاذق الملک عہ المجید خان صاحب دہلوی شہر دہلی کوچہ چیلان بارہ دری نمبر ۲۲

زمانہ

مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔ اے

جلد ۴۰ | مئی سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

۱- راجپوت مسلمانوں کی شدھی
از منشی پریم چند ۲۰۹

۲- میرابائی
از منشی منظور الحق کلیم ۲۱۸

۳- عقل کے اجزا
از خان بہادر مرزا سلطان احمد ۲۲۶

۴- فرانس کی ایک ملکۂ حسن
از مسٹر عبد المنعم علیگ ۲۳۳

۵- انصاف یا ظلم
از حضرت اعظم کربوی ایڈیٹر طوفان ۲۳۰

۶- انجیل کی اشاعت
از رائے بہادر پنڈت شیونرائن شبنم ایڈوکیٹ ۲۴۴

۷- مکلی کی پہاڑیاں
از مسٹر رام سروپ شرما ۲۴۶

۸- تنقید کتب
از حضرت اعظمی ۲۵۰

۹- داستان نیاز
از مولانا محمد مبین نازش ہمایونی ۲۵۹

۱۰- خون آرزو
از حضرت فہمی ترمذی ۲۶۰

۱۱- آئینۂ حال
از جناب بزمی (ڈبائی) ۲۶۱

۱۲- لطف سخن
(۱) جناب نادرت میرعلی (۲) جناب مرزا یاس لکھنوی
(۳) جناب فرنگھنوی (۴) جناب ہاجر سیوانی (۵) جناب ۲۶۲

۱۳- منشی نوبت۔ اے نظر مرحوم
... ... ۲۶۵

۱۴- علمی نوٹ اور خبریں
... ... ۲۶۸

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت اعلیٰ ۱۲ سالانہ

قیمت معمولی اڈیشن ممالک غیر سے ۱۰ سالانہ ۵ شششاہی ۵ روپیہ۔ ہندوستان کے لئے ۸ سالانہ ۴ شششاہی ۲ روپیہ

مصورِ غم علامہ اشد الجزی دہلوی کی قابل قدر تصانیف

نوحہ زندگی - ایک بیوہ کی دردناک داستان قیمت صرف بارہ آنہ ۱۲ر

ورشہوار - قابل دید کتاب ہے قیمت ۱۰ر

منازل السائرہ - اسکا مطالعہ ہندوستانی مستورات کے لیے بیحد مفید ہے قیمت ایکروپیہ عہ

ماہ عجم - فاروق اعظم کے عہد مین ایران پر مسلمانونکی فوجکشی کا نغمہ حسن وعبرت وطبل جنگ وکارزار ایک جادو کیفیا چاہو تو اس کتاب کو پڑھو قیمت عہ

گوہر مقصود - اس کتاب مین تالستان کی پری اور لال کی تلاش دو چھوٹے چھوٹے قصہ ہین پہلے قصہ مین تو یہ بتایا ہے کہ انسانی دنیا کا بہترین تحفہ کیا ہے دوسرے قصہ مین ایک ماں بچے کی تلاش مین جنگلون بیابانون اور پہاڑون مین آہ وزاری کرتی ہے قیمت چھ آنہ ۶ر

سنجوگ - یہ ایک ایسی مصیبت زدہ لڑکی کی داستان ہے جسکا نکاح والدین نے کچھ سوچکر نہین کیا اور فریقین کی طبیعتون کا اندازہ نہ لگایا - بلکہ روپیہ اور دولت پر پیاری بیٹی کو قربان کردیا - اس کتاب کا ہر فقرہ اور ہر شعر نشتر ہے - قیمت دس آنے ۱۰ر

جوہر قدامت - دو بہنون کی پر لطف کہانی دو لڑکیون کی مفصل زندگی دو عورتون کی جگر خراش داستان ہے جسمین سے ایک دور جدید کی شیدا اور دلدادہ اور دوسری دور قدیم کی درخشندہ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ عالم عنوان آج سے پچاس سال پہلے کیا جوہر رکھتا تھا اور مسلمان گھرون مین اُسوقت کیسے کیسے لعل گدڑیون مین چھپتے تھے اور مغربی سیلاب انکو کس سمت لے جارہی ہے قیمت ایکروپیہ آٹھ آنہ ۸ر

قربانگاہ حسن - قیمت چار آنے ۴ر

محبوبہ خداوند - قیمت ایکروپیہ چار آنے ۱۰۴ر

تائید غیبی - مسلمانون کو بتائے گا کہ سترین اندلس مین وہ کیا کرچکے ہین - قیمت آٹھ آنہ ۸ر

سوکن کا جلاپا - اشد الجزی کی تمام کتابون مین بہ لحاظ درد اثر کے ممتاز ہے - ایک لڑکی پر ساس نے سوکن لا بٹھلائی اور اس بیگناہ مصیبت زدہ لڑکی کو اسقدر تکلیفین اٹھانی پڑین کہ ان عنون سے گھل گھل کر جان دیدی قیمت صرف ۶ر

عروس کربلا - یہ وہ قابل قدر کتاب ہے جسمین بنی امیہ اور بنو فاطمہ کی تاریخ قصہ کے پیرایہ مین بہت دلچسپ ہے - بہادر لڑکی کی میدان جنگ مین اسلامی موت - ایک زبردست راز کا افشا - یزید کی خوابگاہ اور عروس کربلا کا داخلہ قابل دید ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ عہ

بنت الوقت - فیشن کی تقلید کے دردانگیز نتائج اور ایک فیشن کی دلدادہ لڑکی کا حسرت انگیز انجام نہایت خوبی سے لکھا گیا ہے - منگا کر ملاحظہ فرمائیے - قیمت صرف آٹھ آنے ۸ر

سراب مغرب - موجودہ زمانہ کی روش نے لڑکیون کی حالت پر کیا اثر کیا اور موجودہ تعلیم انکو کیا سکھلاتی ہے اور کس قسم کی تعلیم دیتی ہے قیمت صرف آٹھ آنہ ۸ر

پتہ - منیجر زمانہ بک ایجنسی نیا چوک، کان پور

زمانہ

جلد ۴۰ جنوری سنہ ۱۹۲۳ء

مقبرۂ شہنشاہ اکبر

نوشتۂ
حکیم سید شمس اللہ قادری
ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس

آگرہ کے پاس ایک قصبہ ہے۔ جسے سکندرہ کہتے ہین۔ اسکو سلطان سکندر لودھی نے آباد کیا تھا۔ شہنشاہ اکبر اپنی حکومت کے اخیر زمانہ مین جب آگرہ مین رہنے لگا۔ تو سکندرہ مین ایک باغ بنوایا۔ اور اسکا نام بہشت آباد رکھا۔ باغ مین اپنے دفن ہونے کیلیے ایک مقبرہ کی تعمیر شروع کی۔ مقبرہ ابھی ناتمام تھا کہ (۱۲ جمادی الثانی سنہ ۱۰۱۴ھ مطابق ۱۶۔ اکتوبر ۱۶۰۵ء) کو اکبر کا انتقال ہو گیا[۱]۔ اور لاش اسی مقبرہ مین دفن کی گئی۔ بقیہ عمارت کو شہنشاہ جہانگیر نے مکمل کرایا تعمیر کا کام سنہ ۱۰۱۲ھ مین اختتام کو پہونچ چکا۔ جہانگیر نے اپنی تزک مین جلوس سوم کے حالات لکھتے ہوئے اس مقبرہ کا حال اس طرح بیان کیا ہے۔ [۲]

روز دوشنبہ بہفت دہم ماہ رجب سنہ ۱۰۱۲ھ بقصد زیارت روضہ منورہ حضرت

---

[۱] دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۱۹ [۲] تزک جہانگیری صفحہ ۶۳ ترجمہ اردو صفحہ ۶۳

عرش آشیانی متوجہ شدم۔ اگر میسری بود این راہ بہ ترہ می پیمودم۔ حضرت والد بزرگوار م بجہت ولادت من از فتح پور بہ اجمیر کہ یکصد و بست کروہ است۔ پیادہ بزیارت حضرت خواجہ بزرگوار خواجہ معین الدین چشتی متوجہ گشتہ بودند۔ اگر من بسر و چشم این راہ بپیمایم ہنوز چہ کردہ باشم۔ چون بسعادت زیارت مشرف شدم و عمارتی کہ ہر روضۂ منورہ شدہ بود۔ دیدم نبوی کہ خاطر خواہ من بود۔ بنظر در نیاید۔ چرا کہ منظور آن بود۔ کہ روندہائے عالم مثل این عمارت در معمورۂ دنیا نشان ندہند چون در اثنائے عمارت مذکور از خسرو بے طالع این نوع امری بظہور آمدہ بالضرورت روانہ لاہور گشتم۔ معماران بسلیقہ خود یک طوری ساختہ بودند۔ آخر الامر بعضے تصرفات نمودہ شد۔ بآنکہ مبلغ کلی صرف نمودہ۔ سہ چہار سال کار کردہ بودند۔ فرمودم کہ دیگر بارہ معماران ماہر باتفاق مردم صاحب وقوف بعضے جاہا را بنوعی کہ قرار باید بیندازند۔ رفتہ رفتہ عمارت عالی سامان پذیر گردد۔ و باغی در غایت صفا بر دور عمارات مقبرۂ منورہ ترتیب یافت۔ و دروازہ در نہایت رفعت و عظمت مشتمل بر مینارہا از سنگ سفید ساختہ پرداختہ شد۔ مجملاً پانزدہ لک روپیہ کہ مواذی پنجاہ ہزار تومان رائج ایران و چہل و پنج لک خانی مطابق زر تومان بودہ باشد۔ خرج این عمارت عالی ہمن شنوانیدند۔

باغ (۱۵۰) ایکر زمین پر واقع ہے۔ اسکے اطراف کنگرہ دار دیوار بنی ہوئی ہے۔ اسمین چارون طرف چار دروازے (۷۰) فیٹ اونچے بنے ہوئے ہین۔ انمین تین دروازے مسدود اور محض برائے نمود ہین۔ جنوبی دروازہ مفتوح ہے۔ اسی سے آمد و رفت رہتی ہے۔ دروازے کے بالائی حصہ مین نقارخانہ بنا ہوا ہے۔ اور اسکے چارون جانب چار مینار ہین جنکے بالائی حصہ کو بھرت پور کے جاٹون نے توڑ ڈالا ہے۔ باغ کے وسط مین مقبرہ ہے۔ اسکی عمارت سنگ سرخ سنگ مرمر۔ سنگ موسی۔ سے تیار ہوئی ہے۔ اور تعمیر مین ہندو مسلمان دونون کے طرز تعمیر کا پیوند لگایا گیا ہے۔ مقبرہ کی عمارت دو منزلہ ہے۔ اسکی بنیاد (۳۲۰) فیٹ مربع زمین پر رکھی گئی ہے۔ اصل قبر عمارت کے نیچے تہ خانہ مین ہے۔ تعویز اوپر ہے جسپر کوئی گنبد یا سقف نہین ہے

بلکہ آسمان کے نیچے کھلا ہوا ہے۔ اکبر کی قبر کے اطراف متعدد جالیان بنی ہوئی ہین۔ مشرقی جالی مین آرام بانو بیگم اور مغربی جالی مین مکرالنسا بیگم کی قبر ہے۔ اس کے پاس سلیمان شکوہ اور اسکی بیوی مدفون ہین۔ انکے علاوہ چند اور قبرین بھی ہین۔ مگر انپر کوئی کتبہ وغیرہ نہین ہے۔ ان قبرون کے پاس ایک اور مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اسمین رقیہ سلطان بیگم مدفون ہین[1] عام طور پر مشہور ہے۔ کہ یہ قبر اورنگ زیب (عالمگیر) کی بڑی لڑکی زیب النسا بیگم کی ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اسکا مقبرہ دہلی مین کابلی دروازہ کے باہر ہے جو ۱۱۴۵ھ مین تیار ہوا ہے۔ اور اسمین قبر کے سرہانے یہ کتبہ لگا ہوا ہے[2]

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ کل من علیہا فان۔ ہذا مرقد البنت الکبری للعبد المذنب العاصی وہی المخوفہ۔ برحمۃ الرحیم الکریم الحافظ۔ زیب النساء المرحوم من عباد اللہ الصالحین۔ یدعوا لہا بالغفران الرضوان۔ تاریخ فوتہا بقولہ سبحانہ ادخلی جنتی

مکرالنسا بیگم اور آرام بانو بیگم کے متعلق شہنشاہ جہانگیر نے اپنے تزک مین حسب ذیل حالات لکھے ہین[3]

بعد از تولد دانیال از بی بی دولت شاد دختری متولد گشت۔ شکرالنسا بیگم نام نہادند۔ چون در دامن تربیت والد بزرگوار م پرورش یافت۔ بسیار خوب بیادر آمد۔ نیک ذاتی و رحم بعموم خلایق فطری و جبلی اوست۔ از ایام خردی و طفلی سالی تا حال در محبت من بے اختیار است۔ این علاقہ میان کم خواہری و برادری خواہد بود۔ در طفلی اول مرتبہ چنانچہ عادت است۔ کہ سینہ اطفال می فشارد و قطرۂ شیری از ان ظاہری گردد۔ سینہ خواہر را فشردند۔ قطرۂ شیر برآمد۔ حضرت والد بزرگوارم بمن فرمودند کہ بابا این شیر را بخور و تا در حقیقت این خواہر تو بجاے مادر تو ہم باشد۔ عالم السرائر دانا ست کہ از ان روز باز کہ آن قطرۂ شیر را نوشیدہ ام با علاقہ خواہری و دختری مہری کہ فرزندان را با مادران می باشد۔ آن مہر را در خود ادراک می نمایم۔

---

[1] تاریخ آگرہ صہ ۱۲۸ [2] آثار صنادید صہ ۷۷ باب سوم [3] تزک جہانگیری صہ ۱۷

بعد از چند دختر دیگر ہم از بی بی دولت شاد مذکور بعالم وجود آمد و بآرام بانو بیگم مسمّی گردید۔ مزاجش فی الجملہ بگرمی و تندی مائل است پدرم او را بسیار دوست می داشتند۔ چنانچہ اکثر بے ادبیہا و رابخ ادب بر میداشتہ در نظر مبارک ایشان از غایت محبت بدنی بود۔ مکرر مرا سرافراز ساختہ می فرمودند کہ بابا بجہت خاطر من باین خواہر خود کہ بعرف ہندوان دلالہ من است یعنی عزیز پروردہ بعد از من می باید بروشی سلوک کنی۔ کہ من یاد می کنم۔ ناز او را برداشتہ بے ادبیہا و شوخیہا او بگذرانی۔

جہانگیر کے حکم سے مرزا محمد ہادی نے تزک کا جو تکملہ لکھا ہے اسمین تحریر ہے۔ کہ ہفتم ماہ سنہ ۱۳۳۳ فصلی کو عارضہ اسہال سے آرام بانو بیگم کا انتقال ہوا۔ اُسوقت اسکی عمر ۴۰ سال کی تھی[1]۔ بلاک مین نے لکھا ہے۔ شکر النسا بیگم کا نکاح سنہ ۱۰۰۰ھ مین مرزا شاہ رخ بن ابراہیم سے ہوا تھا[2]

مرزا سلیمان شکوہ۔ شاہ عالم بادشاہ کا لڑکا ہے۔ اور ۲۹۔ ذیقعدہ سنہ ۱۲۵۳ھ کو آگرہ مین اسنے وفات پائی ہے۔

رقیہ بیگم مرزا ہندال کی لڑکی اور شہنشاہ اکبر کی پہلی بیوی ہے۔ ۷۔ جمادی الاول سنہ ۱۰۳۰ھ م ۱۹ جنوری سنہ ۱۶۲۱ء کو آگرہ مین اسکا انتقال ہوا ہے۔ معتمد خان نے اقبال نامہ مین اسکے حسب ذیل حالات لکھے ہین۔

درین تاریخ (روز شنبہ ہفتم جمادی الاول سنہ ہزار و سی و پنج) خبر رسید کہ رقیہ سلطان بیگم صبیہ مرزا ہندال منکوحہ عرش آشیانی انار اللہ برہانہ در دار الخلافت اکبر آباد بجوار مغفرت ایزدی پیوستند۔ زن کلان الحضرت ایشان بودند۔ چون ایشان فرزند نداشتند۔ در زمانی کہ شاہ جہان از صبیہ موتہ راجہ بعالم وجود آمدند۔ حضرت عرش آشیانی آن یکتاے گوہر خلافت را بشکوے تربیت بیگم بردند۔ آن سرآمد اے خلوت سراے قدس متکفل تربیت شہزادہ والا گہر شدند۔ آن صاحبہ در ہشتاد و چہار سالگی بہ نہانخانہ عدم شتافتند[3]

بلاک مین نے آئینۂ اکبری کے ترجمہ مین اور مسٹر بیوریج نے ہمایون نامہ کے ضمیمہ مین رقیہ بیگم کے

[1] تزک جہانگیری صہ ۳۹۵ ترجمہ اردو صہ ۲۲۷ [2] بلاک مین۔ ج۔ ۱ صہ ۳۰۰ [3] اقبال نامہ جہانگیری صہ ۲۵۱

مفصل حالات لکھے ہین[1] - جہانگیر نے اپنی تزک مین لکھا ہے - کہ ۱۰۱۶ھ مین رقیہ بیگم نے اپنے والد ہندال مرزا کے مقبرے کو کابل مین تعمیر کروایا - جب مقبرہ تیار ہوگیا - تو اس کے پاس ایک مقبرہ خاص اپنے لیے بنوایا - اسکے دروازے پر جو کتبہ کندہ ہے - اُسے پروفیسر وارسٹیمر نے فرانس کے مشہور رسالہ ایشیا مین شائع کیا ہے[2] جس سے ثابت ہوتا ہے - کہ یہ عمارت ۱۰۲۰ھ مین بنی ہے - رقیہ بیگم کا جب انتقال ہوا تو اُسکی لاش سکندرہ مین سپرد خاک کی گئی - پھر ایک عرصہ کے بعد اُسے لے جاکر کابل مین خاص اُسکے بنائے ہوئے مقبرہ مین مدفون کیا -

دروازے کی پیشانی پر باہر کی جانب حسب ذیل ابیات بخط نستعلیق کندہ ہین -

طاقی کہ از رواق نہم چرخ بہتر است ✤ روشن زسایہ اش رخ تابندہ دختر است
این طاق زیب نہ فلک ہفت کشور است ✤ از روضۂ منورۂ شاہ اکبر است

ان ابیات کے ہر دو جانب بخط طغرا یہ عبارت لکھی ہوئی ہے -

شمال جانب

دوام و فلک قدیم و بقائے نیست کس را - خدا راست بقائے ملک قدیم و دوام این ریاض فیض بخش بہشت مثال و این روضۂ متبرکہ فردوس تمثال مرقد مطہر و مضجع منور شاہ عالیجاہ خلد آرام گاہیست - کہ قعر نعیش قدر پرواز اوج عرش لازم الاعزاز است و بہشت آباد خلدش و حریم کعبہ سعادت قبلۂ اقبال تاج بخش سلاطین کامگار تخت نشان خواقین عالی مقدار مجدد سعادت کمال مجدد جہان اقبال صاحبقران ہمایون فرماضی ماثر کسری او قیصر اعنی دارائے کسری حشمت آسمان جاہ ابوالغازی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کہ گوہر افسر تاجداران و افسر تارک جہانداران بود - و بعد از رحلت بخاد و دو سال قمری کہ بہمن مواہب ایزدی باسطوت و حشمت جمشیدی و شکوہ و شوکت سلیمانی بر فراز مسند سلطنت و کامرانی نشست

---

[1] بابر نامہ ص ۳۰۹ و ص ۳۱۰ و ص ۵۰۹ و ہمایون نامہ ص ۲۷ و ۲۸ رسالہ مذکور سلسلہ ہشتم جلد یازدہم بابتہ ۱۹۰۸ء ص ۲۹

و در تقدیم شرائط جہانبانی و مرحلہ پیمائے سنین عمر مبارکش از حد و دستین در مرحلہ شمسی گشت در چہارم ماہ آبان کہ صبح ولادت آن سپہر منزلت از افق تائید الٰہی طالع شدہ بود۔ موافق تاریخ دوازدہم شہر جمادی الآخر سنہ ہزار و چہاردہ ہجری بمقتضائے سنہ سنیہ سبحانی کہ در عرصہ گیتی دولت خانہ ہیچ شہریاری کامکاری نیست کہ خانہ تقدیر ازلی بر پیشانی طاق آن آیۃ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ نہ نوشتہ و قصر ہیچ جلال صاحب اقبالی نماندہ کہ رقم قصر بہ کتابہ آن نگشتہ۔

درین حدیقہ بہار و خزان ہم آغوش است زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

ازین عالم بیمار و خاکدان بے اعتبار کہ جلت گاہ بسہی و سلم و تورد و اصدار چندین فیصو فغفور است۔ روے توجہ و التفات گردانیدہ بمشاہدہ جمال اجلال حی لایموت پرداخت۔ و داعی داللہ یدعو الی دار السلام را بہ لبیک اجابت استقبال نمود ارْجِعِی إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ رخت اقامت ازین جہان بے استقامت بربست و از طریق مضیق کدورات جسمانی تخیر و جستہ قرین انصاف درجات علیہ درجوار سند ملک منانی عفو غفران نشست۔ ۱۰۲۲ فی

کتبہ عبد محق شیرازی

شاہ اکبر ز روے دانائے گو بظاہر نہ دہر فانی رفت
دولتش بے زوال بود از ان دل بہ دنیائے باز دل نہ بست
مرغ روحش چو بود طائر عرش رفت بر آشیان خویش نشست

جانب جنوب

بیامن توفیقات صانع جہان آفرینی کہ نہ بقیاس مہندس کامل خود ساخت بارگاہ کبریائی جلالش توان پیمود۔ و بدستیاری معمار خیال و وہم مدوج بر معارج قصر عزت بمثالش توان نمود۔ جل جلالہ من احاطہ ادراک بکنہ کمالہ این طاق رفیع و ایوان منیع کہ نقش کتابہ آن تعلیم رقم تزئین ابداع و تکوین یافتہ مناظر بدیعش در قصر این رواق بمثل طاق زرنگار دست رضوان بلاجورد بلاکتابہ آش دام ملک العز و البقا تحریر کردہ باصل این عمارت عالی بنیاد فیض نہاد کہ

رساندش فطرات ارجمند خاقان جہانگیر جہان ستان سلطان المعظم اعدل رفیع الشان
ممہد قوانین عظمت وکشور کشائی موسس قواعد حشمت وفرمانروائے فہرست مکارم
اخلاق قانون بخش ناظم آفاق شاہ یا دپیم وفروگاہ خسرو پدر زیدہ بادشاہ برآفاق
ظل ہمائے گسترہ درآن پناہ خلق خدائے آسودہ صدر آرائے بارگاہ جاہ وجلال
مسند نشین شرف واقبال دارا شکوہ سکندر ظفر نوشیروان عدالت سلیمان
حشمت قدر قدرت قضا اقتدار کیوان رفعت عالمدار صاحبقرانی کہ بافر ہمایونی لوائے
دولت جہانگیری زشرفات سماک گذارنیدہ وآوازہ عدالت گستری
بذروہ افلاک برسانیدہ برایوان قدرش چون فلک صد پردہ دار برسر بام جلالش
چون زحل صد پاسبان شہنشاہ مجاہ فلک بارگاہ السلطان بن السلطان بن الخاقان
بن الخاقان بن الخاقان ابو المظفر نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی بہ نسبت
نبوت وجانشینی فروغ بخش دودمان رفعت اقتران سلطان السلاطین
جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازیست واز حیثیت سروری وسرفرازی فقاہ خاندان
سعادت بنیان صاحبقرانی وچنگیز خانی درسنہ ہفت جلوس مبارک جہانگیری موافق
سنہ ۱۰۲۱ ہزار وبست ویک ہجری دربہفت سال صورت تمام اتمام وکتابہ اختتام
یافت ؛ ۱۰۲۲ھ

کتبہ عبد الحق بن قاسم الشیرازی

دروازہ کے اندر یہ ابیات بہ خط نستعلیق مرقوم ہین ۔

بفرمان شاہنشہ ذوالجلال — کہ باشد شہنشاہیش بیزوال
شد آراستہ آن چنان روزگار — کہ حیران شد اندیشۂ ہوشیار
بگیتی زفیض ازل بادشاہ — بود سایۂ نور ذات الٰہ
چو از دہر آن سایہ گردون نہان — فتد سایۂ دیگر اندر جہان
بدین سان بود تا سرانجام کار — بہ نوبہ خورد گردش روزگار
زمانہ دگرگون ہمہ نفس — نگیرد بیک گونہ ہا ہیچ کس

فلک مرتبہ اکبر عرش گاہ — کہ از ہیبتش کوہ گشتی چو گاہ
نشستی چو بر تخت شاہنشہی — گرفتی جہان فرسطل للہی
فروزندۂ افسر و تخت و بور — کریم و رحیم و جوان بخت پور
دل روشن و جان آگاہ داشت — جہان خود و داد و گرفت و گزاشت
بباغ جہان تخم نیکی بکشت — بر آن گرفت از ریاض بہشت
ز دانش چو انوار خورشید و ماہ — فروزندۂ یاد از نور نور الٰہ

ترجمہ پروردگار تعالیٰ کے نود و نو نام کندہ ہیں۔ جانب بالین اللہ و اکبر اور جانب پائین جل جلالہٗ لکھا ہوا ہے۔ اسکا نقشہ صفحہ آخر پر تحریر ہے۔ قبر کے اطراف احاطہ کی جو دیوار ہے۔ اُس پر چاروں طرف حسب ذیل ابیات مسطور ہیں۔

جانب مغرب

بنام شہنشاہ ملک قدم — کہ ذاتش مبرا بود از عدم
ہمہ بادشاہان روے زمین — ز صاحب تاج و تخت و نگین
کند از عدم آشکارا وجود — بود ذات او مظہر عدل و جود
ز لطفش کہ دمساز طلبگار کام — بود درگہش قبلہ خاص و عام
نگارندۂ جوہر آب و خاک — طرازندۂ گوہر جان پاک
دو عالم ز فیض ازل آفریدہ — یکے کردہ پنہان و دیگر پدید
بخشندہ انکہ سرائے سپنج — بشاہان ہا افسر و تاج و گنج
کہ از عدل ایشان شود روزگار — شگفتہ تر از باغ در نوبہار
آوری را جو گیرند پیش — شناسند بیگانہ را ہم چو خویش

جانب جنوب

شہے کو چنین زیست در روزگار — بود سایۂ ذات پروردگار
ز نہصد فزون بود شصت و دو سال — کہ شاہ اکبر آن سایۂ ذوالجلال
بہ بالائے زرینہ سندر نشست — کہ بر تخت او گشت افلاک پست

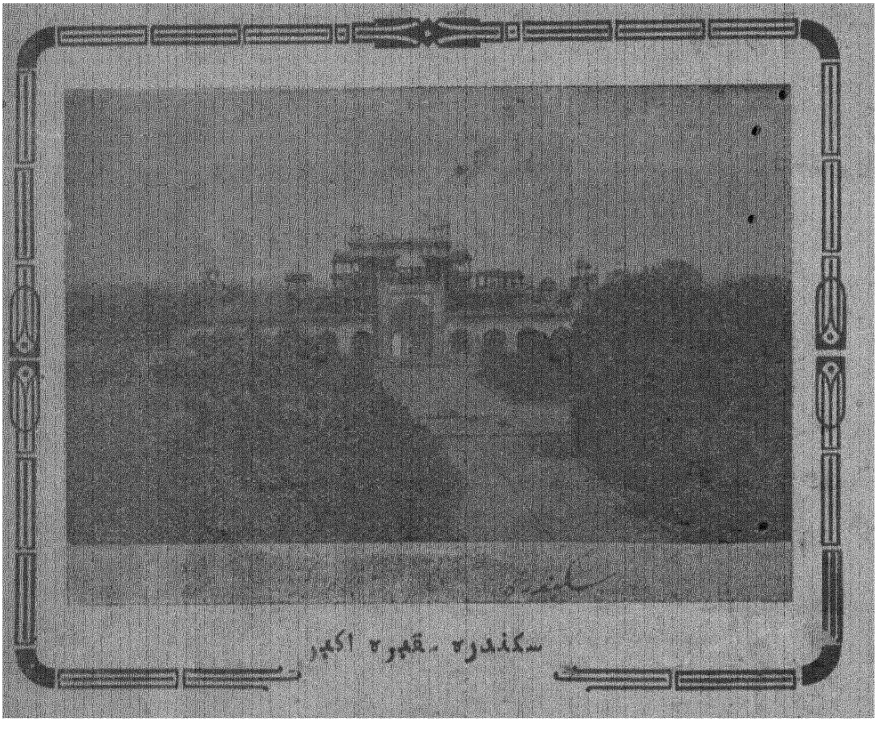

سکندرہ ۔ مقبرہ اکبر

جہان را بیارامت از عدل و داد — دل اہل عالم از و گشت شاد
بر پایہ تختش از بہر گودہ — شدہ جمع مردان صاحب شکوہ
بہر ار فگندی نظر سوے خاک — بگو ہر شدی بہتر از جان پاک
گرفتی بیک حملہ ملکی بہ رزم — بایماے ابرو بہ دادی بہ بزم
چو لطف خدا از عام بود — ہر کار چشمش بہ انجام بود
بدرگاہ او ہر کہ بودی پناہ — چو اندیشہ رفتے ز ماہی بماہ

جانب مشرق

چنان پر شد آوازہ اش در جہان — کہ در دل نگنجید راز نہان
بہ پرداخت آن گونہ روے زمین — کہ کرد آفرینش جہان آفرین
بہ گیتی دو افزون پنجاہ سال — چنین کرد شاہی زروے جلال
چو از عدل آباد کرد این جہان — سوے آن جہان رفت روشن روان
شہ ہفت کشور ازین پیش بود — کنون ہشت جنت مسخر نمود
بہ نزد خرد مند ہشیار دل — سرا ئیست این عالم آب و گل
مجو مہر از جو ہر نہ سپہر — کہ باکس بپایان نہ برداشت مہر
سپہر است پر کینہ مہر مدار — کہ با کینہ در مہر ناید بکار
جہان است مانند موج سراب — وز ان تشنہ دل کے شود کامیاب

جانب شمال

بہ بست است پیمان کس روزگار — کہ نشکست آن را بہ ہنگام کار
نماند بہ گیتی کسے جاودان — ز دست اجل کس نبرد ست جان
چہ خوش گفت آن کامل نکتہ سنج — کہ از گوہر دانش اندوخت گنج
جہان اے برادر نماند بہ کس — دل اندر جہان آفرین بند و بس
شد از عدل شاہ اکبر کامگار — بسان بہشت برین روزگار
جہان گشت خرم بدوران او — زمین و زمان شد بفرمان او

رفت دہر بے مہر پایان گسل بگین مہر او کرد بیرون زدل
زتاثیر بے مہری این جہان روان شد سوے عالم جاودان
روانش ہمیشہ زحق شاد شاد از و عالم قدس آباد باد

آرام بانو اور شکر النسا بیگم کی قبروں پر جانب بالین بخط خفی اللھم اغفرلی ذنوبی اور جانب پائین نام کندہ ہین۔

ہذا القبر آرام بانو ہذا القبر شکر النسا بیگم

سلیمان شکوہ کی قبر پر یہ کتبہ نصب ہے۔

اللہ محمد علی۔ فاطمہ حسنؑ و حسینؑ

چو فرمود رحلت سلیمان شکوہ زدار فنا سوے لک بقا
بسال دو و صد الف و پنجاہ و سہ بذیقعدہ بیست و نہم زین سرا
در آندم زہاتف صدا این رسید بگو کرد بر شاہ رحمت خدا

لوح منورہ مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بہادر این محمد شاہ عالم بادشاہ غازی۔

رقیہ بیگم کی تربت پر یہ عبارت کندہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ لا الہ الا اللہ الملک الحق المبین۔ لا الہ الا اللہ الخالق العلیم لا الہ الا اللہ رب الخلائق اجمعین۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ و اشہد ان محمدؐ عبدہٗ و رسولہٗ۔ اشہد ان وعدہٗ حق و الموت حق و البعث حق،، و النار حق و التوریۃ حق۔ و الانجیل حق۔ و الزبور حق۔ و الفرقان حق۔ و المیزان حق۔ و الصراط حق۔ و ان الساعۃ اتیۃ لا ریب فیہا و ان اللہ یبعث من فی القبور برحمتک یا ارحم الراحمین

بیبلیوگرافی۔ آثار الصنادید۔ ڈاکٹر سر سید احمد خان۔ طبع کانپور
آئین اکبری۔ ترجمہ انگریزی۔ بلاک مین۔ طبع کلکتہ۔ اقبال نامہ جہانگیری۔ محمد شریف مقدمان طبع کلکتہ۔ تاریخ آگرہ۔ محمد لطیف طبع کلکتہ۔

پابند اور بے حس ہوتا ہے اسی کو اپنی آزادی سمجھتا ہے۔ اسکو اپنے دل و دماغ کی بیحسی محسوس نہیں ہوتی اور خود کو صحیح الدماغ اور صائب الرائے جانتا ہے

جسطرح ایک دیوانہ اور مجنون خود کو صحیح الدماغ اور صحیح الخیال جانتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں زندگی کے صحیح مسلک سے بیگانہ اور دور افتادہ نہیں ہوں اور اپنے ہر فعل کی عمدگی اور صحت پر دلیل لانے کا مدعی ہوتا ہے اسی طرح وہ شخص بھی خیال کرتا ہے جسکا دماغ و دل احساس غلامی کا شکار ہوتا ہے۔

بظاہر دنیا کے اکثر حصوں سے جسمانی غلامی دور ہو چکی ہے اور لوگوں کی توجہ اس طرف سے ہٹ چکی ہے لیکن اگر مزید غور سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ابھی تک دنیا کے بعض حصوں میں دماغی غلامی پر زور دیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ قوموں یا افراد اقوام کے دماغ زنجیر غلامی میں جکڑے رہیں اور حیات دماغی میں فتور پڑا رہے۔ دماغی غلامی باعتبار اپنے حالات اور خیالات کے دو قسم کی ہے۔

(الف) لازمی۔

(ب) متعدی۔

جب انسان دوسروں کے مقابلہ میں اپنی خود غرضی کے تحت میں اپنے اغراض اور اپنے مقاصد کو جان بوجھکر حقوق عائدہ کے خلاف مقدم رکھتا اور انھیں خود غرضانہ طریقہ سے سلب کرنیکی کوشش میں رہتا ہے تو کہا جائیگا کہ وہ دماغی غلامی کی آفت اور مرض میں گرفتار ہے کیونکہ اس کا دماغ اس غلامی کی وجہ سے یہ تمیز نہیں رکھتا کہ حقوق عباد کا تحفظ اور تقدم کیسا ضروری اور لازمی ہے اسکی دماغی غلامی خودداری سے محروم ہے نہ صرف دوسروں کے مقابلہ میں بلکہ خود اپنے مقابلہ میں بھی یہ نقص ہوتا ہے اس غلامی کی وجہ سے انسان پایۂ اخلاق سے گر کر حیات اخوت اور اقتضائے انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ماؤف اور صدمہ رسیدہ دماغ میں آتا ہے وہی کر گزرتا ہے کچھ تمیز نہیں کر سکتا خود غرضی اور خود پرستی اسقدر غالب ہوتی ہے کہ نیک و بد میں تمیز کرنا گویا فطرتاً مشکل ہو جاتا ہے یہ دماغی غلامی کا اثر ہے کہ بعض وقت قومیں اجتماعی رنگ میں اور افراد اقوام انفرادی پہلو سے دوسروں کے حقوق کے سلب اور غصب میں

ذرا بھی تمیز نہین کرتے جسطرح ایک دیوانہ جوش دیوانگی مین اپنے اور پرائے مین تمیز کرنے سے عاری ہوتا ہے ویسے ہی یہ لوگ بھی ہوتے ہین ہر رنگ مین انکا مطمح نظر خود غرضی ہوتی ہے۔

متعدی صورت مین انسان کو شش کرتا ہے کہ دماغی غلامی کی وجہ اور تحریک سے دوسرون کے دماغ اور قلوب پر اثر ڈالے اور انھین اس راستے پر چلانے کی کوشش کرے جس سے قومین اور افراد اقوام دماغی غلامی مین مبتلا ہو کر رفتہ رفتہ اپنے ذاتی۔ قومی اور ملی حقوق سے بیگانہ اور ناآشنا ہوتے جائین ایسے لوگون کے دماغ اور قلوب نفسیات فطری اور حسیات طبعی سے اسقدر بیگانہ ہو جاتے ہین کہ بدین حالات انکے خیال مین یہی غلامانہ زندگی ہی ایک آزادانہ زندگی ہے غلامی مین ہو کر بھی وہ خود کو آزاد سمجھتے اور حریت کا وارث جانتے ہین گو کبھی کبھی انکے بوسیدہ دماغون اور ماؤف قلوب مین اپنی اس حالت کا احساس تو کسی قدر ضرور ہوتا ہے مگر انکی روش غلامانہ باوجود اسکے بھی انھین مطمئن کرتی رہتی ہے کہ چند روز زندگی بسر کرنی ہے جس طرح گذرے گذرے زیادہ جد وجہد کی ضرورت نہین اگر کبھی انھین اس نقص غلامی کا احساس بھی ہوتا ہے تو وہ صبر و قناعت کو مقدم رکھکر اسی حالت پر خوش رہنے کی کوشش کرتے ہین۔

دنیا کے تعلقات سے بیزار اور بیگانہ رہنا گویا انکے نزدیک ایک اخلاقی عظمت اور روحانی ضرورت ہوتی ہے انکی زندگی اور انکے خیالات مین ایک قسم کی سرد مہری اور جمود ساری ہو جاتا ہے اور خون مین غفلت سی پیدا ہو جاتی ہے یہ کیفیت قومون اور افراد اقوام مین مختلف طریقون سے پیدا ہوتی یا پیدا کی جاتی ہے۔

"سوشل رنگ مین
"مذہبی رنگ مین
"اخلاقی رنگ مین
"تعلیمی۔ تدریسی اور تادیبی رنگ مین
"سیاسی اور قانونی رنگ مین

پھر وہ صورتین ہین جو بہ مختلف حالات پیدا ہوکر قومون اور افراد اقوام پر محیط ہوتی ہین کبھی سوشل رنگ مین اثر پذیر ہوتی ہین اور کبھی برنگ دیگر مثلاً بعض اوقات مذہب مین اس قسم کے خیالات اور احکام مل جاتے ہین جو ہوتے مذہب سے الگ ہین مگر رفتہ رفتہ رسمی رنگ مین مذہبی رنگ اختیار کرلیتے ہین ۔

مذاہب کی تفریق اور فرقہ بندیان اسی قبیل سے نشو ونما پاتی ہین ایک فرقہ جب دوسرے فرقہ کے مقابلہ مین اجتہادی پہلو لیتا ہے تو اس حالت مین اجتہادی تغیرات مذہب مین حائل ہوجاتے ہین اور ایسا فرقہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اسکے مقابلہ مین دوسرا فرقہ شکستی وگردن زدنی ہے یہ وہ دماغی غلامی مذہبی رنگ مین ہے کہ جسکی وجہ سے مذہب پرست اقوام رفتہ رفتہ اپنی عظمت اور ہمت کھو بیٹھتی ہین اور دوسرے مذاہب اور دوسرے اقوام پر انکا پول کھل جاتا ہے چونکہ یہ دماغی غلامی اعصاب مین ساری ہوجاتی ہے ۔ اسواسطے باوجود لگاتار تنزل اور بے حسی کے بھی اسکا احساس نہین ہوتا ۔ اور اور ایسے لوگ خود کو مذہب کا پرستار کہکر خوش ہوتے ہین ۔

نصاب تعلیم جب کبھی اس قسم کے خیالات رفتہ رفتہ نشو ونما پاتے رہتے ہین تو نصاب تعلیم وتدریس بھی اس قسم کا منتخب ہوجاتا ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ قومون اور افراد اقوام کے دماغ اور ضمیر مین اس قسم کے بودے اور سطحی خیال بھر دیے جاتے ہین کہ قومی اور ملکی ضروریات کے مقابلہ مین تنازع للبقا کے رنگ مین بجاے افادت کے مضرت رسان ہوتے ہین طالبعلم برسون اور مدتون کی دماغ ریزی اور محنت کے سلسلہ مین جب اسکولون اور کالجون سے اٹھتے ہین تو انکے پلے مین سوائے چند رٹے ہوئے الفاظ کے اور کچھ بھی نہین ہوتا ۔ خودداری معدوم ہوجاتی ہے اور ایثار برائے نام بھی نہین ہوتا عصبیت رخصت ہوچکی ہوتی ہے ۔ لوگ ڈگریان لے کر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہین کتابی اجرام کے ہجوم سے دماغی حسیات بوسیدہ ہوجاتی ہین اور جو بات ہر قومی اور ملی پہلو سے ملک و قوم کے نوجوانون اور طالبعلمون کے دماغون اور قلوب مین متموج ہونی چاہیے محض نمائش ہوتی ہے ترقی یافتہ ملک کے نوجوانون اور طالبعلمون کی امنگ بیداری ہمت بہ مقابلہ

تنزل یافتہ اور کشتگان دماغی غلامی کے کسی اور ہی رنگ مین متموج اور نمایان ہوتی ہے انگلستان فرانس اور جرمن مین جاکر دیکھ لو کہ ان قومون اور ان ممالک کے لوگونمین کس قسم کی ہمت خودداری اور اُمنگ ہے اور انکے مقابلہ مین ہماری حالت کیا اور کیسی ہے اسکی بڑی بھاری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان ممالک اور ان اقوام کی تعلیم و تدریس اصولاً قومی اور ملی رنگ مین ہوتی ہے اور ہمارے ملک کی تعلیم اور نصاب تعلیم محض تعلیمی رنگ رکھتا ہے ایک طالبعلم تعلیمی مدارج قومی پہلو سے طے کرتا ہے اور دوسرا محض تعلیم یا امتیازات تعلیم کی خاطر ان دونون مین بڑا بھاری فرق ہے ایک شخص کوئی کام محض تفریح کی خاطر کرتا ہے اور دوسرا شخص علم اور معلومات کی خاطر۔ دونون مین فرق ہے۔

قوانین اور سیاسیات

سیاست اور قوانین سیاست ہر ملک اور ہر قوم کے واسطے لازمی اور ضروری ہین بغیر انکے گزارہ اور ضبط ضروری ممکن نہین لیکن اگر قوانین کا ضبط و ربط کی خاطر ملک و اقوام پر اچھا اثر پڑتا ہے تو بُرا اثر بھی پڑتا ہے جب کوئی ضابطہ اور قانون سیاسی اور سوشل رنگ مین جاری ہوجاتا ہے تو محکوم افراد پر اسکا دو ہی طریق سے اثر ہوتا ہے۔

منصفانہ رنگ مین۔

غیر منصفانہ رنگ مین

پہلی صورت مین قانون پرست اپنی حدود ہی مین رہتے اور کاربند ہوتے ہین اور قانون قانون کی حدود مین ہی عمل پذیر ہوتا ہے دوسری صورت مین بعض اوقات قانون پرست اپنی حدود سے نکل جاتے ہین اور بعض اوقات قانون بھی اپنی حدود سے نکل کر دماغی غلامی کی زنجیر مین پھنسا رہتا ہے اور اس داروگیر اور گرفت سے لوگون کے دماغ اور دل مین ایک قسم کا مواد غلامی بھر جاتا ہے اور رفتہ رفتہ قانون پرست لوگ دماغی غلامی کے بندھنون مین جکڑے جاکر اپنی حریت اور خودداری کھو بیٹھتے ہین جو حقوق اور جو دعاوی واجب بھی ہوتے ہین اُنکے طلب کرنے پر بھی جھجکتے ہین اور دوسری طرف سے بھی غلامانہ تقیدات کی وجہ سے ایفائے حقوق پر زور نہین دیا جاتا ایک شخص دیکھتا ہے کہ قانون سے انحراف

ہو رہا ہے لیکن دماغی غلامی کی وجہ سے کوئی چارہ جوئی نہین کر سکتا۔ انصاف کی عدالتون مین بھی جاکر منھ نہین کھول سکتا اور اگر کوئی چارہ جوئی کرتا بھی ہے تو اس رنگ مین کہ جسمین دماغی غلامی کے اثرات زیادہ تر ہوتے ہین اور ایسے جرائم خودداری کو کھا جاتے ہین

قانون کبھی تو خودداری پیدا کرتا ہے اور کبھی خودداری کے منافی بھی ثابت ہوتا ہے اور بعض حالات مین قانون کا یون منافی ہونا قومون اور افراد اقوام کے واسطے ایک سخت صدمہ ہوتا ہے رفتہ رفتہ جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ قومون اور افراد اقوام کی دماغی اور فطری حس ہی ماری جاتی ہے نہ صرف اسکا موجب قانون اور قانون کی گرفت ہی ہوتی ہے بلکہ اسمین قانون پرستی کی عادت بھی بہت کچھ دخیل ہوتی ہے۔

قانون کا انحراف بہت برا ہے لیکن اسکے مقابلہ مین قانون کی طول طویل و دور دراز قیاس تعبیرات اور عملیات اس سے بھی زیادہ ترصدمہ رسان ہین ہر وقت انسان اس خبط اور وحشت مین رہتا ہے کہ یہ بات قانون کے خلاف نہو کبھی کسی ملک اور کسی صوبہ کے باشندے رشوت دینے کے زیادہ تر عادی ہو جاتے ہین تو اسکی محرک بھی یہی خبط اور دماغی غلامی ہوتی ہے۔

رشوت اور دماغی غلامی ایک طرف راشی اور مرتشی دونون جانتے ہین کہ رشوت دینا اور لینا انصاف اور قانون کے خلاف ہے لیکن دوسری طرف یہ سلسلہ باوجود چند و چند بندشون کے بھی بند نہین ہوتا اسکی وجہ یہ ہے کہ دماغی غلامی کے عارضہ سے اہل مقدمات کا یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ عدالتون مین ہمارے خاطر خواہ انصاف نہین ہو سکتا اگر یہی دماغی غلامی نہو تو کوئی بھی نہ رشوت دے اور نہ رشوت لے جب تک یہ دماغی غلامی دور نہو گی اسوقت تک یہ سلسلہ بھی دور نہین ہو سکتا۔

بعض اوقات لوگ کہتے ہین کہ مقدمات کی دن بدن کثرت ہو رہی ہے اسکے بہت سے وجوہ ہو سکتے ہین لیکن ایک بڑی وجہ دماغی غلامی بھی ہو سکتی ہے جو قانون اور قانون پرستی کے محرکات سے پیدا ہوتی رہتی ہے، قومون کے دماغ مین یہ بات عموماً بیٹھ جاتی ہے کہ سوائے عدالتون کے ہماری دادرسی ہو ہی نہین سکتی۔ یہ کسی حد تک تو درست ہے لیکن عموماً ایسا

خیال کرنا ایک غلط ہے عدالتون مین جاکر قانونی پیچیدگیون کے نرغہ مین آکر بسا اوقات انصاف کی صورت ہی بدل جاتی ہے۔ قانون اپنے اغراض کے تحت مین جو ضروریات چاہتا ہے اُنکے مہیا کرنے پر بہت دفعہ فریقین اور مقدمہ لڑانے والون کو خود ہی قانونی حدود سے باہر نکلنا پڑتا ہے اور دماغی غلامی اُن اسباب کے تہیہ پر زور دیتی ہے جو دائر صداقت سے بہت دور ہوتے ہین۔

یہ نقص صرف اسواسطے پیدا ہو جاتے ہین کہ غیر منصفانہ قانون اور قانون پرستی ہی قانون پرستون کو ان مراحل سے گزرنے کی محرک ہوتی ہے۔ جب تک قانون آزادانہ پہلو نہ بدلتا ہو اور جب تک قانون پرستی محض قانونی رنگ مین نہ ہو تب تک یہ نقص باقی رہیگا قانون قانون کے اعتبار سے واجب التعظیم ہے لیکن قانون جب اس رنگ مین مانا جائے قانون بنانے والے ہر صورت مین اسکا اقتدار کرانا چاہتے ہین اور لوگ قانون کے مقابلہ مین واجبی تغیرات کی اجازت نہین پاتے تو وہ اُس رہنما کی طرح ہی جو شاہراہ صداقت سے الگ لے چلتا ہو۔ قانون جبتک اپنا حقیقی فرض ادا کرتا ہے اُسوقت تک وہ تمدن احامی اور آزادی کا محافظ ہوتا ہے لیکن جب وہ خارجی اور خود غرضانہ قیود سے گھر جاتا ہے تو اسکی یہ تعریف باقی نہین رہتی اور وہ لوگون کے قلب و دماغ کو غلامی کی مصیبت بن مبتلا کر دیتا ہے۔

دماغی غلامی بھی ایک عارضہ ہے جو باوجود ایک عارضہ ہونے کے بھی بعض وقت حسیات کے کم ہونے کی وجہ سے کم محسوس ہوتا ہے، فتدبر

سلطان احمد

---

(۱) ہستی کے ہنگامہ اور زندگی کے طوفان مین۔ اے حسن۔ پتھرون پہ کندہ کیے ہوئے حسن تو ساکت غیر متحرک۔ تنہا اور علیحدہ قائم ہے۔

وقت اپنے تزک و احتشام کے ساتھ تیرے قدمون سے لگا ہوا ہے اور آہستہ آہستہ کہہ رہا ہے "اے میری عروس مجھسے مخاطب ہو" اے غیر متحرک حسن تیری گویائی سنگ مین منجمد ہو گئی ہے۔

نلور

مترجمہ حضرت مجنوں

ہندوستان مین پریس کی حالت

موجودہ زمانے مین کسی ملک کی ترقی کا معیار اس ملک کے اخبارات ہین۔ اخبارات اور رسالون کی تعداد اور ہر ایک اخبار کی اشاعت کتنی ہے اور کس قسم کی تعلیم یہ اخبارات اپنے ناظرین کو دیتے ہین کس قسم کے مضامین اُنمین شایع ہوتے ہین! یہ چند ایسے سوال ہین جنکے جواب سے اس ملک کی ترقی کا اندازہ ٹھیک ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ جو ممالک اس وقت ترقی کی اونچی چوٹی پر پہونچ چکے ہین وہ اخبارات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہین۔ وہان اخبار بینی ضروریات زندگی مین شامل ہے۔ لندن مین ایک تانگے والا بغیر اخبار کے دکھائی نہین دے گا۔ امریکہ کا نانبائی یا بوٹ پر پالش کرنیوالا بغیر اخبار کے گزر نہین کرسکتا۔ جاپان کی وہ لونڈی جو ایک امیر گھرانے مین برتن صاف کرنے کا کام کرتی ہے۔ یہ گوارا نہین کرسکتی کہ اسکا ذاتی اخبار کوئی نہ پڑھے وہان پر اخبار نہ صرف روزانہ شایع ہوتے ہین۔ بلکہ بہت سے اخبارون مین دو یا تین مرتبہ نکلتے ہین۔

اب ذرا ہندوستان کے اخبارون کا مقابلہ کسی اور تہذیب یافتہ ملک کے اخبارات سے کیجیے۔ سنہ ۱۹۱۰ء مین ہندوستان کے روزانہ ہفتہ وار ہفتہ مین دو دفعہ نکلنے والے اخبارون اور ماہواری رسالون کی تعداد ۱۶۳۳ تھی امریکہ مین صرف روزانہ اخبارون کی تعداد ۲۶۴۷ ہے وہان ۱۵۷۸۳ ہفتہ وار اور ۵۵۴ ہفتہ مین دو دفع نکلنے والے اور ۲۲۷۳۰ ماہواری رسالے نکلتے ہین۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ۱۶۳۳ اور ۴۱۶۱۶ مین کیا نسبت ہے۔ اگر امریکہ اور ہندوستان کی آبادی کا مقابلہ کیا جائے تو ہند مین ڈیڑھ ہزار کے بجاے ڈیڑھ لاکھ اخبارات کی ضرورت ثابت ہوگی۔

قدرتی طور پر یہ دو سوال پیدا ہوتے ہین کہ ہندوستان مین پریس کی ایسی افسوسناک حالت

کیون ہے اور کون سے ایسے ذرائع ہین جن سے پریس کو تقویت دی جا سکتی ہے۔ پہلے سوال کے جواب مین ہندوستان کی مالی حالت۔ لوگون مین تعلیم کی کمی اور پریس ایکٹ پیش کیے جا سکتے ہین۔ دوسرا سوال زیادہ دقیق اور مشکل ہے۔ مین صرف پہلے سوال پر اس مضمون مین بحث کرونگا اور دوسرے سوال کو کسی زیادہ لائق آدمی کے سپرد کرتا ہون۔

اپنے مضمون پر تحویلاً بحث کرنے سے پہلے پریس کی افسوسناک حالت کو واضح طور پر اپنے ناظرین کو ذہن نشین کرانے کے مقصد سے ۱۹۰۴ء کے رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ سے مسٹر مالاباری کے قلم سے نکلے ہوئے ایک مضمون کا اقتباس ذیل مین درج کرتا ہون وہ اپنے ہفتہ وار انگریزی اخبار انڈین سپکٹیٹر (Indian Spectator) کی خراب حالت کی نسبت خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھتے ہین۔

"سوائے اس مختصر زمانے کے جبکہ یہ اخبار میرے دوست مسٹر این۔ ایم۔ دوبید جی کے زیر انتظام تھا ہمیشہ اسمین مجھے خسارہ ہی رہا ہے۔ تضیع اوقات اور نقصان محنت کے علاوہ اس معاملے مین جسقدر مالی گھاٹا مجھے اٹھانا پڑا ہے۔ اسکی یاد جب کبھی دل مین تازہ ہوتی ہے تو میری پریشانی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اخبار اسپکٹیٹر کی حالت اس بچے کی سی تھی جو ہمیشہ بیمار اور کمزور رہتا ہے اور اسی وجہ سے والدین اسکے ساتھ زیادہ پیار اور محبت کرنے لگتے ہین اس بچے کے والدین ہر چند کہ مالی لحاظ سے زیادہ خوشحال نہ تھے۔ مگر پھر بھی وہ جو شے مانگتا تھا اُسے مہیا کی جاتی تھی۔ اسکے بہت سے اجرتی اور آنریری مضمون نگار اور ریویو لکھنے والے تھے جنمین انگریزی اور ہندوستانی دونون قومون کے لوگ شریک تھے۔ ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر الگ الگ تھے۔ عام طور پر ہم اپنے مضمون نگارون کو تین روپیہ فی کالم کے حساب سے اجرت دیا کرتے تھے۔ لیکن بعض اوقات پانچ سے دس روپیہ فی کالم تک بھی دیتے تھے۔ بعض موقعون پر مجھے یاد ہے کہ مین نے ایک ایک آرٹیکل کے لیے ساٹھ سے سو روپیہ تک اجرت دی ہے میرے خیال مین ہندوستانی اخبار نویسی مین یہ اجرت زیادہ سے زیادہ ہے۔ جو کسی مضمون نگار کو دی گئی ہو۔ برعکس اسکے ہمارے کئی انگریز نامہ نگار تھے جنھین صرف ۸ر فی کالم کے حساب اجرت دی جاتی تھی۔ ان مضامین کو ہم اصلی مضامین کی کمی پورا کرنیکے کام مین لاتے تھے

یاد ہے غریب کرنیل ..... نے فوجی اصلاح کے مضمون پر ہمین متعدد بار آرٹیکل روانہ کیے تھے۔ جب منیجر نے اسے قریباً ۱۲ کالم مضمون کے لیے چھ روپیہ بطور نذرانہ بھیجے تو مین نے اُسے ایک خط مین لکھا۔ کہ اسسے آپ کا سگریٹون کا ڈبہ خریدنے کا خرچ چل جائیگا۔ اسکا جواب جو مجھے ملا اُسسے میری آنکھین کھول دین۔ خط مین لکھا تھا "ان اُسسے میری بچسالہ بے مان کے بچے کا چند روز کے لیے دودھ روٹی کا خرچ چل جائیگا"۔ اس سے میرے دل کو اسقدر صدمہ پہونچا کہ مین نے فوراً اپنی دو چاندی کی گھڑیان جو شادی سے پہلے کی میرے پاس موجود تھین بیچ کر انکا روپیہ اپنے غریب پرانے مضمون نگار کو بھیجدیا۔ مین نے پرائیویٹ طور پر ایک خط سر ڈونالڈ اسٹوارٹ صاحب کمانڈر انچیف کو لکھا۔ کہ وہ کرنیل موصوف کی کچھ مالی امداد کا بندوبست کرین۔ میری اس درخواست کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کرنیل کی لڑکی تعلیم کے لیے آبولانس اسکول بھیجدی گئی"۔

جو حالت مسٹر مالاباری نے انڈین اسپکٹیٹر (Indian Spectator) کی بیان کی ہے۔ بعینہ وہی حالت ہندوستان کے دوسرے بہت سے انگریزی اور ورنیکلر اخبارات کی ہے۔ جو اخبار اسپکٹیٹر کی طرح مالاباری جیسے ہمدرد ہاتھون مین ہوتے ہین وہ کچھ نہ کچھ ضرور پبلک کی خدمت انجام دیتے ہین۔ لاہور کے ورنیکلر اخبارون کے سردار روزانہ اخبار "بندے ماترم" کو اتنک خسارہ رہا لیکن چونکہ اسکی بنیاد مضبوط تھی اسلیے اسکو مالی خسارہ کی آندھی زمین کے ساتھ نہ ملا سکی۔ لیکن جو اخبار ایسی مضبوط بنیاد پر قائم نہین ہین جنکی پیدائش کی ذمہ داری ایک ہی شخص کے سر پر ہے۔ جنکا ایڈیٹر۔ پرنٹر۔ پبلشر اور پروپرائٹر ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ ایسے اخبار یا رسالے تھوڑے دنون کے بعد پبلک کے نام امدادی اپیل شایع کرنے لگتے ہین۔ ہندوستان کی نیم تعلیم یافتہ پبلک پہلے ہی سے اخبار نویسی کی طرف کم متوجہ ہے اسلیے اگر کوئی اخبار بند ہو جاتا ہے۔ تو اسکا افسوس ہوتے اُسکے پروپرائٹر کے اور کسی کو نہین ہوتا۔ ایسے اخبار ملک کے ہر حصے سے حشرات الارض کی طرح نکلتے اور برساتی مچھرون کی طرح غائب ہوتے رہتے ہین۔ غرض ورنیکلر پریس کی حالت قابل رحم ہے۔

جب خود اخبارات کی زندگی اتنی ناپائدار ہے تو آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایسے

رسالون یا اخبارون کو مضمون نگار کس پایہ کے مل سکتے ہین - بہت سے ویکلی ماہواری رسالے تو بطور جنتری یا (CATALOGUES) فہرست کتب شائع ہوتے ہین - فرق صرف اتنا ہے کہ کارخانون کی فہرست اشیا عام طور پر سالانہ شایع ہوتی ہین اور انکا سارا خرچ کارخانے والون کے ذمہ ہوتا ہے - اور یہ رسالے بجاے سالانہ کے ماہواری نکلتے ہین اور انکے خرچ کا کچھ حصہ اُن عقل کے اندھے گاہکون کی جیبون سے نکلتا ہے جو انکے خریدار ہوتے ہین اس قسم کے رسالے خسارہ برداشت کرکے بھی نکلتے رہتے ہین - بعض رسالون مین ایسے مضامین درج ہوتے ہین جنکے مطالعے سے مضمون نگار کی علمیت غیر معمولی طور پر ٹپکتی ہے - میرا ارادہ تھا کہ بعض بعض رسالون مین سے کچھ مضمون قطع برید کرکے ناظرین کی خدمت مین پیش کرون لیکن مضمون کی بیجا طوالت کے ڈر سے درگزر کرتا ہون اور اسکا فیصلہ ناظرین کے تجربے پر چھوڑتا ہون ایسے مضامین یا تو بڑی لفاظی اور مخرب اخلاق جذبات کے اظہار پر مبنی ہوتے ہین یا انمین اس قسم کی تنقیدین اور موازنے درج ہوتے ہین جنکا ہر لفظ ذاتی رنجش اور دلی عناد کا نتیجہ ہوتا ہے جنمین واقفیت اور نیک نیتی کو ذرا بھی دخل نہین ہوتا جنمین بجاے دو بالمقابل چیزون کے عیب و صواب بالاکم و کاست دکھائے جانیکے - اُن رسالے کے مصنفین کی قابلیت پر ایک طول و طویل بحث ہوتی ہے یا جو شروع سے لیکر اخیر تک بیجا اعتراضون اور مذہبی تعصبون کا آئینہ ہوتے ہین - ایسے مضامین ناظرین کو فائدہ پہونچانیکے بجاے انکو غلط واقفیت بہم پہونچاتے ہین اور بجاے اُنکے دائرۂ علمیت کو وسیع کرنیکے انکو اور بھی زیادہ تنگ بناتے ہین - یہی رسالے ہین جنکی وجہ سے ویکلی پریس اتنا بدنام ہے اور تعلیم یافتہ پارٹی ویکلی پریس سے متنفر ہے -

اگر ایڈیٹر کی کوشش و قابلیت سے لائق نامہ نگار مل بھی جائین - تو وہ کب تک اپنی ضروریات کو نظر انداز کرکے محض ہمدردی کی خاطر اخبارون یا رسالون کی امداد کرسکتے ہین بہت سے ایڈیٹر اس بات کے خواہشمند ہوتے ہین - کہ مضمون نگار عمر بھر خون جگر پی کر اسکے رسالے کے لیے مضمون لکھتا رہے اور اس سے ایک کوڑی بھی اُجرت نہ مانگے - بیچارہ ایڈیٹر بھی کیا کرے جبتک اچھی خاصی اشاعت اسکے رسالے یا اخبار کی نہو اُسوقت تک تو اسکی لکھائی چھپائی اور کاغذ کا خرچ بھی نہین نکلتا - یہان تو ہر اچھے اخبار کی حالت انڈین اسکنڈلر جیسی ہے اور ہر ایک ایڈیٹر

کا یہ مقدور نہین کہ مسٹر مالاباری کی طرح اپنی دو گھڑیان بیچ کر اپنے مضمون نگار کی تسکین پوری کر سکے۔

اخبارات اور رسالون کی کم اشاعتی کا سب سے بڑا سبب لوگون کا ناخواندہ ہونا ہی پرائمری اور ورنیکلر مڈل پاس شدہ لڑکون کو اخباری دنیا مین ناخواندہ ہی تصور کرنا چاہیے انکی تعلیم نہ تو انکو اخبارات کے سمجھنے کے قابل بناتی ہے اور نہ اخبار بینی کا شوق دلاتی ہے جو محض ہائی سکولون تک پڑھکر دفترون مین کلرک اور ریلوے مین ملازم ہو گئے ہین۔ انکی تنخواہین اتنی قلیل ہین۔ کہ وہ بمشکل اپنا اور اپنے بچون کی پرورش کا گزارہ کر سکتے ہین اگر یہ اخبار سمجھ بھی نہ سکین تو انکو اتنا شوق نہین ہوتا کہ اپنا پیٹ کاٹکر اخبار پر خرچ کرنا اپنا فرض سمجھین انکا خیال ہے کہ اخبار بینی انسان کے لیے غیر ضروری LUXURY ہے۔

اب رہے کالج کے گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ۔ ہندوستان کی ساڑھے اکتیس کرور آبادی کے لیے صرف ۱۳۶۔ لڑکون کے کالج ہین۔ جبکہ امریکہ مین جہان کی آبادی صرف ساڑھے آٹھ کرور کے قریب ہے ۴۹۳۔ کالج ہین۔ ۱۹۱۵ء مین لڑکیون کے لیے سارے ہندوستان مین صرف ۱۱۔ کالج تھے لیکن امریکہ مین ۱۱۳ تھے ہندوستان مین ۴۰۶۔ عورتین کالج مین پڑھتی ہین جبکہ امریکہ مین ۱۶۶۷۔ عورتین کالجون مین تعلیم حاصل کرتی ہین۔ امریکہ مین ۴۳۴۴۸۰۔ عورتین سکولون مین پڑھانے کا کام کرتی ہین جبکہ ہندوستان مین ۹۹۶۳۴۱۔ عورتین لکھ پڑھ سکتی ہین انمین وہ بھی شامل ہین جو محض اپنے دستخط کرنا جانتی ہین۔ ایک دفعہ پنڈت مدنموہن مالویہ نے اپنے ایک لکچر مین کہا تھا کہ "ہند مین پانچ وشو ویدیالاؤن مین ۲۸۰۰۰۔ لڑکے ہین۔ اور امریکہ مین ۲۴۰۰۰۔ پروفیسر ہین۔

اگر سکولون کے طلباء کو بھی خواندہ کی فہرست مین شامل کیا جاے تو بھی سوائے مایوسی کے اور کچھ ہاتھ نہین آئیگا۔ ۱۹۱۴-۱۵ء مین ہندوستان مین ۲۳٫۹ فیصدی لڑکے سکولون مین پڑھتے تھے اور صرف ۲٫۶ فیصدی لڑکیان۔ امریکہ مین سٹیٹ کی طرف سے نہ صرف سکولون بلکہ کالجون مین تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ جاپان اور انگلینڈ مین بھی اسی طرح تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ لیکن ہندوستان مین گو کھلے کا پرائمری ایجوکیشنل بل خرچ کی کمی کی وجہ سے پاس نہ کیا گیا۔ جب تک تعلیم کی یہ حالت ہے اسوقت تک ہندوستان مین پریس زیادہ

ترقی نہین پکڑ سکتا۔

پریس ایکٹ نے بھی بعض بعض اچھے اخبارات اور رسالون کا گلا گھونٹ دیا تھا یہ زیادہ تشریح کا محتاج نہین۔ اب دیکھئے کہ پریس ایکٹ کے منسوخ ہونے کا اثر انڈین پریس پر کیسا پڑتا ہے۔

کنوریسین سی ای

جذبات اثر

حشر اور اُسکے بعد کا سامان کیے ہوئے
بیٹھا ہون دل کے داغ فروزان کیے ہوئے

نظارہ ہے اُمید تبسم مین گل بکف
دل کو فدائے جنبش مژگان کیے ہوئے

ناخن بدل فراق مین رہتا ہون روز و شب
سینے کو چاک مثل گریبان کیے ہوئے

پھر زخم تیغ کھانے پہ بیتاب عشق ہے
ہر لخت دل کو غرق نمکدان کیے ہوئے

خلوت مین دل کی آیا بصد غمزہ و ادا
اک مست ناز پردۂ داماں کیے ہوئے

صحرا نہین ہے کوئی ہمارے مذاق کا
بیٹھے ہین اپنے گھر کو بیابان کیے ہوئے

جاتا ہون نذر دینے اُسے دل کی آئینہ
آنکھون کا نور زینت عنوان کیے ہوئے

گرداب ہین بلاؤن کے یا چشم خونچکان
پنہان ہر ایک قطرے مین طوفان کیے ہوئے

کہتا ہے کون حشر ہے صبح شب وصال
دل شام سے ہے حشر کا سامان کیے ہوئے

آلودگی حرامۂ احرام دھوگئی
لوٹے طواف کوچۂ جانان کیے ہوئے

ساقی کا منتظر ہے ہر اک رند بادہ خوار
شب کو طلوع مہر کا سامان کیے ہوئے

بکنے چلا ہے عشق کے بازار مین وہ شوخ
عصمت کو اپنے حسن کا دربان کیے ہوئے

کرتا ہون سیر اپنے دل داغدار کی
آنکھون کو رشک بزم چراغان کیے ہوئے

پھر جوشش نگاہ سے اُبھرے ہین نخ عشق
دامان دل کو رشک گلستان کیے ہوئے

پہونچے گا تیرے در پر اثر ایک دن ضرور
آبادی خیال کو ویران کیے ہوئے

اثر لکھنوی

محلاتِ شاہی میں محبّت

محلات شاہی کی دنیا میں، اگر نگاہ نکتہ رس تلاش کرے تو امیر چارلس ایڈورڈ اور اُسکی بیوی لویزا کے افسانۂ رنگیں سے زیادہ دردانگیز و حسرت خیز واقعہ مشکل سے نظر آئیگا۔ لویزا، چارلس کی نازنین بیوی، گوسٹاف اوڈولف آف اسٹولبرگ کی بیٹی تھی۔

پرنس چارلس اڈورڈ دنیائے تاریخ میں اپنے حیرت آفرین حسن، اور فتنۂ دوران جمال کی بدولت اسقدر مشہور ہوا کہ اب وہ کسی معرفی کا محتاج نہیں ہے۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ اُسکی سحر فروش آنکھیں خواتین کے محبّت پرور دلوں کے لئے وہ کام کرتی تھیں۔ جو جادو نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے عالمِ شباب میں اسکاٹ لینڈ کا موضوع دل پذیر و مبحث جاں نواز تھا۔ وہ خاندانِ اسٹیوارٹ کی بیشمار نازنین آرزوؤں کا مرجع بنا ہوا تھا۔ وہ اپنی نیرنگیٔ حسن ہی کی بدولت ہر دل عزیز و مشہور آفاق نہیں تھا بلکہ اُسکی غیر معمولی بہادری و شجاعت، اور شیریں کلامی نے اُسکے آفتابِ شہرت کو اور زیادہ درخشاں کردیا تھا۔ ہر صنف نازک کی تمنائے عام تھی کہ کاش چارلس کے خاکِ قدم ہی میں جگہ ملجائے اور ہم اُسکے روئے جہاں تاب کو دیکھا کریں۔

لیکن تمام کمالاتِ ظاہری کے ساتھ اُسکے فضائے تقدیر میں کوئی ستارۂ تاباں نہ تھا۔ وہ اس خوش نصیبی و کامرانی سے متمتع نہ ہوسکا۔ جسکے خواب نما طفلی ہی سے انسانی دنیا کے بہت سے افراد دیکھتے رہتے ہیں، عالم کائنات میں اُسکی جولانیوں نے پرخطر کاموں میں گھس جانے اور بدترین دشمنی کے لئے بے جگری سے میدانِ رزم میں کود پڑنے کے سوا اُسمیں اور کچھ اضافہ نہ کیا۔ بدقسمتی سے وہ شراب بہت زیادہ پیتا تھا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بادہ پرستی نے اُسے ایک مہلک مرض کا شکار بنا دیا۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اُسکے زندانِ فرانس میں گرفتار رہنے کا سبب بھی یہی بادہ کشی ہوئی ہے۔ لیکن ہمیں اس بیان میں شک ہے۔ فرانس میں اُسکی اسیری کے اسباب اور ہی کچھ تھے جنکو روشنی میں

لانے کا یہ موقعہ نہیں۔ تاہم تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ اس کثرتِ شراب نوشی نے اُسکے حسن و جمال کو بشرۂ نورانی سے بالکل فنا کر دیا تھا۔

فرانس کی حکومت نے سیاسی مقاصد کی بنا پر چاہا کہ کوئی سرکاری خدمت اُسکے سپرد کیجائے اسلئے ایک حسین و نازنین عروس، اور گراں قدر سالانہ وظیفہ پیش کیا گیا جسکی مقدار چالیس ہزار پونڈ سے کم نہ تھی۔ اس معاوضۂ گراں کی خوشی میں وہ اُچھل پڑا، اور اس عروس جمیل کے لالچ میں اسنے بادہ و ساغر سبو و مینا کو خیرباد کہدیا۔ مگر افسوس کہ یہ تقریب حسین کامیاب نہ ثابت ہوئی۔ عروس نازنین اور شاہزادۂ حسین میں جو تفاوت عمری تھا۔ اُسنے پرنس کے فیض محبت و شباب رفتہ سے کسن و لمن کو فائز المرام نہ ہونے دیا۔ کیونکہ پرنس کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی۔ اور دوشیزہ لویزا کی بیس سال سے بھی کم۔

شاہزادی لویزا اب تک ایک معبد نسوان میں رہتی تھی۔ وہ زبردستی اپنی مرضی کے خلاف اسلئے وہاں سے لائی گئی کہ پرنس چارلس کے ساتھ اُسکا رشتۂ مودّت جوڑ دیا جائے۔ وہ اسطرح لائی گئی۔ جس طرح ایک بیکس بکری مذبح میں لیجائی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے اس روز اُسے دیکھا تھا۔ اُنکا بیان ہے کہ نازنین لویزا کا جمالِ شاہانہ آج اسطرح عنقا تھا، جس طرح کوئی ایسی چیز جسکا وجود دنیائے تخیل کے سوا کہیں نہ ہو۔ اُسکے طلائی بال پریشان تھے۔ اُسکی سحر فروش آنکھیں نرگس کے پھول کی طرح کھلائی ہوئی اور گلابی رخسار مرجھا رہے تھے۔ اُسے دیکھکر ہر متنفس کی زبان پر تھا۔ ان ھذا الا ملک کریم۔ بے شک ایک آسمانی دیوی (فرشتہ) ہے۔ مختصر یہ کہ اُسمیں اور اُسکے دینے والے شریک زندگی میں فرق بیّن تھا۔ اور سوء اتفاق کہ نازنین لویزا کا عقد جمعہ کے دن ہوا۔ و مغربی دنیا میں بدشگونی کا دن ہے۔ چنانچہ بہتوں کو زوجین کی سعادت و کامرانی میں ابھی سے شک پیدا ہوگیا تھا۔

نکاح ہوگیا۔ اور پرنس ایڈورڈ عرصہ تک اپنی جاں نواز بیوی کی خاطر ترک مئے و ساغر کئے رہا۔ اور اپنی مالکۂ قلب کی نسبت ہم نشینی میں وہ لطف شراب کو گویا بھول گیا تھا۔ لیکن افسوس اس دوہ پرست شاہزادہ کی یہ پاکبازی وقتی ثابت ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس باب میں وہ کوئی عذر بھی کرتا ہو۔ مگر شاہزادی نے جو رائے اپنے شوہر کی نسبت قائم کی، وہ اُسے نہ چھپا سکی۔ لویزا نے

اُسکا نام "سخرا" اور "فضول گو" رکھا تھا۔ جسکے اعصاب کو کثرتِ شراب نے شل اور بیکار کر دیا ہو۔ اور زمانہ نے اُسکی کمر کو جھکا دیا ہو۔ اُسنے پرنس کو یہ بھی باور کرا دیا کہ محض سیاسی مصالح کی مجبوریوں کے سوا وہ کسی طرح بھی اُسے شوہر بنانا پسند نہیں کرتی خاندانِ شاہی کے بہت سے ایسے امرا دل سے اُسکے آرزومند ہیں۔ جو اُسکے (لویزا کے) نقشِ قدم کو سجدہ گاہ نیاز بنائیں اور اُسکے تبسمِ ناز کو کونین کی دولت سمجھیں۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ لویزا اس شان و شوکت اور مرتبہ کی شاہزادی تھی کہ بڑے بڑے امرا و رؤسا اُسکی لذتِ ہم نشینی کے مشتاق، اُسکی شیریں کلامی کے لئے ہمہ تن گوش اور اُسکے ظریفانہ نکات کے متمنی رہتے تھے۔ اُسکی خوشنودی اور ایک نگاہِ لطف پر ورکی امید حصول میں ہر طرح کی قربانی مایۂ نازش سمجھتے تھے۔ لویزا کے اِن شیفتگان حسن میں، امرا، رؤسا، سیاسی ماہرین، فنا پرداز، ادیب، شعرا، مصورین اور اطراف کے مشاہیر شامل تھے۔

شاہزادی لویزا اس صورت سے اپنی زندگی گزار رہی تھی کہ سلاطین یورپ اُسکے شوہر کی عالی حسب و نسب کے بھی معترف نہ تھے۔ مگر وہ کچھ اسکی پروا نہ کرتی تھی۔ کچھ شک نہیں کہ لویزا کمال سعادت و کامرانی کی زندگی گزار سکتی تھی۔ اگر اُسے اپنے بدنصیب شوہر کی اصلاح حالت سے، اور عالم بیخودی و مستی سے دنیائے ہوش میں لانے کی طرف سے قطعی یاس نہ ہوتی۔

اس عقد رسمی کو ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ پرنس اس راز سے واقف ہو گیا کہ اُسکی نازنین بیوی اُس سے ملول و متنفر رہتی ہے۔ اور اپنے شوہر کی ہم نشینی کے بجائے وہ اپنے اُن دیرینہ دوستوں کی ہم نشینی سے زیادہ مسرور رہتی ہے جو پرنس بادہ نوش سے زیادہ اُسکے نزدیک رفیع المرتبہ ہیں۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا تو رشک و غیرت اور رنج و غصہ نے پھر اُسے بادہ و ساغر کی طرف متوجہ کر دیا۔ اُسکا دل حسد و غیرت کی آگ سے دہک رہا تھا۔ اُسنے جام و صراحی کے سوا کوئی اپنا شریکِ غم نہ پایا۔ اب اس نے قابل پرنس بیوی کے ایذا رسانی کا سلسلہ شروع کیا۔ اُسکو طرح طرح سے تنگ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک روز کمرے میں بند کر دیا۔ تاکہ وہ اپنے عزیز دوستوں کی زیارت و ملاقات سے محروم رہے۔

تیسرے مہینے بھی شروع سے آخر تک وہ اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ جام و مینا بھی ساتھ ہوتا تھا۔ اکیسویں بھی ختم نہ ہونے پاتا کہ وہ اپنی کرسی پر مدہوش ہو کر چت گر پڑتا تھا۔ حسن و محبت کی

نہ کر سکتا تھا۔ تب اُسکے آدمی اُٹھا کر اُسے محل میں لیجاتے تھے۔ وہ زندہ مگر بحالت مردہ صبح تک پڑا رہتا تھا۔

اِن دونوں کی شادی کو پورا ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یہ سب واقعات پیش آ گئے۔ لہذا شاہزادی کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ دوسرے ذرائع سے پورا فائدہ اُٹھائے۔ اور اپنی زندگی کو پرلطف و پرمزہ بنانے کے اسباب پیدا کرے۔ اس زمانہ میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ رومیہ میں رہتی تھی۔ جہاں اور بھی بکثرت شریف و امیرزادیاں رہا کرتی تھیں۔ جو متہم تھیں۔ کہ در پردہ احباب رکھتی ہیں۔ مگر لویزا نے اس قسم کے لہویات اور ناجائز اسباب سے کبھی اپنے کو نشانۂ ملامت بنانا نہ چاہا۔ بلکہ درس و مطالعہ سے راحت فکر و اطمینان قلب کا سامان بہم پہونچانے لگی۔

مگر تھوڑے ہی دن بعد اُسے رومیہ سے فلورنس میں منتقل ہو کر آنا پڑا۔ باہمی معاملات پہلے سے زیادہ ناخوشگوار ہو چکے تھے۔ لویزا کا مزاج فوجی شوہر بدکلامی ہی سے پیش نہ آتا تھا بلکہ بسا اوقات تہدید بھی کرتا رہتا تھا۔ اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ لویزا کو چارلس کی طرف سے اپنی جان کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ وہ اُس سے بہت زیادہ خائف رہنے لگی۔ بالخصوص اسوجہ سے اور بھی کہ چارلس لویزا کو صحت و تندرستی کی حالت میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا غرض لویزا، بدنصیب لویزا جن آلام و صدمات کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ اُس سے بھی زیادہ ایسے خطرات کا اندیشہ اُسے اور ہلاک کئے دیتا تھا۔ جو انسان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتے۔ آخر اس مہلک گڑھے سے اُسے ایک نئے ایکٹر نے نجات دی۔ جو بہت جلد لویزا کی زندگی کے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ وہ کون تھا؟ فیکٹر فیری!

فیکٹر فیری یورپ کے تمام نوجوانوں سے زیادہ حسین و جمیل تھا۔ وہ عالم حسن میں درجۂ امتیاز رکھتا تھا۔ وہ سن میں شاہزادی لویزا سے صرف چار سال بڑا تھا۔ اِس حسین امیرزادہ میں وہ تمام صفات بدرجۂ کمال موجود تھے۔ جو شرفاء کے لئے مایۂ نازش و مباہات ہو سکتے ہیں۔ وہ سیاح بھی تھا۔ وہ یورپ کے تمام پایۂ تختوں کی سیر کر چکا تھا۔ اور ہر جگہ اپنے پیچھے بہترین یادگاریں چھوڑ آیا تھا۔ بالخصوص محلات شاہی کی دوشیزہ خواتین کے دلوں میں۔ اسکے علاوہ وہ ایک زبردست شاعر اور زندگی کے اسرار کا ماہر تھا۔ اُسنے ہر ساغر زندگی کا مزہ چکھا تھا۔ یہاں تک کہ زہر کا بھی۔ اُسکے لئے ایک ایسی عورت کے دل کو شکار کر لینا ذرا بھی مشکل کام نہ تھا۔ جسے قدرت نے خود اُسکے قدموں میں

ڈال دیا ہو۔ یہی تھا۔ وہ نوجوان جسکے بشرہ کی تابشِ جمال نے لویزا کے ظلمت کدۂ قلب کو منور کر دیا۔ فیری نے لویزا کے نظارۂ اول سے متاثر ہو کر جو مکتوبِ محبت لکھا ہے۔ اُسکا ایک فقرہ ملاحظہ ہو۔ لکھتا ہے۔

"آخر کار میں نے تمھیں کو وہ عورت پایا جس سے میں محبت کر سکتا ہوں۔ جس وقت سے تمھارا نظارۂ ہوش رُبا دیکھا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ایک روح تازہ مجھ میں پھونک دی گئی ہے۔ اور میرا ویرانۂ دل تازہ ترین آرزوؤں سے معمور کر دیا گیا ہے۔"

اس مقابلۂ نظر کے بعد دورِ سعادت و کامرانی شروع ہوتا ہے۔ جس میں لویزا، محبت کی دیوی لویزا رات کی تاریکیوں کے آغوش اور گھنے درختوں کے سائے میں اپنے حبیب جان نواز کی ملاقات سے لذت اندوز ہوا کرتی تھی۔ اور یہ دونوں پردہ پوش رات کی خاموشیوں میں محبت کی دلپذیر سرگوشیوں اور حسن و عشق کے نغمات و اشعار کے مزے لیا کرتے تھے۔ اُدھر ایڈورڈ اپنی بدمستی و مدہوشی میں تھکے ہوئے بیل کی طرح پڑا رہتا تھا۔ اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔

ناز پروردہ لویزا اور اُسکے حبیب دلنواز کو اسی طرح سعادت و کامرانی سے متمتع ہوتے پورے تین سال گذر گئے۔ اس سے زیادہ اور کیا خوش نصیبی کا دور ہو سکتا ہے۔ اسکے بعد ایک ایسا حادثہ پیش آیا۔ جو وہم و گمان میں بھی ممکن نہ تھا یعنی ایک روز ایڈورڈ شدید بدمستی کے عالم میں اندر گھسا۔ غیرت اور رشک و حسد نے اُسکے دل کو بالکل جلا دیا تھا۔ اسنے اپنی بیوی پر شدید حملہ کر دیا۔ اور چاہتا تھا کہ گلا گھونٹ کر اُسکا کام تمام کر دی۔ نازنین لویزا کے لئے اس سے بڑھ کر ذلت و توہین کیا ہو سکتی تھی۔ لویزا کے لئے اب اُس شرابی شوہر کے گھر میں ایک منٹ بھی رہنا غیر ممکن تھا۔ اُسنے اُسی شب کو یہ طے کر لیا کہ صبح ہوتے ہوتے وہ بھاگ جائیگی۔ چنانچہ صبح اپنی سُہانی روشنی لیکر عالم کو منور کرنے کے لئے بڑھی ہی تھی کہ لویزا اپنا تھوڑا سا ذاتی سامان لیکر خفیہ گھر سے نکل کر ایک معبد میں چلی آئی جو اُسکے گھر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ نامراد چارلس نشۂ خواب و بدمستی سے ہوشیار ہوا تو اپنی زیادتی اور تشدد پر بہت نادم ہوا۔ جو حالت شک و رشک میں گذشتہ شب کو اُس سے عمل میں آچکی تھی۔ اور معلوم ہوا کہ اُسکی بیوی بھاگ کر گرجا میں پناہ گزیں ہوئی ہے۔ وہ بھی پہونچا مگر انتہائی اظہارِ ندامت، اور منت و سماجت، خوشامد کچھ کام نہ آئی لویزا کسی طرح ملنے پر راضی نہ ہوئی۔ اور وہ گرجا کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوا۔ زور زور سے اُسنے کھٹکھٹایا۔ تو نئے معبد نکل آئی اور چارلس کو سمجھایا کہ وہ قانوناً اندر نہیں آسکتا۔ اور اُسکی بیوی آئندہ کبھی اُس سے

نہیں مل سکتی۔ وہ نہایت پشیمانی و پریشانی کے ساتھ ناکام و نامراد واپس ہوا۔ اور اس زندہ نعمت کے ہاتھ سے نکل جانے پر کفِ افسوس ملنے کے سوا کیا فائدہ تھا۔ اب کوئی امید نہ تھی کہ وہ سونے کی چڑیا پھر ہاتھ آسکے گی۔ اِس دلچسپ ڈرامے کے پہلے باب کا یہ آخری سین تھا۔

اسکے بعد چار پس آٹھ سال اور زندہ رہا۔ مگر اس صورت سے کہ جام و ساغر کے سوا کوئی اُسکا رفیق زندگی اور شریکِ غم نہ تھا۔ آخر اسی رفیق نے رفتہ رفتہ اُسے گوشۂ قبر تک پہونچا دیا۔ خود اُسنے بھی راحت ابدی پائی۔ اور اپنی نازنین و مظلومہ بیوی کو بھی کلفتِ دیرینہ سے نجات دی۔

اب مستِ ناز لویزا بالکل آزاد تھی۔ وہ اور اُسکا حبیب دلنواز فیری دونوں یہاں سے چلدیئے۔ مختلف ممالک اور بڑے بڑے شہروں کی سیر و سیاحت اُنکا مشغلہ تھا۔ کانٹا نکل چکا تھا۔ دونوں کی زندگی قابلِ رشک و کامیاب تھی۔ وہ تھے اور دنیائے عیش و نشاط، لذّت سرور و انبساط، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لویزا اور فیری دونوں کو کبھی نکاح کے خیال نے پریشان نہ کیا۔ اُسی محبت کے استوار رشتہ سے وابستہ رہے۔ خوشیوں کے سال منٹوں کی طرح گزرتے رہے۔ کبھی یہ خیال بھی پاس تک نہ آتا تھا کہ دنیا میں اس راحت و شادمانی کی زیست سے بہتر کوئی اور زندگی ہو بھی سکتی ہے۔

ع "حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زدند"

(ترجمہ)

محوی صدیقی

اے میرے بار بار دھڑکنے والے دل صرف ایکبار دھڑک اور ساکت ہو جا۔

اے میرے ہر لحظہ تڑپنے والے قلب ایک دفعہ تڑپ اور تڑپ کر خاموش ہو جا۔

اے محبت کی خلشِ غم۔ ہاں کوئی ایسا نشتر بھی چبھے جسکی آخری کھٹک کے بعد مجھے سکونِ جاوید نصیب ہو۔

اے ہر دم یاد آنیوالی تصویر۔ بس ایک ہی بار یاد آ۔ اور مجھے قیامت تک کے لئے خود فراموش کر دے۔

ہاں ہاں اے لیلۃ الفراق کے سیاہ اور بھاری پردو" جس طرح تم نے مجھے اس مجسمۂ حسن سے جدا کیا ہے اسی طرح اب میری روح اور جسم کے درمیان بھی حائل ہو جاؤ اور دونوں کو جدا کر دو۔

مترجمہ حضرت مجنون

شیلے

پرسی بیشی شیلے انگلستان کے ایک معزز گھرانے مین ۱۷۹۲ء مین پیدا ہوا۔ اُسکے آبا واجداد بڑے بڑے عہدون پر ممتاز تھے اُسکا دادا بیرونٹ تھا جو اُسوقت خاندان کا سرپرست تھا۔ شیلے کا باپ ٹیمو تھی شیلے پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ مگر دونون کی طبیعتون مین زمین و آسمان کا فرق تھا۔ شیلے نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ وہ بیحد ذکی الحس تھا اُسنے اپنی زندگی کا مطمح نظر بنالیا تھا کہ وہ حتی الامکان مختلف علوم مین اپنا وقت صرف کرکے اُنمین ترقی حاصل کریگا۔ یونانی شعرا کا کلام اُسے بہت مرغوب تھا۔ اسکے علاوہ کیمیاگری اور ساحری سے بھی اُسے کچھ نہ کچھ اُنس تھا اور اُسکا اکثر وقت اسی خطرناک تجربون مین گذرتا تھا۔ شیلے نہایت خلیق اور بامروت تھا۔ اُسے اپنے عزیزون سے اسقدر محبت تھی کہ اُنکے لیے جان دینا بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ محبت اُسے اپنی بہنون سے تھی۔ اور اُسکا اکثر وقت اُنھین کے ساتھ کٹتا تھا۔ وہ ہر وقت اُنکے خوش کرنے اور انکو ہر کام مین مدد دینے کا خواہشمند تھا اور جب بھی موقع پاتا دریغ نہ کرتا۔ شیلے کی ابتدائی تعلیم برانٹ فورڈ اور ایٹن کے مشہور سکولون مین ہوئی۔ مگر وہان اُسے بالکل ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ سکول کے لڑکے اور اُستاد ہر وقت اُسے تنگ کرتے تھے اور اُس سے کسی قسم کی ہمدردی نہ کرتے تھے یہ کہدینا بھی ضروری ہے کہ شیلے کے عادات واطوار ہی کچھ اس قسم کے تھے جنھون نے اُسے اُستادون اور لڑکون کی نظرون مین ذلیل بنا دیا تھا۔ بالے سکول کا زمانہ ختم ہوا۔ اب اُسنے کالج مین داخل ہونیکی ٹھانی چنانچہ وہ آکسفورڈ کالج مین داخل ہوا جہان اُسکے اور بھی بہت سے رشتہ دار تعلیم پاچکے تھے مگر وہان بھی اُسے اطمینان نصیب نہوا۔ اندنون کچھ شیلے کی طبیعت مذہب کی طرف زیادہ مائل تھی۔ ایک رسالہ خدا کی ہستی کو نہ ماننے کی ضرورت پر لکھ مارا۔ وہ کسی طرح یونیورسٹی کے اعلیٰ

افسر ڈین" کے پاس پہونچ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کالج سے نکالے گئے۔ شیلے کے باپ نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح شیلے اپنی غلطی کا اقرار کرلے اور معافی مانگ لے تاکہ اُسکی آیندہ زندگی برباد نہو جائے۔ مگر اُسنے ایک نہ مانی۔ اپنی ضد پر قائم رہا اور آپ سے ناراض ہو کر لندن مین ایک دوست کے پاس چلا گیا۔ انھین دنون مین شیلے کی بہنین لندن کے کسی دارالعلوم مین تعلیم پاتی تھین اور وہ انسے اکثر ملنے جایا کرتا تھا۔ اُسی اسکول مین ایک اور لڑکی ہیرٹ وسٹ برک بھی پڑھتی تھی جسکا شیلے کی بہنون سے بہت ارتباط و اتحاد تھا۔ ہیرٹ کا باپ ایک سخت مزاج آدمی تھا اور ہیرٹ اُس سے سخت تنگ آئی ہوئی تھی۔ شیلے کو اُس سے کچھ ہمدردی سی ہوگئی جسنے آخر کار محبت کی صورت اختیار کر لی آخر کار شادی ہوگئی۔ مگر یہ رشتہ بہت دیر تک نہ رہ سکا۔ کیونکہ شیلے کو اُسکے متعلق کچھ بدگمانیان سی ہوگئی تھین۔

شیلے غضب کا حسن پرست تھا۔ وہ بہت جلدی دل دے دیتا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اُسے اخیر مین پچتانا پڑتا تھا۔ بعضون کا خیال ہے کہ اسکا چال چلن درست نہین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجنون شیلے کے نام سے مشہور ہوگیا تھا مگر دراصل بات یہ تھی کہ وہ ایک ابدی محبت کا پجاری تھا۔ وہ اُس محبت کا خواہشمند تھا جو کبھی فنا نہین ہوتی وہ اس محبت سے بیزار تھا۔ جو اس دنیاے جدوجہد مین فنا ہو جاتی تھی۔

لندن مین اُن دنون ولم گاڈون ایک سوداگر رہتا تھا جسکی ایک نہایت خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ میری گاڈون علاوہ حسن ظاہری کے حسن باطنی سے بھی مزین تھی۔ شیلے اکثر وہان آیا جایا کرتا تھا کشش دونون طرف ہونے لگی آخر کار ایک دن موقع پاکر دونون بھاگ نکلے ہیرٹ کیلیے یہ ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ وہ زیست سے بیزار ہوگئی۔ وہ سکون چاہتی تھی سکون مطلق، اُسے خلوت پسند تھی خلوت محض، اُسنے حصول مسرت کی آرزو چھوڑ دی وہ ہرگز نہین چاہتی تھی کہ کوئی اور خواہش کامیاب ہو کر اُسکی روح مین کوئی تحریک پیدا کرے، انسانی دل برگ گل سے زیادہ نازک ہے۔ اُسکا دل ٹوٹ گیا۔ آخر کار ایک دن خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ شیلے کے دل پر اس خبر نے بہت بڑا اثر کیا۔ شاعر کے جذبات اور احساسات فطرتاً نہایت نازک لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہین۔ ایک مونس کی جدائی ہر شخص پر

اثر کرتی ہے۔ لیکن شاعر اس موقع پر بیتاب ہو جاتا ہے یہی حال شیلے کا تھا۔ اسکی آیندہ زندگی کو ہیرٹ کا خیال بہت بامزہ کر دیتا تھا اُسکا کلیجہ شق ہو جاتا تھا۔ اس خیال سے کہ زندگی کی مہلت قلیل ہین اگر چند تعلقات ہم پیدا کرتے ہین تو اس اعتبار پر کہ رفاقت روحانی رنگ مین دائمی ہوگی لیکن موت ہمین اس سے مایوس کر دیتی ہے۔ اسلیے وہ کہا کرتا تھا کہ کسی کے ساتھ تاحیات رشتۂ محبت قائم کرنے کی آرزو کرنا سخت غلطی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آئے دن نئی محبت مین گرفتار پایا جاتا تھا۔

اب شیلے نے اٹلی مین سکونت اختیار کی اور اپنی خداداد لیاقت کے جوہر دکھانے لگا۔ دنیا کے ہر گوشے مین اسکی تعریف ہونے لگی اسکی نظمون مین ایک یہ خاصیت تھی کہ اُنمین ایک قسم کی شیرینی پائی جاتی تھی جو اور شاعرون مین کم دیکھنے مین آئی ہے۔ اُسکے خیالات اور جذبات کی پاکیزگی۔ تخیل کی رفعت نے اُسے دنیا مین اور بھی مشہور کر دیا۔ وہان لارڈ بائرن سے اُسکی پہلی ملاقات ہوئی جو دونون کیلیے مفید ثابت ہوئی وہان کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اُسکی دوستی ایک لڑکی اَمیلیا ویوینی سے ہوگئی۔ یہ لڑکی بلا کی حسین اور ذہین تھی۔ اسکا باپ نہایت سخت مزاج آدمی تھا اُسکا خیال تھا کہ لڑکی کا یہ میل جلن کچھ شبہ ہے۔ اسلیے اُسنے ایک آسیب مین اُسے قید بنا کر سزا کے طور پر بھیجدیا۔ ایک دفعہ شیلے کو بھی اُس سے ملنے اور اُس سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا نتیجہ یہ ہوا کہ شیلے اور اُسکی بیوی میری کو اُس سے بہت محبت ہوگئی۔ وہ اُسے نہایت پاک دامن اور نیک لڑکی خیال کرتا تھا۔ دونون میان بیوی اکثر ملنے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اسکی یاد مین ہمارے شاعر نے ایک نظم بھی لکھی ہے جو قابل دید ہے۔

شیلے کی موت کا قصہ بھی نہایت عجیب ہے۔ ایک روز سمندر کی سیر کر رہا تھا۔ کہ طوفان آگیا اور تاریکی مین کچھ پتہ نہ چلا کہ کون کدھر جاتا ہے جب طوفان تھم گیا۔ تو شیلے کی کشتی کا پتہ نہ لگا آخر کار دو دن کے بعد اسکی لاش ساحل سمندر پر ریت مین دبی ہوئی ملی۔ لاشہ جلایا گیا مگر کہتے ہین کہ شاعر کا نازک دل آگ کے شعلون سے بالکل محفوظ رہا۔

آہ! شیلے! تو موجود نہین مگر تیری یاد ہمارے دل مین اور تیرا کلام ہمارے پیش نظر ہے ہم دیکھتے ہین کہ تیرے شعرون مین تیرے دل کی تصویر جھلک رہی ہے

افتخار الرسول بدا

ماں یا ڈائن

(۱)

شام ہوگئی۔ تاریکی بڑھتی جاتی ہے لیکن ابھی تک گھر میں چراغ نہیں جلا۔ نئی بہو کو ابھی شرم ہی سے چھٹی نہیں ملتی۔ گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے شرماتی ہے، پھر اُٹھکر چراغ کیونکر جلائے۔

ایک پرکاش ہے۔ اُسے اتنی سمجھ کہاں کہ روشنی کا سامان کرے آخر بابو گنیش داس جی نے خود ہی کپڑے کی بتی بنائی، اور چراغ میں رکھکر تیل ڈھونڈنے لگے، مگر تیل کا برتن کہیں بھی نہ ملا۔ نئی بہو سے پوچھا:۔

"کیوں جی! کچھ تیل کے برتن کا بھی پتہ ہے"؟

لیکن ابھی گھر کے کام کاج سے اُسکا تعلق ہی کیا تھا کہ اُسے تیل کے برتن کا پتہ معلوم ہوتا۔ سر جھکا کر چپ ہو رہی۔ تیل کے برتن کا پتہ کیا بتاتی۔

(۱) ننھے پرکاش نے البتہ اپنی معصوم اور تتلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بابو جی تیل کل ہی کھتم (ختم) ہوگیا۔ (برتن) بلیتن المالی میں پلا ہے" (بڑا) "اور جھٹ برتن اُٹھا کر لے آیا"۔

اِتنے میں ہوٹل کا نوکر کھانا لیکر آیا۔ اُس سے کھانا چوکے میں رکھوا کر بابو گنیش داس نے چار آنے کا تیل منگوا لیا۔

تیل آیا۔ اور دیا جلا

دیئے کی روشنی سے اندھیرا دور ہوگیا۔

پرکاش نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جے!"

سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے کسی شخص نے کہا۔ "تیری بھی جے ہو۔ اِس دیئے کی طرح تو بھی روشن ہو"

آواز سُنکر "بھیا! بھیا! نمشکار" کہتا ہوا پرکاش سیڑھیوں کی طرف دوڑا۔ آنیوالا پرکاش کا بھائی تھا۔ اُسکا نام گیان تھا۔ اُسنے پرکاش کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور پیار سے کہا۔ جیتے رہو

پرکاش چرنجیو ہو۔"

باہر ہوا تیز چل رہی تھی۔ ایک جھونکا کھڑکی کے کیواڑوں سے لڑ جھگڑ کر اندر آ ہی پہونچا۔ اور چراغ بجھ گیا!

گیان کا دل دھک سے رہ گیا۔ "ہیں۔ تو کیا پرکاش بھی اسی طرح ... نہیں نہیں یہ وہم ہے" بابوجی بولے "ارے بجھ گیا۔ ایسے دیئے سے کیا فائدہ۔ کل ہی کنکشن کے لئے لکھیں گے۔ یوں گیان۔ چار بتیاں کافی ہونگی نہ؟"

گیان اپنے ہی خیال میں غلطاں تھا۔ کچھ نہ بولا۔

پرکاش نے کہا "ایک بجلی کا پنکھا بھی"

بہت اچھا۔ بابوجی نے کہا۔ اور کھڑکی کو اچھی طرح بند کر کے پھر دیا جلایا۔

پرکاش گیان کی گود سے اتر آیا۔ اور نئی بہو کا آنچل پکڑ کر کہنے لگا۔ اٹھ سبھدرا۔ لو بی تو (سبھدرا) (لو دی) پلوس دے۔ بھیا کو بھوک لگی ہے۔

بابوجی بولے "ہشت پگلے۔ نام نہیں لیتے۔ ماں جی کہہ"

"ماں جی؟ کیوں بھیا۔ یہ ماں جی ہیں"

گیان کا چہرہ اداس ہو گیا۔ ماں کا پرجلال چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ وہ محبت اور ایثار کی دیوی۔ جس نے تمام عمر اپنے دل کو اپنے خاوند اور لڑکوں کے دکھ سکھ کا آماجگاہ بنائے رکھا۔ جسکے رہتے ہوئے گھر پر شانتی کی حکومت تھی۔ موت نے ہمیشہ کے لئے اسکو اس گھر سے جدا کر دیا۔ اسکی جگہ یہ کل کی چھوکری آ گئی ہے۔ تب شانتی تھی۔ اب سنسان ہے۔ شانتی اور سنسان میں بڑا فرق ہے۔

پرکاش نے کوئی جواب نہ پا کر پھر پوچھا "ہاں بھیا۔ یہ ماں جی ہیں؟"

گیان نے دل میں سوچا "کیا یہ پرکاش کی بیماری میں رات بھر جاگے گی۔ یا سکھ کی نیند سوئیگی اسکو تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے گی۔ یا خوشی منا دے گی؟ جب یہ رو دے گا تو کیا اسکا دل بھی رو دیگا یا خوشی منائے گا؟ مرحوم ماں کی طرح کیا یہ اسے محبت کی نگاہوں سے دیکھے گی یا مسے جلتی رہے گی؟ کیا یہ ماں بنے گی یا ڈائن؟ پتہ نہیں کیا بنے۔ دیکھیں یہ ماں بنتی ہے

یا ڈائن . . . "

گیان نے آہستگی سے جواب دیا "ہاں - یہ ماں ہی ہیں"

یہ سُنکر پرکاش نے پھر کہا "اچھا ماں جی روٹی پلوس دو نہ" لیکن نئی بہو یعنی سبھدرا (روٹی) (پروسی) نے سے مس نہ ہوئی - آخر بابو جی نے ہی روٹی پروسی - اور تینوں باپ بیٹوں نے کھائی - کھانا ختم ہونے پر گیان نے کہا "آج میں بورڈنگ ہاؤس میں کشن چند کے پاس ہی رہوں گا - واپس نہیں آؤنگا - کل امتحان ہے - اسلئے کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے"

پرکاش نے پرنام کیا - اُسکو پیار کرکے گیان گھر سے چلا گیا -

(۲)

دیئے کی روشنی اور پرکاش کی زندگی - کیا دونوں ایک سی ہیں ؟ روشنی نے ایک منٹ کیلئے فتح حاصل کرلی - اندھیرے کو دور بھگا دیا - اور پھر خود ختم ہوگئی - کیا اسی طرح پرکاش بھی . . . ؟"

انسانی زندگی کیا ہے - فقط کچی مٹی کا گھڑا - کبھی سطح آب پر ادھر اڑ کتا ہے - کبھی اُدھر - لیکن پانی کا ایک جھکولا آیا - اور بس ختم - پتہ ہی نہیں کہ تھا بھی یا نہیں - مگر کیا . . . پرکاش بھی اسی طرح . . . ؟"

خیالات پریشان زبردستی گیان کے دماغ میں جگہ حاصل کر رہے تھے - وہ انھیں دور کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ اور بھی زور شور سے گھستے چلے آتے تھے - چلتی ہوئی رَو بند نہ ہوئی - سلسلہ ختم نہ ہوا -

شبنم صبح صبح چٹکتے ہوئے غنچوں اور کھلے ہوئے پھولوں کی شان کو دوبالا کرتی ہے - اُسوقت بلم اور یاقوت بھی اُس سے شرماتے ہیں - لیکن زرا سورج بڑھا - اور بس - فنا -

ہوا کے جھونکے نے دیا گُل کردیا - گھڑا پانی کے جھکولے سے ٹوٹ گیا - شبنم کو سورج نے مٹا دیا - یا پرکاش بھی اسی طرح . . . .

گیان نے بہت کوشش کی لیکن خیالات ہٹانے سے نہ ہٹے - سر ہلایا - آنکھیں بند کیں - سندھ کو کون باندھ روک سکتا ہے - سلسلہ قائم ہی رہا -

ہاں تو پرکاش . . . کو کون مٹائے گا ؟ . . . کیا نئی ماں ہی اُسکی ہتیا کریگی ؟ کیا سبھدرا ہی ڈائن بنے گی ؟ . . . برے ہر سے شبھ شبھ بول - عورت ذات تو پریم مجسم ہے - دوسرے کا دکھ دیکھا اُسکا دل بھی ہو جاتا ہے تو کیا لینے ہی خاوند کے بیٹے کا بُرا چاہے گی - مگر عورتوں میں بھی

ڈائن بھی ہوتی ہیں ... تو سبھدرا کیا بنے گی؟ شفیق ماں - یا سنگدل ڈائن؟

(۳)

ہوٹل سے روٹی آنی بند ہوگئی - اور سبھدرا خود پکانے لگی - گھر کا سب کام کاج اُس نے سنبھال لیا - سودا سلف بابو جی لے آتے تھے - پرکاش کو بھی کچھ کام کرنا پڑتا تھا - پہلے تو کئی مہینے سبھدرا پرکاش سے بولی تک نہیں - وہ ماں جی ماں جی کہتے تھک جاتا - مگر کیا مجال جو کبھی سبھدرا نے اُس غریب پر شفقت کی نظر ڈالی ہو -

اسی طرح دن گذرتے گذرتے سال ختم ہوگیا اور گیان کے وہم نے عملی صورت اختیار کرنی شروع کردی -

ایک دن خلاف معمول سبھدرا پرکاش سے کہنے لگی "اس کتاب کے ورق جڑے ہوئے ہیں انھیں علیحدہ علیحدہ تو کردے"

پرکاش خوشی سے پھولا نہ سمایا - شکر ہے - ماں بولی تو سہی - بہت اچھا ماں جی" یہ کہکر وہ چاقو سے ورق علیحدہ علیحدہ کرنے لگا - بچہ تھا - علیحدہ کرتے کرتے ایک دو ورق پھٹ گئے - بس پھر کیا تھا - وہ تو گویا موقعہ ہی ڈھونڈھ رہی تھی - کڑکتے بادلوں کی طرح گرج اُٹھی - خوب دل کھول کر گالیاں سنائیں - غصے سے اُسکے چہرہ کا رنگ سُرخ ہوگیا جسم کانپنے لگا -

پرکاش نے میٹھی میٹھی باتوں کے سوا کبھی کچھ نہ سُنا تھا - سبھدرا کی یہ کیفیت دیکھ کر سہم گیا - اُسکی جان آدھی رہ گئی - ڈر سے پیشاب خطا ہوگیا -

اسپر بھی سبھدرا کو اُسکی بیکسی پر ترس نہ آیا - گھونسوں - تھپڑوں - لاتوں کی بوچھار کردی -

پرکاش ہائے ماں جی، ہائے ماں جی چلاتا رہا -

پڑوسی عورتوں سے بھی سبھدرا کا میل جول نہ تھا، وہ گلی میں کبھی جھانکتی بھی نہ تھی - ہر وقت ناول قصے پڑھنے میں مشغول رہتی تھی - اب جو گلی والی عورتوں نے پرکاش کی چلاہٹ سُنی تو مکان میں چلی آئیں - سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی عورتوں کی آواز سُنکر - سبھدرا کا ہاتھ ذرا تھما - مگر اُس کا غصہ اپنا کام کرچکا تھا - پرکاش بیہوش پڑا تھا!

بسنتی کی ماں نے غصہ سے کہا - ارے ماں ہے تو - نرد ئی راکشسی! اور پرکاش کو دیکھ کر بولی

ہائے ہائے! بھنا تو بیہوش ہے۔ ذرا پانی تو لاؤ کوئی۔"

دو تین لڑکیاں دوڑی دوڑی اوپر چوکے سے پانی لے آئیں۔ بسنتی کی ماں نے پرکاش کو گود میں لے لیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ چند منٹ بعد اُسے ہوش آیا۔ آنکھیں کھولیں۔ لیکن پھر ڈر کے مارے بند کر لیں۔ بسنتی کی ماں نے چمکار کر کہا۔

کھول دے آنکھیں میرے لال۔ ہم سبھدرا کو ماریں گے۔"

پرکاش نے آنکھیں کھول کر دھیمی آواز سے کہا۔ نہ۔ نہ۔ انھیں نہ مارنا (مانا)۔ وہ میلی ماں جی (میری) ہیں۔ مجھ سے کتاب پھٹ گئی تھی۔"

دیوکی نے کہا۔" ارے یہ اور ماں۔ یہ تو ڈائن ہے ڈائن۔ اسکے بس میں ہو تو کچا کھا جائے۔

سومترا بولی۔ آج جب گیان آئے۔ اُسے اس ڈائن کی کرتوت بتا دینا۔"

رامی نے کہا۔ بابو سے کہو گی تو وہ اُلٹا تمھیں ہی ڈانٹیں گے۔"

دیوکی نے کہا۔" وہ تو اس ناگنی کے بس میں ہو گئے۔"

اِس پر سب ہنس پڑیں۔ سبھدرا بوکھلا گئی۔ پرکاش کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

بازار سے کچھ دودھ منگوا کر پرکاش کو پلوایا۔ اور پھر سب عورتیں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

اُسی روز یہ پردہ کھل گیا کہ جو ماں بنی تھی وہ ڈائن ہے۔ سوت تو نہ تھی مگر سوت کے بیٹے تو تھے۔ اُنھیں کے جلاپے میں جل گئی۔

اُس رات پرکاش نے اپنی مار کی بابت گیان کو کچھ نہ بتایا۔ لیکن اب شاید ہی کوئی دن جاتا۔ جسدن اُسے سبھدرا نہ مارتی۔ گالیوں اور بے دریغ مار نے اُسکا سب بھولا پن چھین لیا۔ اب پرکاش پہلا بھولا بھالا پرکاش نہ تھا۔ وہ پرکاش جو کبھی کھلونوں سے کھیلتا رہتا تھا۔ اُچھلتا تھا۔ کودتا تھا۔ جو ایک دم بھی نچلا نہ بیٹھتا تھا۔ اب ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں پڑا رہتا تھا۔ جو کھانے کو ملگیا۔ کھا لیتا۔ کبھی مانگتا یا ضد نہ کرتا تھا۔ پھول سے گال کملا گئے۔ رنگ پیلا پڑ گیا۔

گیان اُسکی دن بہ دن بری صحت اور چپ کو دیکھکر چوکنا ہو گیا۔ ایک دن اُسنے پرکاش کو نودی میں بٹھا کر پیار کیا۔ اور پوچھا:۔" کیوں پرکاش تم اب ہر وقت چپ چاپ کیوں رہتے ہو؟"

"نہیں بھیا کوئی بات نہیں۔"

گیان نے پیار سے پوچھا "تمہیں ماں جی تنگ تو نہیں کرتیں؟"

یہ سوال سُنکر پرکاش کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ "ہاں بھیّا وہ مجھے بہت مارتی ہیں۔ بسنتی کی ماں کہتی تھی۔ کہ مائیں ایسی بے دردی سے نہیں مارا کرتیں۔ کیا وہ ماں ہی بھیّا؟"

گیان سارے دن بورڈنگ ہاؤس میں اپنے دوست کشن چند کے پاس پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتا تھا۔ صبح اور شام دو وقت صرف روٹی کھانے گھر آتا تھا۔ اُسے پرکاش کی مار اور گالیوں وغیرہ کی بابت کچھ بھی علم نہ تھا۔ پرکاش کی بات سُنکر اُسکا رنگ اُڑ گیا۔ . . . . . اور خود بخود اُسکے مُنہ سے نکل گیا۔ "تو کیا وہ ڈائن ہی بنے گی"۔ اور پھر دیئے کی پیشینگوئی یاد آگئی۔ آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ "ماں! پیاری ماں!! آ اور دیکھ تیری امانت پر کیسا ظلم ہو رہا ہے!!!

پرکاش نے روتے ہوئے کہا۔ "مت رو بھیّا۔ اب میں کبھی سبھدرا کو ماں نہیں کہوں گا۔

سبھدرا بھی دروازے کے پاس چھپی سب باتیں سُن رہی تھی۔ غصّے سے پاگل ہی تو ہوگئی۔ گیان کی موجودگی میں پرکاش کو کچھ کہنے کی اُسکی ہمّت نہ ہوئی۔ چپکے سے اوپر چوکے میں چلی گئی۔ گیان نے اُسکے سیڑھیوں پر چڑھنے کی آواز سُن لی۔ سمجھ گیا کہ اُسنے سب کچھ سُن لیا ہے۔ اور سوچا کہ اگر پرکاش کو گھر چھوڑ گیا تو وہ ضرور مارے گی۔ آنسو پونچھ کر کہنے لگا۔ چلو پرکاش۔ تمہیں ایک جگہ ضیافت میں لے چلیں۔ نئے کپڑے نکلوا کر پہن لو۔ ذرا جلدی کرو۔

پرکاش سبھدرا سے چابیوں کا گچھا لے آیا۔ اور کہنے لگا "سبھدرا کہتی ہے خود ہی نکال لو"

"اچھا میں کپڑے نکالتا ہوں۔ اور تم جا کر کہہ آؤ کہ آج ہم دونوں کے واسطے کھانا نہ بنائیے"

پرکاش جا کر کہہ آیا۔ گیان نے کپڑے نکالے اور پرکاش کو پہنا کر گھر سے باہر لے گیا۔ بچے کا بہلانا کونسی مشکل ہے۔ بورڈنگ ہاؤس میں جا کر گیان نے مٹھائی منگوائی اور کشن چند کے کمرہ میں بیٹھکر خود بھی کھائی اور پرکاش کو بھی کھلائی۔ بورڈنگ ہاؤس کے اور لڑکے آگئے۔ پرکاش کے گرد کھڑے ہوگئے۔ بھولے بھالے پھول سے بچہ کو دیکھکر کون خوش نہیں ہوتا۔ سبھی اُسے پیار کرنے لگے۔ پہلے تو کچھ دیر وہ شرماتا رہا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد گھل مل گیا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ اور ایک دفعہ پھر وہی بھلا پرکاش بنگیا۔ گیان کا دل خوشی کے مارے دھڑکنے لگا۔ پرکاش نے سمجھا۔ بس اب مار کے دن گئے۔ لیکن مار سے بچانے کیلئے نقلی ضیافت آخر کار ختم ہوگئی۔

اُس دن تو پرکاش مار سے بچ گیا۔ لیکن اُسکی ساری کسر دوسرے دن نکل گئی۔ مار کی تکلیف پرکاش کو بھگتنے پڑتی تھی۔ لیکن گیان کے دلپر ایک خاص اثر پڑتا تھا۔ وہ بھی اندر ہی اندر گھلتا جاتا تھا۔ بابوجی نے شادی کی تھی کہ گھر کی رونق بڑھے۔ لیکن اُلٹی گھر کی سب خوشی مفقود ہو گئی۔ دفتر سے آتے تو سبھدرا کا بشاش چہرہ دیکھنے کے بجائے۔ پرکاش کے خلاف شکائتیں سُننی پڑتیں۔ آخر سنتے سنتے اُنپر بھی اثر ہوا اور پرکاش کی گوشمالی اپنا فرض سمجھنے لگے۔

ماں کی مار۔ باپ کی جھڑکیاں۔ پھر بچے کی نشو و نما ہو تو خاک۔ پرکاش روز بروز سوکھتا رہا!

(۴)

گیان نے ایم۔ اے۔ پاس کر لیا مگر کوئی نوکری نہ ملی۔ بابو گنیش داس اور دوسرے رشتہ داروں نے بہت کوشش کی لیکن کوئی انتظام نہ ہوا۔ سرکاری نوکری گیان کو پسند نہ تھی۔ دوسرا کوئی کام نہ ملتا تھا۔ اسلئے وہ چھ سات ماہ بیکار ہی بیٹھا رہا۔

ایک دن ایک اخبار میں یہ اشتہار نظر پڑا۔

ایک ہفت سالہ لڑکے کے لئے اُستاد کی ضرورت ہے اعلیٰ تعلیم یافتہ کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ حسب لیاقت۔

ذیل کے پتہ پر درخواست آنا چاہیئے

سیٹھ گنگا پرشاد رئیس دریبہ کلان

(دھلی)

اشتہار پڑھکر گیان نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ دھلی چلکر قسمت آزمانی چاہیے۔ اسی دن اُسنے بابوجی سے ذکر کیا۔ پہلے تو وہ نہ مانے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اسکو کہیں تو کام کرنا ہی ہے۔ لاہور نہیں تو دھلی ہی سہی۔ آخر اُنھوں نے دھلی جانے کی اجازت دے دی۔

دوسرے دن گیان گاڑی میں سوار ہو کر دھلی جا پہونچا۔

وہاں ایک روٹی والے کی دوکان پر کھانے سے فارغ ہو کر سیٹھ گنگا پرشاد کا مکان ڈھونڈنے نکلا۔ سیٹھ صاحب دھلی کے نامی گرامی رئیس تھے۔ آسانی سے پتہ مل گیا۔ عالیشان حویلی کے بڑے پھاٹک میں سے گذر کر گیان اندر پہونچا۔ اور سیٹھ صاحب کو اطلاع کرائی۔ سیٹھ صاحب نے

فوراً اندر بلا لیا۔

سیٹھ صاحب کے پاس اب تک کئی امیدوار آچکے تھے۔ لیکن اُن میں سے آپ نے کسی کو بھی اپنے بیٹے کا اتالیق بننے کے قابل نہ سمجھا۔ کسی میں لیاقت کی کمی تھی۔ تو کسی میں شرافت کی۔ کوئی جسم کا کمزور تھا۔ تو کوئی شکل کا بھونڈا۔ گیان سے باتیں کرکے آپ بہت خوش ہوئے۔ اور بولے "بابو صاحب میں اپنے آپ کو نہایت ہی خوش نصیب سمجھوں گا۔ اگر آپ اندر کا اتالیق بننا منظور فرمائیں۔ میں فی الحال آپ کو ایک سو روپیہ ماہوار دے سکتا ہوں"

گیان نے جواب دیا "مجھے بسر و چشم منظور ہے"

"تو پھر آج سے ہی اندر کو اپنی حفاظت میں لے لیں۔ آپ ہی اُسکے محافظ ہونگے۔ اور آپ ہی اُسکے اتالیق۔ مجھے امید ہے کہ آپ اُسے خاص توجہ سے نیک راہ پر چلانے کی کوشش کریں گے"

تھوڑی دیر کے لئے وہ خاموش ہوگئے۔ پھر ایک لمبی سانس بھر کے بولے "بس۔ آج سے اندر آپکے سپرد ہے۔ اِسوقت اسکا دل کورے کاغذ کی مانند صاف ہے۔ اُسپر کسی قسم کا نشان نہیں۔ وہ بے لوث ہے۔ وہ دنیا کے حالات سے بیخبر ہے۔ آپ اُسے فرشتہ بنائیں یا شیطان۔ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ایک چھوٹے سے لڑکے کی پیٹھ پر تھپکی دیکر کہنے لگے۔

"اُٹھو بیٹا۔ یہ تمھارے گرو ہیں۔ پرنام کرو"

لڑکے نے اُٹھکر پرنام کیا۔ گیان نے کہا "جیتے رہو۔ آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ"

اندر بڑا ذہین تھا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ گیان نے اُسکے عادات و خصائل کو اچھی طرح دیکھکر سیٹھ صاحب سے کہا۔

"بڑا ہوکر آپ کا لڑکا خوب نام پیدا کریگا"

سیٹھ صاحب بڑے خوش ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ اندر کی قسمت گیان کے ہاتھ میں ہے۔ انکساری سے اُنھوں نے جواب دیا۔

"بابو جی۔ جیسا آپ بنائیں گے ویسا ہی ہو جائیگا"

سیٹھ صاحب کو اندر پر بڑا فخر تھا۔ گیان بھی اندر سے کچھ کم محبت نہ رکھتا تھا۔ ذہین۔ فرمانبردار شاگرد پر اُستاد کو فخر ہونا لازمی ہے۔ وہ اُسے خوب دل لگا کر پڑھاتا تھا۔ وہ بھی شوق سے پڑھتا تھا

گیان کے پڑھانے کا طریقہ نرالا تھا۔ ہندوستان کے سکولوں میں کتابوں پر زور دیا جاتا ہے، یہ اُسے بالکل پسند نہ تھا۔ زبانی پڑھانے کو وہ اچھا سمجھتا تھا۔ زبانی پڑھانے سے سوال وجواب کا خوب موقعہ مل سکتا ہے۔ اور کتابوں کو رٹنے میں تو فضول وقت ضائع جاتا ہے۔ وہی فہانت اور قوت لڑکوں کی جسمانی صحت اور دماغی تربیت میں مفید طور پر خرچ ہو سکتی ہے۔

گیان علی مشاہدہ پر بڑا زور دیتا تھا۔ جس چیز کو پڑھانا ہوتا۔ اُسکو سامنے رکھ لیتا۔ گائے پر سبق دینا ہوتا۔ تو گائے کے پاس کھڑے ہو کر۔ دریا کی بابت کچھ بتانا ہوتا۔ تو دریا پر جا کر۔ پڑھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ وہ سکول کے کمروں میں بند نہ تھا۔ تمام زمین اور آسمان اُنکے سامنے کھلے پڑے تھے۔

اس طرح اندر کو علم کا پکا غوطہ خور بنانے میں گیان مشغول ہو گیا۔

ایک دن اُستاد شاگرد دونوں باغ میں سیر کر رہے تھے۔ خوبصورت پھولوں کو دیکھکر اندر بہت خوش ہوا۔ اُسنے اُنکے نام گیان سے پوچھے۔ اُس نے بتائے۔ تھوڑی دیر بعد اندر اپنی دوربین سے دور دور کی چیزیں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

گیان کو پرکاش یاد آگیا۔ اُسی میں محو ہو گیا۔

"بدقسمت پرکاش! اُس چکی میں پس رہا ہے۔ جسکا ایک پاٹ سگا باپ اور دوسرا پاٹ سوتیلی ماں ہے۔ میں تو گھر سے چلا آیا۔ لیکن پرکاش کا کیا حال ہو گا؟ چکی کے پاٹوں سے کب تک بچا رہیگا؟ . . . کاش! اُسے ماں کی جدائی نہ دیکھنی پڑتی۔

اُتنے میں اندر چلا کر بولا۔ گرو جی۔ گرو جی۔ وہ دیکھو سامنے آم پر کوئل کے گھونسلے میں کوّے کا بچہ"

گیان نے اندر سے دوربین لیکر دیکھا۔ آم پر کے گھونسلے میں ایک کوئل ایک چھوٹے سے کوّے کے بچہ کو چونچ سے چونگا کھلا رہی تھی۔ گیان نے سوچا۔ بچہ پرایا ہے۔ لیکن کوئل کے دل میں اُسکے لئے بڑا پیار ہے۔ سگی نہیں تو سوتیلی ہی سہی۔ آخر تو ماں ہے۔ لیکن افسوس۔ نسل انسانی میں ایسا نہیں۔ اُن میں سوتیلی ماں کے معنی ڈائن بھی ہو سکتے ہیں۔ آہ! ماں کے لفظ کی کیسی توہین ہو رہی ہے"

گیان کا دکھی دل اور بھی دکھی ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ دوربین آنکھوں سے ہٹا کر بھرائی ہوئی آواز سے بولے۔

"اندر! تم کیسے خوش نصیب ہو کہ تمھیں ماں کی محبت میسّر ہے۔"

اندر نے تعجب سے پوچھا "خوش نصیب"؟ ہمیں خوش نصیبی کون سی ہے؟

"کیا دنیا میں کوئی ایسا بھی بچّہ ہے۔ جسے ماں کی محبت نصیب نہ ہو؟"

"ہاں میرا ہی ایک چھوٹا بھائی ہے۔"

"آپ کا چھوٹا بھائی اُسکی عمر کتنی ہے؟"

"تم سے ایک سال چھوٹا ہے۔"

"ہیں! کیا پیاری ماں کی۔ پیاری پیاری لوریاں سُننی اُسکے نصیب میں نہیں؟ کیا اُسے کوئی پیار سے گودی میں نہیں بٹھاتا ہے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر آپ کے بابوجی نے اُسے اور ماں کیوں نہ لادی؟"

"لا تو دی۔ لیکن وہ ڈائن نکلی۔"

(۵)

پرکاش کی حالت اب آگے سے بھی بری ہوگئی۔ کھانے کو جھوٹے ٹکڑے۔ پہننے کو پھٹے پُرانے چیتھڑے۔ بابوجی اُسے دیکھ کر بہت کڑھتے۔ سمجھدار اسے کہتے "دیکھو لڑکا چھوٹا ہے۔ اسکی خوراک اور پوشاک کا اچھی طرح دھیان رکھنا چاہیئے۔ اور نہیں تو کم از کم اپنی عزت کا ہی خیال کرو۔ پھٹے پُرانے چیتھڑوں میں بھنگی کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔"

لیکن وہ صرف اتنا جواب دیتی کہ "میں کیا کروں؟ پہنتا پیچھے ہے۔ پھاڑ پہلے دیتا ہے۔ اب اتنے کپڑے کہاں سے لاؤں۔ آپ ہی تھان لے آئیں میں اور جوڑے سی دوں گی۔"

تھان آتا لیکن پرکاش کے جسم پر پھر بھی وہی چیتھڑے رہتے۔ ماں کی گود کیا چھنی۔ پرکاش عذاب میں پھنس گیا!

چور کا دل کتنا؟ گلی میں سر اونچا کر کے نکلنے کی بابوجی میں ہمّت نہ رہی۔ انھیں ہر شخص کی نگاہ یہی کہتی معلوم ہوتی تھی کہ دیکھو ایک لڑکے کو تو دھلی نکال دیا۔ اب دوسرے کے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے۔ دفتر سے آتے۔ چپکے سے سر جھکائے گھر میں گھس جاتے۔ وہاں پژمردہ۔ زرد چہرہ چیتھڑے

لگے پرکاش کو دیکھکر اُن کا دل باش باش ہو جاتا - پاس ہی ریشم و مخمل میں ملبوس حسن و جوانی کی ملکہ سبھدرا - ناز و انداز سے اونکے دل کو اپنا کھلونا بنانے کے لئے موجود ہوتی - لیکن اُن کا دل اب اُس جال میں پھنسنے کی خواہش نہ رکھتا تھا - غم واندوہ نے اُسپر اپنا قبضہ جما لیا تھا - دُنیا میں حسن و جوانی ہی سب کچھ نہیں - اور بھی بہت سی باتیں ہیں !

وہ اب ہر وقت بے چین رہنے لگے - ایک دھندلا سا خیال اُنکے دماغ میں پیدا ہو گیا - اُس خیال کا سایہ ہر وقت اُنکی طبیعت پر چھایا رہتا تھا - لیکن اُنکی سمجھ میں نہ آتا کہ تکلیف کیوں ہے ؟ کیا خیال ستا رہا ہے ؟

آخر رفتہ رفتہ اُنھیں اپنی بے چینی کا احساس ہونے لگا - بے اختیار یاس و حسرت بھرے لہجہ میں اُنکے منہ سے نکل گیا "گھر کا گھر بگڑا - جگ ہنسائی علیحدہ - کاش میں دوسری شادی نہ کرتا - بیاہ کے دو سال بعد تک سبھدرا ہی اُنکی خوشیوں کا مرکز تھی - اُسی کے سبب سے اُنھیں تمام جہان دلپسند نظر آتا تھا - وہ اُسکے غلام بے دام تھے - اُسکی خواہشات و فرمائشات پوری کرنے میں اُنھیں خاص حظ حاصل ہوتا تھا - لیکن گیان کے دھل جانے کے بعد اُنکا دھیان اکیلی سبھدرا ہی کی طرف نہ رہا - بلکہ اُنکے دل میں دنیا کی اور فکریں بھی آگئیں -

اس نئے خیال کے پیدا ہونے پر سبھدرا سے بے التفاتی بڑھ گئی - غلامی کی زنجیروں کو اُنھوں نے توڑ دیا - اپنی عقل سے کام لینے لگے -

جنگل میں خود رو پودے اُگتے ہیں - اُنھیں کی طرح پرکاش بھی چوٹھا کھا کر اور پٹا پس کر چھ برس کا ہو گیا - لیکن اگر ایک چھوٹے پودے کے گرد اور بڑے بڑے درخت اُسکی روشنی اور ہوا چھیننے والے ہوں - تو اُسکی زندگی مشکوک ہو جاتی ہے - وہی پرکاش کے ساتھ ہوا -

بابوجی پرکاش کی بری حالت زیادہ دیر نہ دیکھ سکے - اُنھوں نے اُسکی خوراک اور پوشاک کا سب انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا - درزی سے چند جوڑے کپڑوں کے سلوائے - صبح اُٹھ کر خود نہلا دھلا کر کپڑے پہناتے - اور پھر اپنے سامنے ناشتہ کھلا کر سکول بھیجتے -

لیکن جس پودے کی جڑیں خراب ہو جائیں - وہ پانی کے بجائے دودھ سے سینچا جائے تو بھی بارآور نہیں ہو سکتا - سکول گھر سے زرا دور تھا - بارہ بجے چھٹی ہوتی تھی - دھوپ میں گھر آنا پڑتا تھا -

کمزور جسم جولائی کی کڑکتی دھوپ برداشت نہ کر سکا۔ پرکاش کو ایک دن بخار آگیا۔
زور کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ پرکاش مشکل سے گھر پہونچا۔ بابوجی اُسوقت دفتر گئے ہوئے تھے سبھدرا اپنے کمرے میں بیٹھی "آنکھ کی کرکری" پڑھ رہی تھی۔ اُسکے آنے کی آہٹ پاکر وہیں سے بولی چوکے میں روٹی پڑی ہے۔ جاکے کھالے"۔ پرکاش نے اپنے بخار کی بابت اُسے کچھ نہ بتایا۔ اُسے روٹی کھانے کا ہوش نہ تھا۔ بغیر کھانا کھائے دالان میں زمین ہی پر ٹاٹ بچھا کر لیٹ گیا۔
سارا دن وہیں بیہوش پڑا رہا۔ شام کو بابوجی دفتر سے آئے۔ اُنکو حقہ پینے کی عادت نہ تھی۔ اِسکے علاوہ اور بھی کوئی شغل نہ تھا۔ روزانہ پرکاش پاس آبیٹھتا تھا۔ اور سکول میں پڑھا ہوا سبق سناتا تھا۔ لیکن آج وہ بھی نہ آیا۔ سبھدرا اوپر چوکے میں کھانا پکا رہی تھی۔ کچھ دیر پرکاش کا انتظار کرکے بابوجی اوپر گئے۔ اور سبھدرا سے پوچھنے لگے "پرکاش کہاں گیا؟
وہ ترکاری کاٹ رہی تھی۔ ہاتھ سے چاقو زمین پر رکھکر بولی۔ "سکول سے آتے ہی پتہ نہیں کدھر مرگیا۔ میں خود پکارتے پکارتے تھک گئی ہوں۔ سبزی بھی سبنتی کے بیٹے سے منگوائی ہے"
بابوجی نے یہ سمجھکر کہ کسی لڑکے کے گھر کھیلنے چلا گیا ہوگا۔ چپ ہو گئے۔ اور نیچے اُتر آئے۔ باغ کی سیر کا ارادہ ہوا۔ دالان میں اُنکی چھڑی پڑی ہوئی تھی۔ اُسے لینے وہاں گئے۔ زمین پر لیٹے ہوئے پرکاش کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بولے "ارے یہاں گرمی میں پڑا ہے۔ اُٹھ اوپر ہوا میں جاکر سو"
لیکن وہ بیہوش تھا۔ اُسنے کچھ نہ سُنا۔ بابوجی نے جھک کر شانہ ہلایا۔ اُسکا جسم اُنھیں کچھ گرم معلوم ہوا۔ پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہی بولے۔ "اخوہ! بڑے زور کا بخار ہے" سبھدرا کو آواز دی "یہاں آنا۔ زرا چارپائی پر بستر تو کردو" سبھدرا نے آکر چپکے سے بستر لگا دیا۔ بابوجی نے پرکاش کو اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ اور کہنے لگے "بڑے زور کا بخار ہے"
سبھدرا لاپرواہی سے بولی "اچھا!" اور تھوڑی دیر خاموش کھڑی رہکر پھر اوپر چوکے میں چلی گئی۔
بابوجی چارپائی کے قریب ایک کرسی کھینچکر بیٹھ گئے۔
بیٹھے بیٹھے لونج گئے۔ سبھدرا اوپر چوکے میں بیٹھی اُکتا گئی۔ بابوجی کا کھانا وہیں لے آئی۔ انہوں نے بادلِ ناخواستہ چند لقمے کھائے۔ اور پھر وہیں ایک چارپائی بچھا کر لیٹنے کی تیاری کرنے لگے۔
سبھدرا نیک ماں نہ تھی لیکن نیک بیوی ضرور تھی۔ وہ دل سے اپنے شوہر کی محبت کرتی تھی۔

پرے بیٹھی ہے۔ چھوڑ دو۔ مجھے اُسکے پاس جانے دو۔"

سبھدرا کے دل پر چوٹ لگی۔ بیاہ کے بعد کی زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ اُسنے سوچا۔ جب پہلے پہل یہاں آئی تھی۔ یہ کتنا خوبصورت تھا! لیکن میں نے اسکی خوبصورتی، اسکے بھولے پن کی قدر۔ نہ کی۔ یہ مجھے ماں جی۔ ماں جی۔ کہتا رہا۔ لیکن میں اسکی ماں نہ بنی۔ اسکو بہت تکلیف پہونچائی۔ اسے بہت ستایا۔ ۔ ۔ اب ۔ ۔ ۔ کیا یہ نہ بچے گا؟ کیا اسیطرح دنیا سے نامراد چلا جائیگا؟ ۔ ۔ ۔ اگر ایسا ہوا تو اسکی ہتیا میرے ہی سر ہوگی۔ میں ہی ڈائن کہلاؤنگی۔

اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

پرکاش پھر چلایا "چھوڑ دو! تم میری ماں نہیں ہو"

روتی ہوئی سبھدرا نے اُسے چمکار کر کہا "چُپ میرے لال! آج سے میں تیری ماں بنتی ہوں"

اتنے میں بابوجی ڈاکٹر کو لیکر آگئے۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح دیکھکر کہا "کوئی ڈر کی بات نہیں۔ معمولی بخار کا زور ہے۔ برف منگوا کر اسکے سر پر لگائیے۔ بخار کم ہو جائیگا اور ساتھ ہی بے چینی بھی دور ہو جائیگی۔ نسخہ صبح لکھ دوں گا۔ اسوقت دوا کی کوئی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر اپنی فیس لیکر چلا گیا۔ بابوجی برف لے آئے۔ اور پرکاش کے سر پر رکھی۔ پندرہ بیس منٹ میں بخار کا زور کم ہوا۔ بے چینی دور ہوگئی۔ پرکاش آرام سے سو گیا۔ بابوجی نے باقی برف کمبل میں لپیٹ کر پرے رکھدی۔ سبھدرا بڑے غور سے پرکاش کے چہرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُسنے نیچی نظر کئے ہوئے بابوجی سے کہا "اب یہ سو گیا ہے۔ آپ بھی جاکر سو رہیں۔ میں یہاں بیٹھی ہوں"

بابوجی کو نیند بہت آرہی تھی۔ اگر مجبوراً بیٹھنا پڑتا تو دوسری بات تھی۔ لیکن جب سبھدرا بیٹھنے کو تیار تھی۔ اور ساتھ ہی پرکاش بھی آرام سے سو گیا تھا۔ تو اُن کے اوپر جانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اُنھوں نے کہا "اچھا۔ لیکن تمھیں بھی تو نیند آئی ہوگی؟"

"نہیں میں دن کو سولوں گی۔ آپ جاکر سوئیں"

بابوجی اوپر چلے گئے۔ وہ سوچنے لگے۔ کیا سبھدرا میری خاطر نیچے بیٹھی ہے۔ یا پرکاش کی تکلیف سے متاثر ہوکر؟ خیر کوئی سبب ہو۔ بہرحال وہ نیچے گرمی میں بیٹھی ہے۔ میری خاطر بھی ہو۔ تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُسکا دل محبت سے خالی نہیں"

اُن کا دل اس نئی دریافت پر بڑا خوش ہوا۔ بستر پر لیٹے رہے۔ لیکن خوشی سے آئی ہوئی نیند بھی دور بھاگ گئی۔ چارپائی کے قریب ہی چھت میں ایک روشندان بنا ہوا تھا۔ اُس روشندان میں سے نچلا دالان نہایت اچھی طرح سے نظر آتا تھا۔ آپ اُٹھ کر اُس میں سے دیکھنے لگے۔ دیکھا سبھدرا پرکاش کے سرہانے گردن جھکائے بیٹھی ہے۔ اور پرکاش کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اُنھوں نے خیال کیا "شاید بیکار سمجھ کر وقت کاٹ رہی ... لیکن نہیں۔ اگر بیکار سمجھتی تو کھڑکی میں بیٹھکر وقت کاٹتی۔ اس طرح پرکاش کے سرہانے نہ بیٹھتی ... اچھا اگر بیکار نہیں سمجھتی۔ تو کیا پھر اسکا دل پرکاش کی تکلیف سے متاثر ہوا ہے؟ کیا ڈائن سبھدرا ماں بن گئی ہے؟

اطمینان کرنے کے لئے۔ وہاں سے اُٹھکر پھر نیچے دالان میں چلے گئے۔ اور سبھدرا سے پوچھا "کیوں اس طرح بیٹھی ہو۔

اُسنے سر اُونچا نہ کیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی "کچھ نہیں"

بابوجی نے دیکھا۔ وہ رو رہی ہے۔ مسرت کی ایک لہر برقی رَو کی طرح جسم میں سے گذر گئی خوشی سے آپ اچھی طرح سے بول بھی نہیں سکے۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہنے لگے۔ گھبراؤ نہیں اچھا ہو جائیگا۔ سبھدرا نے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔ لیکن وہ رُکے نہیں۔ لگاتار بہتے رہے۔ بابوجی نے دل میں کہا۔ رو لینے دو۔ آنسو رہی سہی کدورت کو بھی دھو دیں گے" اور وہ پھر اوپر چلے گئے۔

سبھدرا ساری رات اُسی طرح بیٹھی رہی۔ پرکاش آرام سے سوتا رہا۔ بالکل ہلا جلا نہیں۔ دوسرے دن سویرے بابوجی ڈاکٹر سے نسخہ لکھوا کر دوا لے آئے۔ سبھدرا کو پلانے کی ترکیب بتا دی۔ اور پھر کھانا کھا کر دفتر چلے گئے۔

دوپہر کو پرکاش کا بخار پھر زیادہ ہو گیا۔ رات کو پہلی رات کی طرح ہی بے چینی بڑھ گئی۔ سبھدرا پھر ساری رات جاگتی رہی۔

بابوجی نے کہا "اس طرح کب تک جاگتی رہوگی۔ دو راتیں جاگتے ہو گئیں۔ کہو تو کوئی دوا تجویز کر دیں؟ اسکی بھوجی کو بلا لاؤں؟"

اُسنے جواب دیا "آپ کوئی فکر نہ کریں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ کسی کو بلوانے کی کوئی ضرورت

روز صبح کو حرارت زرا کم ہوتی تھی۔ لیکن دوپہر کو بخار زیادہ ہو جاتا تھا۔ ہر رات قہر کی رات ہوتی تھی۔ پرکاش بے چینی سے تڑپتا تھا۔ چیختا تھا۔ چلاتا تھا۔ سبھدرا رات دن اُسکے پاس بیٹھی رہتی۔ جب زرا تھک جاتی۔ اُسی چارپائی پر دبک کر لیٹ رہتی۔ کھانا ہوٹل سے آجاتا تھا۔

اسی طرح پانچ چھ روز گزر گئے۔ ڈاکٹر نے کہا "بخار میعادی ہے۔ میعاد کے بعد اُترے گا" سبھدرا کو سخت صدمہ پہونچا۔ اُسنے پرماتما سے پرارتھنا کی "ہے ناتھ۔ دیا کرو!"

بیس دن اُسی طرح بخار چڑھا رہا۔ اکیسویں رات کو یک لخت حرارت کم ہو گئی۔ جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ پرکاش سُست ہو گیا۔ بابو جی گھبرا گئے۔ سبھدرا کے ہاتھ پانوں پھول گئے۔ گھبراہٹ سے بولی "ہے رام! ہے رام!"

اتنے میں بابو جی کو یاد آگیا کہ ڈاکٹر نے ایک شیشی دے رکھی ہے کہ اگر حرارت یکدم کم ہو جائے تو اسکا ایک چمچہ پلا دینا۔ اور جسم کو باہر کی گرمی سے حرارت پہونچانا۔ انھوں نے فوراً شیشی کھولی اور برانڈی کا ایک چمچہ پرکاش کے حلق سے اُتارا۔ اور انگیٹھی میں آگ جلا کر چارپائی کے نزدیک کر دی۔ جسم کی حرارت بڑھنی شروع ہوئی۔ پرکاش ہوش میں آگیا۔

اور پھر بخار اُترا ہی رہا۔ لیکن اکیس دن کا لگاتار بخار معمولی بات نہیں۔ پرکاش سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق مقوی ادویات کھا کھا کر پرکاش ایک دفعہ پھر اپنی پہلی حالت پر آگیا۔ سبھدرا کی محنت پھل لائی۔

اب سبھدرا پرکاش سے نفرت نہ کرتی تھی۔ اپنی کوکھ کا بیٹا سمجھنے لگی۔ بابو جی اس تبدیلی کو دیکھکر بہت خوش ہوتے تھے۔

پرکاش کی بیماری گھر پر رحمت ثابت ہوئی۔ گھر پُر رونق بن گیا۔ پرکاش! سبھدرا! بابو جی سبھی خوش تھے۔

کبھی کبھی گیان بھی ملنے آجاتا تھا۔

گوپال کرشن یاس

تنقید کتب

سلسلہ معارف ملت، جذبات فطرت، مناظر قدرت

مرتبہ محمد الیاس برنی ال ال بی معلم معاشیات حیدرآباد دکن

یہ سلسلہ منتخبات اردو شاعری کے خوشرنگ پھولون کا ایک چمن زار ہے جسمین ہر قسم کے پھول موجود ہین۔ پھر لطف یہ کہ ہر پھول کو اُسی کی شاخ مین نمایان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انتخابی حیثیت سے یہ کام بظاہر آسان نظر آتا ہو مگر حقیقتاً مشکل ہو پھولون کا چن لینا زیادہ مشکل نہین مگر انھین قرینے سے سجانا، اُنکے لیے موقع و محل کا انتخاب کرنا، اُنکے بہار آفرین نظارون کے لیے ایک باقاعدہ جلوہ گاہ بنانا۔ ایک تجربہ کار گلچین کے ذوق سلیم پر منحصر ہے۔

جناب الیاس برنی نے ان گلدستون کی ترتیب مین اپنی نظر انتخاب اور ذوق ادب کا پورا پورا ثبوت دیا ہے، اور اس سلسلۂ انتخاب کو ایسے اچھے عنوانون مین تقسیم کیا ہے کہ خود شعرا کے کلام کی تین قسمین ہوگئی ہین۔ مناظر قدرت۔ جذبات فطرت، معارف ملت۔

تخیلات شاعرانہ کے سلسلۂ لامتناہی کی حدبندی اس سے بہتر نہین ہوسکتی۔ شاعری ہی پر کچھ منحصر نہین جتنے خیال انسان کے دل مین گزرتے ہین وہ انھین عنوانون کے تحت مین آجاتے ہین۔ حضرت مؤلف نے سلسلۂ انتخاب کی ان تین کڑیون کا الگ الگ سلسلہ قائم کیا ہے۔ پھر ہر سلسلہ کو مختلف کڑیون پر تقسیم کر دیا ہے، اسطرح ہر کڑی بجاے خود ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے یعنی ہر عنوان ایک مستقل کتاب کی صورت مین ظاہر ہوا اور ہر کتاب مختلف عنوانات اور اشعار کا مجموعہ بن گئی۔

ابتک اس سلسلۂ انتخاب کی نو جلدین شایع ہوچکی ہین جنمین شعرے ماضی و حال کی بہترین نظمون اور غزلون کا انتخاب موجود ہے، ہر حصے کے شروع مین حضرت مؤلف کی ایک مشترکہ تمہید ہے، اور

آخر مین منتخب شعرا کے نام مع سکونت و تاریخ پیدائش و وفات درج ہین، جن شعرا کی سکونت، پیدائش یا وفات کی تاریخ معلوم نہ تھی، اُنکے نام کے سامنے خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے لیکن تعجب ہے کہ دوسرے اور تیسرے حصہ کی اشاعت مین بھی یہ کمی پوری نہ ہوئی، بہرحال اس حصہ کی ترتیب و تصحیح مین پوری توجہ کی ضرورت ہے، اس سلسلہ کا ہر حصہ ایک ہی تمہید سے شروع ہوتا ہے۔ شاید حضرت مصنف کا یہ خیال ہو کہ سلسلہ منتخبات ایک ہے اسلیے ایک مقدمہ یا تمہید کافی ہے، لیکن ہر حصۂ کتاب بجاے خود ایک کتاب ہے تو ضرورت تھی کہ تمہیدین بھی جدا گانہ لکھی جاتین اور انمین کلام مندرجہ کے متعلق مختصر سی تنقید بھی ہوتی۔ آغاز تمہید مین مؤلف صاحب کا یہ فقرہ کہ "اُردو شاعری پر عجیب اُفتاد پڑی" بجاے خود عجیب و غریب ہے، اگر یہ دعا ہے کہ اُردو شاعری کی پستی و بیکسی کا اظہار کیا جائے تو "اُردو شاعری پر عجیب اُفتاد پڑی" لکھنا چاہیے تھا اور اگر مبنیا و شاعری کی طرف اشارہ ہے تو مطلب ادا نہین ہوتا۔

حقیقتاً یہ سلسلہ جلوہ گاہ شاعری ہے۔ جذبات فطرت، معارف ملت، اور مناظر قدرت کے بیشمار جواہر اسکے دامن مین پوشیدہ ہین، ہم حضرت مؤلف کو اس بینظیر سلسلہ کی تالیف پر مبارکباد پیش کرتے ہین لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی عرض کرنا ضروری سمجھتے ہین کہ آیندہ انتخاب اور ترتیب مین ذرا اور محنت سے کام لیا جائے تو یہ نقائص بھی دور ہو سکتے ہین جو موجودہ سلسلہ مین خال خال نظر آتے ہین۔ مثلاً معارف ملت حصہ اول مین میر کی وہ غزل جسکا مطلع غالباً یہ ہے

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

بالکل مقررہ اصول کے خلاف ہے یا غالب کا یہ شعر

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہان　　دیکھنا ان بستیون کو تم کہ ویران ہو گئین

یہ ہم مانتے ہین کہ اس قسم کے اشعار گریہ کے تحت مین لکھے گئے ہین۔ لیکن کیا انکا معارف ملت سے بھی کوئی تعلق ہے۔ معارف ملت کی شرح خود حضرت مؤلف یون بیان فرماتے ہین "حمد و نعت اور اخلاقی و قومی نظمون کا مجموعہ"، غور کیجیے یہ اشعار کہان تک اس معیار پر پورے اُترتے ہین اسی طرح جذبات فطرت کے سلسلے مین بعض ایسی نظمین نظر آتی ہین جو معارف ملت سے متعلق ہین مثلاً ترانۂ ہند اور گلزار وطن وغیرہ کیونکہ انکا تعلق ملک اور قوم سے ہے، جذبات فطرت انمین ضرور موجود ہین لیکن اسطرح تو حمد و نعت اور قومی نظمون مین بھی جذبات فطرت سے مدد آنہو کی اجازت

حالانکہ انکا تعلق معارف ملت سے ہے، ہماری رائے ہے کہ انتخاب مین انھین نظمون کو جگہ دینا چاہیے جنکا تعلق اصل عنوان سے ہو۔

یہ طریقہ انتخاب بھی زیادہ پسندیدہ نہین کہ غزل کے مختلف اشعار، مختلف عنوان کے سلسلہ مین پیش کردیے جائین۔ کیونکہ پھر انتخاب کی کوئی حد نہ قائم رہ سکے گی۔ اور ہر شاعر کا دیوان اس سلسلہ کا جزو اعظم بن جائیگا، غالب و میر ہی پر کیا منحصر ہے کسی شاعر کا کوئی شعر بھی ان عنوانات کی حدود سے باہر نہ ملے گا، حضرت مولف معاف فرمائینگے کہ ہم (بقول مؤلف) "نئی جدت گری" اور آزادی کی داد نہین دیسکتے"۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلۂ انتخاب کو مسلسل نظم یا پوری غزل تک محدود رکھنا چاہیے۔ ورنہ ایک ایک اور دو دو شعر اگر غزل سے انتخاب کرلیے گئے تو غیر معمولی طوالت کے علاوہ کوئی امتیاز خاص بھی نہ قائم رہ سکے گا۔

حضرت مؤلف کو تو اُن حضرات کا ضرور ممنون ہونا چاہیے جن لوگون نے ترتیب و تالیف مین مدد دی ہے، لیکن اظہار شکریہ کا یہ طریقہ مناسب نہین کہ ہر نظم کے نیچے یہ لکھدیا جائے کہ فلان صاحب نے اسکی تصحیح کی ہے۔ مثلاً جذبات فطرت حصہ سوم کے نیچے صفحہ ۱۰۱ پر محمدی بیگم صاحبہ مرحومہ کی نظم کے نیچے لکھا ہے، بعد نظر ثانی از سید محمد ہادی مچھلی شہری" اول تو حضرت مولف یا مددگاران مولف کو تحریف یا اصلاح کا حق ہی حاصل نہین پھر اگر کچھ ادبی غلطیان ایسی تھین جنکی تصحیح ضروری تھی تو اعلان تصحیح کی کیا ضرورت تھی۔ کیا جناب مؤلف یہ وثوق کے ساتھ کہ سکتے ہین کہ سلسلہ انتخاب مین اب ایسی نظمین موجود نہین جو غلطیون سے پاک نہون اور جنمین اصلاح کی ضرورت نہ ہو۔ اگر قابل اصلاح نظمین موجود ہین تو پھر کیا وجہ ہے کہ صرف محمدی بیگم صاحبہ کی نظم نشانۂ اصلاح بنائی جاتی ہے اور ایک دوست کی شان اُستادی کے لیے اعلان بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اس انتخاب مین جناب داغ کے اشعار بہت کم نظر آتے ہین، صرف معارف ملت حصۂ اول مین اُنکے کلام کا کچھ انتخاب درج ہے، جناب داغ کا مطمح نظر، جذبات فطرت تھا نہ کہ معارف ملت لیکن جذبات فطرت کے سلسلہ مین اُنکا کوئی شعر نظر نہین آتا۔ حالانکہ مولف کی "جدت گری" اور آزادی کی نظر سے اگر داغ مرحوم کے کلام کا انتخاب کیا جائے تو جذبات فطرت کی ایک جلد مرتب ہوسکتی ہے۔

آخر میں ہم جناب مؤلف کی خدمت میں ایک مرتبہ اور اس تالیف لطیف کی مبارکباد پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ اس مفید سلسلہ کو جاری رکھ سکیں۔

کاغذ، کتابت وطباعت کے لحاظ سے بھی یہ سلسلہ انتخاب قابل قدر ہے۔ قیمت فی جلد عہ
ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدیٰ خان شروانی علیگڑھ۔ اعظمی

بلدان (ہندی)

مترجمہ شری یت گنیش شنکر ودیارتھی

کانپور کی خاک پاک سے نشو ونما پاکر سیاسی اُفق پر جو ہستیاں روشن ستارہ بنکر وقتاً فوقتاً چمکی ہیں اُنمیں سری یت گنیش شنکر ودیارتھی اڈیٹر پرتاب کا نام بہت منور ہے۔ آپنے اخبار پرتاب کے ذریعہ ملک وقوم کے اندر بیداری کی ایک پُرجوش لہر پیدا کردی ہے اور مختلف تصنیف وتالیف کے ذریعہ آپنے ہندی لیٹریچر پر احسانات عظیم کیے ہیں۔

ہم اسوقت آپ کی تصنیفات پر سرسری نظر ڈال کر یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ آپنے پرتاب پستک مالا کی تالیفات وتصنیفات کا ایک نیا سلسلہ قائم کرکے ہندی لٹریچر کا دامن بیش بہا جواہر پارون سے بھر دیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یعنی فرانس کی مشہور لیڈی جون آف یارک کی لائف نہایت مقبول ہوچکی ہے۔ اسوقت ہم آپ کی تازہ تالیف "بلدان" سے ناظرین کو روشناس کرانا چاہتے ہیں یہ کتاب مشہور نامور فرانسیسی مصنف وکٹر ہوگو کے ایک مشہور ناول نائنٹی تھرد کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے شروع میں انقلاب فرانس کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس سے فرانس کی انقلابی حالت پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً انقلاب کی سختیون کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ

ساٹھ ہزار دلدّیر ملک کی حفاظت کے لیے بھرتی کیے گئے۔ وہ قیدی جو ملک کے لیے ذرا بھی نقصان دہ ثابت ہوتے تلوار کے گھاٹ اُتار دیے گئے اور چارون کے اندر صرف پیرس میں چودہ سو آدمیون کے سر جسم سے علیحدہ کردیے گئے۔

اسکے بعد جمہور کو پورے حقوق حاصل ہوجانے اور ظالم سے چھٹکارا پا جانے اور جمہوری سلطنت قائم ہوجانے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

ایک سال کے اندر ملکی غداری کے نام پر قریب سترہ ہزار مردون اور عورتون کے سر کاٹے گئے۔ دوسرے طریقون سے کسقدر آدمی مرے۔ کتنے جیل خانون مین سڑکر ختم ہوئے اور گولی سے مار دیے گئے۔ اسکا کوئی حساب نہین۔ لاکھون آدمی ملک چھوڑکر بھاگ گئے اور انکی جائدادین ضبط ہوگئین۔ ملک کو چھوڑکر بھاگ جانیوالے ملک مین واپس آنے پر موت کی سزا کے مستحق قرار دیے گئے اور انکے جو عزیز اور دوست ملک مین رہ گئے تھے انھین صرف اسی وجہ سے وقتاً فوقتاً طرح طرح کی تکلیفین اٹھانا پڑین

جمہوری ایثار اور قربانی اور عملی ہمدردی کے متعلق دیباچہ مین لکھا ہے کہ

"غریب لوگ سڑک پر برہنہ پا چلا کرتے مگر کبھی کبھی یہان تک دیکھا جاتا کہ وہ ٹھیلے پر جوتہ فروخت کرنیوالے کا ٹھیلہ روک لیتے۔ اور چندہ کرکے جوتون کے بہت سے جوڑے خرید ڈالتے اور پھر فرانس کی جمہوری سبھا کے پاس اُن جوڑون کو اسلیے بھیجدیتے کہ ملک کے لیے لڑنے والے سپاہیون کو جوتے دیدیے جائین"

انقلاب مصائب وعوام کی روش اور انکی ایمانداری اور سچائی اور ملکی جدوجہد کی حمایت وہمدردی اور جدید گورنمنٹ کی قدردانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قومی پنچایت کا حکم تھا کہ ہر ایک آدمی کو دسوین دن آدھ سیر گوشت ملے۔ گوشت کی کمی تھی۔ گوشت والون کی دوکان پر خریدارون کا مجمع رہتا۔ آخر کو یہ حالت ہوگئی کہ لوگ رسی کو پکڑکر ایک لائن مین کھڑے ہوجاتے اور جب سب سے آگے کا آدمی گوشت لے چکتا تو اُسکے پیچھے کا آدمی لینے کے لیے آگے بڑھتا۔ اکثر یہ لائنین بہت لمبی ہوتین اور دوکان سے بہت دور کی گلیون تک نکل جاتین۔ روٹیون کی دوکان پر بھی یہی حالت رہتی تھی۔ اکثر عورتون کو روٹیان حاصل کرنے کے لیے بڑی ہمت کے ساتھ رات بھر دوکان کے سامنے کھڑا رہنا پڑتا۔ چوریان بہت کم ہوتین۔ مفلسی کی وجہ سے لوگون کو بہت تکلیف تھی تو بھی انھین بیحد ایمانداری تھی۔ ننگے پیرون گھومتے، بھوکے رہتے، لیکن جوہری دوکان کے پاس سے جب نکلتے تو آنکھین نیچی کرکے نکلتے"

ریاچہ کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ جمہوری فوج کو جنگل مین ایک بیکس عورت اور تین غریب بچے ملے سردار فوج کو اُنپر ترس آیا اور اُنکی پرورش کا بار اپنے ذمہ لے لیا۔

اتفاقاً ایک گانون مین شاہ پرستون اور جمہوریت پسندون کا تصادم ہوا۔ جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے، آخرکار جمہوری فوج کو شکست ہوئی۔ عورت زخمی ہوکر بیہوش ہوگئی۔ لڑکے فتحمند شاہ پرستون کے قیدی بن گئے اور اسطرح ماں بیٹے ایک مدت کے لیے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

شاہ پرستون کے جس قلعے مین یہ لڑکے قید تھے اُسپر جمہوریت پسندون نے حملہ کیا، شاہ پرستون کو شکست ہوئی اور قلعے مین آگ لگ گئی۔ شاہ پرستون کا سردار اپنی بقیۃ السیف فوج کے ساتھ بھاگ نکلا اتفاقاً اُسنے اُسی عورت کی گریہ وزاری کی آواز سُنی، جو اپنے بچون کی تلاش مین یہانتک پہونچ گئی تھی۔ سردار قلعہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اسی بیکس کے لڑکے ہین جو اس جلتے ہوے قلعے کے ایک بُرج مین قید ہین تو وہ ترس کھاکر دوبارہ قلعہ مین واپس آیا اور لڑکون کو رہا کرنے مین خود پنجۂ دشمن مین گرفتار ہوگیا، جمہوری فوج کا سردار شاہ پرست فوج کے سردار کی رحمدلی سے اسقدر متاثر ہوا کہ اُسنے اسکو رہا کردیا اور اُسکے بجاے خود قیدی بن گیا۔ چونکہ بادشاہ پرست سردار کو سزاے موت کا حکم دیا جاچکا تھا اسلیے وہی سزا اُس رحمدل افسر کو بھگتنی پڑی

غرض پوری کتاب ایسے ہی سبق آموز اور حیرت انگیز واقعات سے لبریز ہے۔ قصہ کی دلچسپی کے علاوہ قومی ایثار، انسانی قربانی اور حسن صداقت کی ایسی جیتی جاگتی تصویرین موجود ہین کہ مطالعے سے ایک کیف روحانی پیدا ہوتا ہے اور بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ کتاب کاغذ وطباعت کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ قیمت عہ ۱۲ منیجر پرتاب پریس کانپور سے مل سکتی ہے۔

ندیم

اُردو نظم ونثر کا بینظیر مرقع، شاہد ادب کا حقیقی جلوہ گاہ، عروس معنی کا حجاب رنگین، شائقین ادب کی نگاہ التفات کا آرزومند، ملک کے بہترین انشاپردازون کا چہیتا یعنی ندیم جو بھوپال سے ماہوار شایع ہوتا ہے ہمارے دوست مولانا سعید رزمی فاضل ادبیات کا زور قلم اس علمی وادبی رسالے کی دلچسپیون کا ضامن ہے کاغذ عمدہ کتابت وطباعت دیدہ زیب قیمت للعہ سالانہ۔ پتہ۔ دفتر ندیم بھوپال۔

سہاگن بیوہ

نیک تلسی داس گنگا کے کنارے وقت شام
جا رہا تھا اک طرف بشناش جپتا "ہر" کا نام

چرخ کی نیرنگیون سے گفتگو کرتا ہوا
رنگ عرفان قلب کی تصویر مین بھرتا ہوا

جھاڑیان تھین سبز دریا کے کنارے جابجا
پھول کملائے ہوئے تھے سست تھی موج ہوا

شام کا چہرہ غم پنہان سے کچھ اترا سا تھا (۱) پانی تھم تھم کر جو بہتا تھا تو سناٹا سا تھا

راہ مین جاتے تھے پیتون پر گرد تھی
لانبی لانبی گھاس ہلتی تھی، پتا پتا زرد تھی

ذرہ ذرے پر خموشی تھی، بلا کا خوف تھا
مینڈکون کی تھین نہ آوازین، نہ جھینگر کی صدا

سائے سے شاخون کے کیا کیا تھم رہی تھی تیرگی
تیرگی تھی اور سیہ پانی سے گھبراتی تھی روح

جاتے جاتے ایک گوشے کی طرف پہونچی نظر
فرط غم سے رہگیا شاعر کلیجہ تھام کر

دیکھتا کیا ہے کہ دریا کی روانی ہے اداس
جل رہا ہے اک جنازہ، روشنی ہے آس پاس

کانپ کانپ اٹھتی ہے جنگل کی سیاہی بار بار
لاش سے شعلے نکلتے ہین فضا ہے بیقرار

روشنی شعلون کی اک پیشانی زرین پہ ہے
تیرگی آہونکی بیوہ کے رخ غمگین پہ ہے

فرق پر تھرا رہی ہے یاس پرتوے ہوئے
غمزدہ بیٹھی ہے زلفین دوش پر کھولے ہوئے

اور یہ عالم ہے کہ اب تک آ رہی ہے برملا (۲) جسم سے شادی کے پھولونکی شمیم جانفزا

اہتمام مرگ مین یہ شاعری لبریز یاس!
ہاتھ مین مہندی رچی ہے، برمین چوتھی کا لباس

نوعروس نازنین جسکی جبین گلزار ہے
داس نے دیکھا کہ مرنیکے لیے تیار ہے

کھڑی ہے "کیا بتاؤن کیا تمنا" دل مین ہے
شمع یہ کسکے جنازے کی مری محفل مین ہے!

لاش سے شوہر کی کہتی ہے "اجازت دیجئے
اب تو اس ایندھن کو بھی جلنے کی زحمت دیجئے"

آپ کے سینے سے شعلے اُٹھ رہے ہین بار بار
جل رہی ہو یہ مری اُٹھتی جوانی کی بہار"

آپ کو موت آگئی مین نذر حرمان ہو گئی
گود بھرنے بھی نہ پائی تھی کہ ویران ہو گئی"

یاد ہے سب مجھکو شادی کا ترنم یاد ہے
ہان، انھین ہونٹون پہ آیا تھا تبسم، یاد ہے

خندۂ غم، تشنۂ داغِ تمنا ہو گئی
ہائے گھونگٹ بھی نہ اُلٹا تھا کہ بیوا ہو گئی"

سُحر تھا میری ادا مین تیری عشرت کے لیے
لوچ تھا آواز مین تیری سماعت کے لیے"

پھُنک گئی میری تمنا، جل گیا میرا سنگار
میری زینت کا تری بے نور آنکھین ہین مزار

آج قربانگاہ حسرت پر چڑھانے کے لیے
موت آئی ہو مرا گھونگھٹ بڑھانے کے لیے"

خاک سے یہ کہکے اُٹھی آنسوون کو کر کے صاف
اور کہا "اے شرم کی دیوی! مجھے کر نا معاف

کہکے یہ پہلی چتا کی سمت وہ نازک خرام
اور کہا "اے آگ کے انبار لے میرا سلام"

دل بہت بیچین ہو آغوش راحت کے لیے
آتی ہون کچھ دیر مین اب تیری خدمت کیلیے"

دوڑکر پہونچے چتا کے پاس تلسی داس جی
دیکھتے ہی آپ کو کمسن تو تھی گھبرا گئی

پھر سنبھل کر یہ کہا "بابا دعا دیجے مجھے
زندگی کے پاپ سے جلدی چھڑا دیجے مجھے"

"اب دعا دیجے، دعا دیجے کہ جینا بار ہے
آگ میرے دل مین روشن ہو، چتا تیار ہے"

سُنکے اسکی بات تلسی داس نے اُس سے کہا
"اے مری ناداں بیٹی! سوچ تو کہتی ہو کیا؟"

مرنا جینا ایک ہے جنکو ذرا بھی گیان ہے
اسقدر رونا ہے کوئی! اسقدر نادان ہے!!"

زندگی دھندلا سا اک جلوا ہو اور کچھ بھی نہین
موت اِک باریک سا پردا ہے اور کچھ بھی نہین"

ہم فنا سمجھے ہین جنکو وہ فنا ہوتے نہین (۳) مرنے والے اصل مین ہمسے جدا ہوتے نہین"

عشق کے مالے کا اک موتی بکھر سکتا نہین
اتحادِ باطنی مرنے سے مر سکتا نہین"

جسم پر بنیادِ عشق حق نما ہوتی نہین
روح اس تبدیل ہیئت سے فنا ہوتی نہین"

غور کر دل مین کہ ہو جائے حقیقت بے نقاب
ٹوٹتے دیکھے تو ہونگے سیکڑون تو نے حباب"

مرنے بھی دریا کے سینے سے کہین جاتے نہین
کھیلتے پھرتے ہین لہرون پر نظر آتے نہین"

ہان ترا محبوب بھی یونہی ترے آنسو مین ہے
خون کی گردش مین ہو، اور سانس کی خوشبو مین ہے"

کہہ کے، یہ شاعر نے تھوڑی دیر آنکھیں بند کیں، دیکھتے ہی دیکھتے بیوہ کی آنکھیں کھل گئیں!
اُسنے جس ذرّے کو دیکھا روے دلبر ہوگیا دل سے پردے ہٹ گئے، سینہ منوّر ہوگیا

ہنسکے تلسی سے کہا "بابا وہی بوباس ہے (۴) دور میں جسکو سمجھتی تھی وہ میرے پاس ہے"
دل میں اطمینان، چہرے پر چمک پیدا ہوئی بات میں شوخی، نفس میں اک مہک پیدا ہوئی

زیر لب کہنے لگی "عالم ہے کیا تنویر کا! دل مرا شیشہ ہے اُسکی چاند سی تصویر کا"
"کُہدو مشاطہ سے زینت کا مری سامان کرے چوڑیاں کشتی میں لائے، مانگ صندل سے بھرے"

"ہاتھ اور پاؤں میں پھر مہندی لگائی جائیگی پھر نئے سر سے مری شادی رچائی جائیگی"
"پھول برسیں جلد میرا صحن بھرنے کے لیے شہد کی مکھی بھی آئے رقص کرنے کے لیے"

"ہاں کدھر میری سہیلی ہو مرے چندن لگائے کہدو مالن سے کہ تازہ کیتکی کے پھول لائے"
"آگے آگے پرچم فتح و ظفر کھولے ہوئے تتلیاں ہر قسم کی حاضر ہوں پر کھولے ہوئے"

"کُہدو بادل سے کہ میری زلف پر سایا کرے عیش کی دیوی کدھر ہو بزم میں جلوا کرے"
"ہاں تجلی سے کیکی میرا سینہ عرش ہے میرے مَن موہن کا جلوا عرش سے تا فرش ہے"

"خاک" تلسی کی نظر سے جوشِ گلشن ہوگئی
معرفت میں ڈوب کر بیوا سہاگن ہوگئی

جوش ملیح آبادی

حضرت مائلی نیوتنوی

ہجر کی تاب نہیں وصل کا مقدور نہیں قصہ کوتاہ یہ جینا مجھے منظور نہیں
وحشت آبادیٔ دل مانع بربادی ہو یعنی ویران بھی نہیں ہو جو یہ معمور نہیں

ایک ہم ہیں کہ بہرحال ہیں مجبورِ ازل ایک وہ ہیں جو کسی حال میں مجبور نہیں
یا تمھیں کو ہے یہ نفرت کہ نہ لو پھول کے نام یا یہ کہدو کہ وفا دہر میں مذکور نہیں

ہائے اے حسرتِ دلدادۂ لطفِ آزار درخورِ عدستم آپ دلِ رنجور نہیں
ایک وہ ہیں کہ ہیں منت کشِ صد نازِ حیات آہ اک ہم ہیں کہ جینا ہمیں منظور نہیں

شباب کا سبز باغ

پیری یہ کہہ رہی ہے کسی نامراد کی
کل سبز باغ دیکھ چکے ہم شباب کا

موسم بھی خوشگوار تھا، منظر بھی خوش بہار
دلچسپ تھا بلا کا، غروب آفتاب کا

کچھ کچھ غروب ہونے پہ بھی روشنی رہی
جیسے حسین چہرہ پہ عالم نقاب کا

پھولی ہوئی فلک پہ شفق تھی بصد جمال
پھولا ہوا تھا باغ مین تختہ گلاب کا

ملنا وہ دونون وقتون کا راز و نیاز سے
آنا وہ شام اور شب ماہتاب کا

شام اودھ تھی شام، شب مالوہ تھی شب
مضمر تھا جسمین حسن سے راز انقلاب کا

سنجے چہک رہے تھے ترنم ہوا مین تھا
تھا اک طرف تغزل سیتال آب کا

مضراب زن وہ پانی مین مچھلین ہوا کی تھین
اک ساز چھڑ رہا تھا سرود حباب کا

طبلہ کی تھاپ تھی کہین سارنگیون کی گونج
رقصان تھا ہر شجر چمن لاجواب کا

بیلے کے دست نازمین بیلا تھا دلنواز
برگ درخت ساز لیے تھے رباب کا

سوسن غزل سرا تھی بڑے سوز و ساز سے
سنبل کا راگ راز تھا اک پیچ و تاب کا

بلبل الاپتی تھی بڑے زور شور سے
دل جس سے پاش پاش ہوا تھا گلاب کا

عیش و طرب کے جمع تھے سامان ہر طرف
اور دور چل رہا تھا شراب و کباب کا

نرگس کی چشم مست مین جوش مئے نشاط
لالہ کے دست شوق مین ساغر شراب کا

گیندے کے ساغرون مین درخشان شراب ناب
گویا تھا چاندنی مین طلوع آفتاب کا

تھا فرد فرد باغ کا محو بہار عیش
دھڑکا نہ تھا خزان کا، نہ دور انقلاب کا

شاخ بجر، ہوائے نسیم و فضائے باغ
رگ رگ مین سب کے کیف بھرا تھا شراب کا

مخمور کی آنکھین بند تھین مدہوش پھول تھے
لطف آرہا تھا سب کو جوانی کے خواب کا

رقص و سرود و باغ و بہار و شراب و کیف
پھر حسن بے پناہ کسی خوش حجاب کا

وہ حسن جلوہ زار تجلی فروش تھا
لذت خرید دل تھا ہر اک شیخ و شاب کا

حسن و شباب، ناز و ستم، غمزہ و حجاب
تھا لاجواب عشوہ گر لاجواب کا

دل مین مرے بھرا تھا محبت کا شوخ رنگ
رنگ اسکے حسن سے تھا ٹپکتا شباب کا

پھیکا تھا رنگ گل رخ رنگین کے سامنے
فق ہو گیا تھا رنگ رخ ماہتاب کا

ان میگسار آنکھون کا عالم کہون مین کیا
دریا بہا رہی تھین وہ کیف شراب کا

اعجاز تھا کلام، ترنم نواز لب
آفت خرام ناز تھا مست شباب کا

نقش خرام ناز وہ انداز نقش پا
تھا قفل بے کلید قیامت کے باب کا

کیا اسکے حسن کا مین بیان کرسکونگا حال
کیا کرسکون گا ذکر مین اسکے شباب کا

دیکھا کیا مین اسکو جہان تک بھی ہوسکا
اسنے معائنہ نہ کیا اضطراب کا

گردش ہوئی نہ کچھ نگہ التفات کو
ثمرہ ملا نہ کچھ نظر انتخاب کا

صرف نظر مین اسکے، ہوا دل کا جوش صرف
مطلب نہ حل ہوا دل خانہ خراب کا

ارمان تھا کہ دیکھے حال تباہ کو
روشن ہوا سیہ حال مرے اضطراب کا

دل سے نگاہ ناز کو کچھ رسم و راہ ہو
موقع ملے زبان کو کلام و خطاب کا

آنکھین ملین، نگاہ ملے، دل سے دل ملے
یہ اشتیاق تھا ہوس ناصواب کا

اک کشمکش تھی دل مین مرے اشتیاق کی
دریا ابل رہا تھا مرے اضطراب کا

اس عیش و انبساط مین گذری تھی نصف شب
سارے جہان پہ دور عمل اب تھا خواب کا

سوتی تھی ساری خلق، زمانہ خموش تھا
عبرت فزا جواب تھا یہ، اضطراب کا

راحت طلب تھا اب وہ مرا مست خواب بھی
اس چشم مست پر بھی تسلط تھا خواب کا

انگڑائی اسنے لی تھی کہ بجلی چمک گئی
یہ رخصتی سلام تھا مست شباب کا

پھر کیا ہوا؟ مین کیا کہون بس قہر ہو گیا
چھپنا وہ رشک مہر کا، گرنا حجاب کا

پردہ ادھر گرا تھا کہ غش کھا کے مین گرا
اندیشہ تھا نہ قلب کو اس انقلاب کا

کچھ دیر بعد آنکھ کھلی، دل ہوا بجا
حسرت زدہ تھا حال جہان خراب کا

اب کیا بیان ہو مری مایوسیوں کا حال — اظہار حال کیا ہو مرے پیچ و تاب کا
حسرت نصیب قلب تھا، اندھیر تھا جہان — ختم اب ہوا تھا دور شبِ ماہتاب کا
دور بہار و رقص و طرب سب ہوئے تھے ختم — اب دور تھا چمن میں خزاں اضطراب کا
دل بجھ رہا تھا میرا، نمودار تھی سحر — شمعِ سحر تھا حال جوانی کے خواب کا
افسردہ وہ سحر تھی کہ پیری کی صبح تھی — سب جوش سرد تھا دل خانہ خراب کا
تھی صبح، صبح حشر کہ صبحِ شبِ وصال — جسکی نمود، حشر تھا میرے شباب کا

اب سوچ ہے، سکوت ہے، چہرہ اداس ہے
ہوتا ہے افتتاح تحیر کے باب کا

ح ر م ۔ ع لکھنوی

غزل جناب خورشید لکھنوی مرحوم

غیر مطبوعہ

سمجھ میں کچھ نہ فلک کا یہ انقلاب آیا — ہماری خاک سے کیوں بنکے جام آب آیا
اسی سے بزم میں وہ شوخ بے نقاب آیا — تڑپ کا دامن میں دھبہ اگر حباب آیا
کسی کا ناز حسینوں سے اٹھ کیا ممکن — یہی خلاف ہو اکھنچ کے کیوں گلاب آیا
اٹھائی تیغ پئے قتل تم نے ہم ہوئے خم — تمہیں تو شرم نہ آئی ہمیں حجاب آیا
تڑپ کے برق نے دکھتے جگر کو چھیڑ دیا — دلِ ملول سنبھل ۔ وقت اضطراب آیا
گیا جو میں تو غبار اڑ کے اسنے یوں بولا — پھر آج در پہ کوئی خانماں خراب آیا
سمجھ لیے دل پر خون گم شدہ اپنا — ہمارے ہاتھ میں جب ساغر شراب آیا
ہمیشہ آگ پہ پہلو بدل بدل کے رہا — مری طرح تجھے جلنا نہ اے کباب آیا
جھکایا اسلئے سر میرے خون ناحق پر — کوئی یہ جسمیں کہے انکو بھی حجاب آیا
میں ریگ شیشہ ساعت بنا تھا کیا خورشید — گھڑی گھڑی مری خاطر جو انقلاب آیا

لطفِ سخن

جناب ابو المعانی مرزا یاس صاحب

نگاہِ شوق ہوتی یا نگاہِ واپسیں ہوتی
بہر صورت زبانِ گنگ معنی آفریں ہوتی

جو رو سکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے
شریکِ بزم و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی

خزاں سے پہلے ہی کاش اپنی آنکھیں بند ہو جاتیں
بہارِ اولیں ہوتی نگاہِ واپسیں ہوتی

اُمید و بیم روز افزوں وبالِ جان و دل ٹھہری
فنا کے بعد بھی تا حشر یکسوئی نہیں ہوتی

قیامت خانۂ دل جنتِ صبر و سکوں ہوتا
محیطِ چرخ کے باہر اگر یہ سرزمیں ہوتی

وہ محرومِ ازل ہیں دھیان میں لاتا نہیں کوئی
محبت کیا ہم ایسوں سے عداوت تک نہیں ہوتی

نہیں سُنتا کسی کی پائے نافرمان نہیں سُنتا
سفر کیا اُس مسافر کا طلب جس کی نہیں ہوتی

ازل سے کشتیِ امید تھی بیگانۂ ساحل
جہاں پایا بہ ہر دریا وہاں بھی تہ نشیں ہوتی

نگاہِ مضطرب کی حد ہے فانوسِ خیالی تک
قیامت تھی اگر پروانۂ شمعِ یقیں ہوتی

غضب ہے منہ چھپانا سجدۂ ناحق کے پردے میں
بلا سے تختۂ مشقِ ستم لوحِ جبیں ہوتی

یہ آبِ آتشیں ہے اور یہ دریا خونِ ناحق کا
مگر نفسِ شقی کی پیاس میں تسکین نہیں ہوتی

فقط دل کی بدولت گرم ہے پہلوئے جاں ورنہ
جسد میں روح اِک دیوانہ تنہا نہیں ہوتی

دمِ آخر فریبِ جلوۂ بیرنگ نے مارا
نگاہِ یاس ورنہ کیوں گنہگارِ یقیں ہوتی

حضرت صفدر مرزا پوری

جوانی جا چکی، سینے میں دل بھی مر چکا میرا
رہا کیا مجھ میں اب کیا دیکھتی ہے منہ قضا میرا

مری صورت کو دیکھو کچھ نہ پوچھو ماجرا میرا
جو کچھ گذری ہے مجھ پر خوب واقف ہے خدا میرا

قفس میں ایک بیمارِ محبت جان دیتا ہے
چمن والوں سے یہ پیغام کہدینا صبا میرا

مری ناکامیِ امید بھی ہے رحم کے قابل
میں وہ مایوس ہوں اُٹھنا نہیں دستِ دعا میرا

اُسی بیدرد کا تو نے بھی چھیڑا ذکر اے ناصح
وہ چٹکی دل میں لی ظالم، کلیجا دُکھ گیا میرا

مجھی پر آج پڑتی ہیں نگاہیں اہلِ محفل کی
تمہاری بزم میں ایسا جما رنگِ وفا میرا

یہ کب کہتا ہوں تم صورت دکھاؤ اپنی بے پردہ
ذرا چلمن تک آجاؤ بر آئے مدعا میرا

بتوں کی بے نیازی دیکھ کر کہنا ہی پڑتا ہے
سمجھتے ہیں مجھے ایسا، نہیں جیسے خدا میرا

نشانِ پا سے چلتا ہے پتا ٹھوکر کے چھالوں کا
جما ہے دشت میں بھی دور تک نقشِ وفا میرا

مرے دل سے تو اب تک درد کی لذت نہیں جاتی
بھلا ہو چارہ گر کا کھو دیا سارا مزا میرا

دمِ آخر جو آئے ہیں تو مرنے بھی نہیں دیتے
مجھے وہ یاد دلواتے ہیں پیمانِ وفا میرا

اسے کہنا خدا سے کچھ نہ کچھ کہنا حسینوں سے
مزے کی چیز ہے صفدر دلِ بے مدعا میرا

حضرت احسن سہسوانی

دل خاک ہوئے اور بھی پرجوش ہو گیا
اک ایک ذرہ محشر خاموش ہو گیا

اب میں ہوں اور میری شبِ غم کی تیرگی
عالم کا ذرہ ذرہ سیہ پوش ہو گیا

دنیا سمجھ رہی ہے کہ تابِ فغاں نہیں
کیا جانے کیا سمجھ کے میں خاموش ہو گیا

یہ ابر، یہ ہوا، یہ تماشا، یہ کیفِ شوق
لو میں بھی توبہ توڑ کے مینوش ہو گیا

تم کو کچھ اپنی برقِ نظر کی خبر بھی ہے
دیکھو تو کون بزم میں بیہوش ہو گیا

چھیڑا کچھ ایسے سوز سے بلبل نے سازِ شوق
ہر غنچہ باغ میں ہمہ تن گوش ہو گیا

دل سوز ہو سکا نہ چراغِ شبِ فراق
میں نالہ کش ہوں اور وہ خاموش ہو گیا

دیکھا گیا نہ مجھ سے تماشائے بیکسی
گھبرا کے میں اجل سے ہم آغوش ہو گیا

احسن نہ پوچھ قصۂ شہائے آرزو
اک خواب تھا سو وہ بھی فراموش ہو گیا

رفتار زمانہ

گذشتہ کرسمس میں صوبہ بہار کا مشہور و معروف شہر گیا قومی جلسوں کا مرکز قرار پایا۔ اسی قدیم شہر میں جو ہندوؤں اور بودھوں کا ایک متبرک و مقدس تیرتھ ہے نیشنل کانگریس کا سینتیسواں اجلاس منعقد ہوا۔ اور گو امسال مسلم لیگ کا کوئی جلسہ نہیں ہوا لیکن مسلمانوں کی بڑی جماعتیں جمعیت العلماء اور آل انڈیا خلافت کانفرنس کے اجلاس بھی یہیں ہوئے۔ کانگریس میں بیس ہزار اہل ملک کا مجمع رہا۔ دو تین سال سے بالکل ہندوستانی طرز کے فرش پر نشست کا انتظام ہوتا ہے۔ پنڈال سرتاپا کھدر ہی سے سجا ہوا تھا۔ ڈیلی گیٹوں کی تعداد چار ہزار تھی اور انکے قیام کے لئے سوراج پوری کے نام سے عارضی طور پر ایک نئی بستی آباد کی گئی تھی۔ صدر کانگریس بنگال کے نامور محب وطن اور ایثار مجسم مسٹر سی۔ آر۔ داس تھے۔ جنکا صدارتی ایڈریس زیادہ تر تحریک نان کوآپریشن کی حمایت پر مبنی تھا۔ آپ نے وکالت کا پورا حق ادا کر دیا۔ اور اس تحریک کی ناکامیابی کے واقعہ کو اس خوبی سے نباہا کہ اب اسپر کوئی اضافہ ممکن نہیں ہے۔ آپ کا یہ فرمانا سچ ہو کہ کسی عظیم الشان تحریک کو نہ کبھی پوری کامیابی نصیب ہوتی ہے اور نہ قطعی ناکامیابی۔ مگر سوال یہ ہو کہ ملک کے لئے مزید حقوق حاصل کرنے یا گورنمنٹ کو بیکار کرنے میں تحریک عدم اشتراک عمل کامیاب ثابت ہوئی یا ناکامیاب۔ اسکا جواب صرف ایک ہے اور وہ مسٹر داس کے ایڈریس میں ہمکو نہیں ملتا ہے۔ انکے تقریر کا بڑا حصہ امن و امان کے معنوی پہلوؤں کے مفصل بیان اور ستم رسیدہ اقوام کے حق بغاوت کے طولانی مباحثہ میں صرف ہوا ہے۔ آپ نے انگلستان کی قدیم تاریخی نظیروں سے ثابت کیا ہے کہ مظلوم قوموں کو ظلم و تشدد سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جنگ کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔ مسٹر داس نے اس بحث میں بڑی وقت نظری سے کام لیا ہے اور اس حصہ تقریر کو پڑھکر انکے علمی تحقیق و قابلیت کی داد دینا پڑتی ہے لیکن ہم اس طولانی مباحثے کو عملی حیثیت سے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اسلئے کہ اب اس قسم کی باتیں انسانی حقوق میں داخل ہیں اور انکے متعلق کسی کو قائل کرنے کی حاجت نہیں رہی۔ اس بارے میں اصل سوال

صرف دو ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا ملک کی حالت اسوقت واقعی ایسی خراب اور ابتر ہے کہ ہمکو آئینی طریق جدوجہد کو چھوڑکر جان دینے اور جان لینے پر آمادہ ہوجانا چاہیئے۔ کیا ہمارے ملکی نجات کے لئے گشت وخون کے علاوہ اب اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا ہے۔ کیا ہم جدال وقتال کے بغیر اپنے ملکی مقاصد حاصل نہیں کرسکتے ہیں؟ دوسرے کیا ملک اسکے لئے پورے طور پر آمادہ وتیار ہے۔ کیا ہم ان نقصانات اور خدشوں کو انگیز کرنے میں جو غیر معمولی تدابیر اور تشدّدانہ طریق عمل اختیار کرنے سے ملک کو پہونچیں گے حق بجانب ہوں گے۔ مسٹر داس نے ان عملی سوالات کے طرف کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ وہ جابجا عدم تشدّد کا راگ الاپتے رہے۔ مگر اسکی مشکلات پر جو فطرت انسانی کو دیکھتے ہوئے بہت اہم ہیں کوئی دھیان نہیں دیا حالانکہ سول نافرمانی کمیٹی نے تمام ملک کا دورہ کرکے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قوانین مروجہ کی خلاف ورزی کا ابھی وقت نہیں آیا ہے۔ مسٹر داس نے سوراج کا ایک دھندلا سا خاکہ بھی پیش کیا ہے مگر ہم اسکو اسلئے نظرانداز کرتے ہیں کہ یہ ایسا خاکہ ہے جسکی نظیر فی الحال ناپید ہے۔ ہاں جہاں صاحب موصوف نے مختلف اقوام ہند کے باہمی اتحاد واتفاق پر زور دیا ہے۔ وہاں اُنکا مشورہ نہایت صائب اور مناسب اور عملی ہے۔ اور ہندو مسلمانوں کے درمیان اگر اس قسم کا کوئی سمجھوتہ ہوجائے جیسا کہ مسٹر داس نے فرمایا ہے تو ہم سمجھیں گے کہ سوراج کا راستہ صاف ہوگیا ہے۔ مسٹر داس نے ان انگریزوں کو بھی جنھوں نے ہندوستان اپنا وطن بنالیا ہے۔ ہندوستانیوں میں داخل سمجھا ہے۔ اس سے انگلو انڈین اصحاب کا یہ شک دُور ہوجانا چاہیے کہ ہندوستان کی قومی تحریک نسلی اختلافات پر مبنی ہے۔

گو کانگریس نے مسٹر داس کو اپنا صدر منتخب کیا۔ لیکن رزولیوشن جو اسمال گیا میں منظور ہوئے وہ سب کے سب صاحب موصوف کے خلاف رائے پاس ہوئے ہیں۔ انگریز پریسیڈنٹ صاحب کو کانگریس کے بعد ہی صدارت سے مستعفی ہوجانا پڑا۔ اور اب اُنھوں نے برائے نام کانگریس کے اندر رہتے ہوئے پنجاب خلافت سوراج پارٹی کے نام سے ایک نئی ملکی جماعت قائم کرلی ہے جو اپنے ملکی مقاصد کے لئے موجودہ قانونی کونسلوں میں داخل ہونا ضروری سمجھتی ہے۔ کانگریس نے کونسلوں کے داخلے کو منظور نہیں کیا بلکہ سول نافرمانی جاری کرنیکا ارادہ ظاہر کیا اور اسکے لئے ملک سے پچیس لاکھ روپیہ اور پچاس ہزار والنٹران فراہم کرنے کی اپیل کی اور آئندہ سرکاری قرضوں کی ذمہ داری سے انکار کا بھی اعلان کیا گیا۔ ان تجاویز سے ملک کے بیشتر اہل الرائے اصحاب کو اختلاف ہے۔ اور کانگریس کے اکثر لیڈران

اور آزمودہ کار رہنمایان ملک انھیں رزولیوشنوں کی مخالفت کی وجہ سے مسٹر داس کی پارٹی میں شامل ہوگئے ہیں۔ جس سے کانگریس کی وقعت کو بہت بڑا صدمہ پہونچا ہے۔ یوں تو کانگریس میں کئی سال سے انتہا پسندی کا زور ہے۔ مگر امسال اس جوش کی حد ہوگئی اور بڑے بڑے قابل تہماؤں کے رائے کی علانیہ بے وقعتی کی گئی۔ لوگوں نے حسب معمول بلا احساس ذمہ داری بلند ترین آواز کا ساتھ دیا۔ مسٹر راجہ گوپال آچاریہ نے مہاتما گاندھی کے نام پر اپیل کرکے جو چاہا پاس کرا لیا۔ اور کانگریس نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ملکی مسائل کا حل مذہبی پیشواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا۔ ہم ان کارروائیوں کو سراسر خلاف اصول سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ گیا میں سینتیس ۳۷ برس پرانی کانگریس کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

مسٹر داس کی پارٹی میں اسوقت بہترین حامیان کانگریس شامل ہو رہے ہیں مگر نہیں معلوم کہ یہ پارٹی اتفاق رائے سے کوئی عملی پروگرام مرتب بھی کرسکے گی یا نہیں۔ داخلہ کونسل ہی کے متعلق مختلف لیڈران کانگریس کی رائیں مختلف ہیں۔ پنڈت موتی لال صاحب نہرو انتخابات میں حصہ لینے کی طرف ہیں مگر کونسل میں شریک ہونے کے طرفدار نہیں۔ مسٹر داس کونسلوں میں شریک ہونے کے حامی ہیں مگر کونسلوں میں جاکر سرکاری عہدے قبول کرنے کے خلاف ہیں۔ مسٹر جے کار اصلاحات سے پورا فائدہ اٹھانے کے طرف ہیں۔ مسٹر کیلکار اور مہاراشٹر پارٹی گورنمنٹ سے جوابی تعاون کے حامی ہیں۔ اگر یہ سب لیڈران جو مسٹر داس کی پارٹی میں شامل ہوئے ہیں اتفاق رائے سے کوئی عملی دستور العمل بنا سکیں تو ہم اسکو ملک کی بہت بڑی خوش نصیبی سمجھیں گے۔

خلافت کانفرنس انتہا پسندی میں کانگریس سے بھی دو چار قدم آگے رہی۔ اسکی ایک خصوصیت امسال یہ تھی۔ کہ اسکے استقبالیہ کمیٹی کے صدر صوبہ بہار کے مشہور ہندو لیڈر مسٹر دیپ نرائن تھے۔ خلافت کے متعلق آپ نے جو تقریر کی اور اسمیں جو مطالبات کئے ہیں وہ مسلمان ہم وطنوں کے دلی خیالات کا بالکل آئینہ ہیں۔ اس واقعہ سے ہندو مسلم اتحاد میں اس طرف جو غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اسکا ایک اور ثبوت ملتا ہے جسپر ہم ملک کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

گیا میں اور بھی بہت سے جلسے ہوئے۔ آل انڈیا ہندو کانفرنس کے صدر سخنرمان پنڈت مدن موہن مالویہ تھے اور آپ نے بجا طور پر ہندوؤں کے اندرونی اتفاق اور یکجہتی پر زور دیا۔ آپنے

ہندو مسلم اتحاد کے استحکام کے لئے اِس بات کی بڑی ضرورت بتلائی کہ قومی حیثیت سے ہندو اپنے جسمانی اور اخلاقی کمزوریوں کو دور کریں۔ اور اپنے ننگ و ناموس اور جان و مال کی خود حفاظت کر سکنے کی قابلیت پیدا کریں۔

آل انڈیا اسٹوڈنٹ کانفرنس نے علی طور پر سرکاری اسکولوں کے بائیکاٹ پر زور نہیں دیا۔ بلکہ اسکو ایسا معیار قرار دیا جسے طلبا کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

لبرل اور ماڈریٹ اصحاب کی کانفرنس امسال ناگپور میں ہوئی اور اسکے صدر رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری تھے جو ابھی حال ہی میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے نوآبادیوں کی سیاحت کر کے واپس آئے ہیں۔ سر مانک جی دادا بھائی کمیٹی استقبالیہ کے صدر تھے۔ آپ نے نان کوآپریشن کو برا بھلا کہا۔ اور لبرل پارٹی سے گورنمنٹ کے امداد کی اپیل کی۔ مسٹر شاستری کی تقریر میں کئی ضروری ملکی مسائل پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ آپ نے موجودہ ریفارم کو ناکافی بتلایا ہے اور سکرٹریٹ اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کی حق تلفی کا طولانی ذکر کیا ہے۔ سرکاری اخراجات کم کرنے اور ہندوستانیوں کو فوجی عہدے دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ ملک میں مختلف پارٹیوں کی موجودگی کو آپ نے سیاسی خیالات کی توسیع و ترقی کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا اور فرمایا کہ جزئیات میں اتفاق رائے کی امید رکھنا سیاسی ناتجربہ کاری کی دلیل ہے۔ تما م ایڈریس میں ہم اس رائے کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اہل ملک اس قول کی صداقت کو پورے طور پر محسوس کریں اور محض اختلاف رائے کی بنا پر ایک دوسرے سے بدظن و بدگمان رہنے کی غلطی سے بچیں۔

جدید گورنر صوبہ جات متحدہ۔ اب ہمارے صوبہ کے گورنر سر ولیم میرس بالقابہ ہوئے ہیں۔ آپ کی اعلیٰ قابلیت کا بارہا اعتراف ہو چکا ہے۔ چمسفورڈ اور مانٹیگو رفارم کی رپورٹ آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ آپ کے حسن تدبیر کی چار دانگ ہند میں شہرت ہے۔ ہمکو امید ہے اور ہماری دعا ہے کہ آپ کا عہد حکومت ہمارے صوبہ اور تمام ملک کے لئے ایک مبارک زمانہ ثابت ہو۔

علمی نوٹ اور خبریں

پچھلے سال اُردو کے کئی اچھے رسالے جاری ہوئے۔ ہمایوں حبش شاہدین صاحب مرحوم کے یادگار میں آپ کے صاحبزادے میاں بشیر احمد بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا کے ایڈیٹری میں شایع ہو رہا ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی جوائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ دونوں صاحبوں کی کوشش سے یہ رسالہ اچھے عنوان سے نکل رہا ہے۔ اور اب اپنی زندگی کا پہلا سال ختم کر چکا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ کا انتظام اچھا ہے۔ مضامین بھی دلچسپ اور سبق آموز رہتے ہیں۔ اور رسالہ میں عموماً ایک تصویر بھی ہدیۂ ناظرین ہوتی ہے۔

لاہور ہی سے جولائی گذشتہ سے ایک دوسرا رسالہ ہزار داستاں کے نام سے حکیم محمد شجاع اللہ بی۔ اے کے ادارت میں جاری ہوا ہے۔ ابتک یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ تھا مگر نئے سال سے یہ ماہوار کر دیا گیا ہے۔ ابتک اسمیں زیادہ تر مختصر افسانے شایع ہوتے تھے۔ اب دیگر رسالوں کی تقلید میں اسمیں مختلف طور پر دلچسپ اور مفید مضامین درج ہوا کریں گے۔ پچھلے چھ ماہ کے اندر اس پرچے نے دو تین عمدہ تصویریں بھی ہدیۂ ناظرین کی ہیں۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ اُردو میں مختصر افسانوں کی کمی ہے۔ اسلئے اگر یہ رسالہ عمدہ افسانوں کے اشاعت ہی کے لئے وقف رہتا تو اسکے ذریعہ اُردو ادب کی ایک بڑی کمی پوری ہو سکتی تھی مگر مہتمان کو غالباً اپنے مقاصد میں دشواریاں نظر آئیں۔ اِس لئے اُنکو نئے سال سے اسمیں عام مضامین کی بھی گنجایش نکالنا پڑی۔

فروری گذشتہ میں آگرہ سے نگار نامی ایک دلچسپ رسالہ حضرت نیاز کی ایڈیٹری میں جاری ہوا۔ اسکے مختلف نمبروں میں بہت سے تاریخی مضامین اور قصے شایع ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب کے سب انگریزی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ بعض مقامین تو جیسا کہ ہمارے ایک لایق نامہ نگار نے لکھا تھا۔ بعض نامور مورخین ہند کے مضامین سے لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لئے گئے ہیں۔ مگر رسالہ میں یہ مضامین اس طرح لکھے گئے ہیں گویا ایڈیٹر صاحب نگار کے تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہیں۔ "نگار" نے اس اعتراض کے بعد ان مضامین کا ماخوذ ہونا تسلیم کر لیا ہے۔ ہمکو امید ہے کہ آیندہ کسیکو نگار سے اس ایک "نگار" ہی پر کیا فرض ہے اُردو میں اس قسم کی خفیف حرکات ایک معمولی واقعہ ہو گئی ہیں اور عام طور پر اُن سے چشم پوشی کیجاتی ہے۔ پچھلے سال ہزار داستاں کے ایک پرچہ میں عنوان ہی میں ایک ایسا قصہ شایع ہوا جو عرصہ ہوا رسالہ زمانہ میں شایع ہو چکا ہے۔ ہم نے دونوں رسالوں کا مقابلہ کیا تو ہزار داستاں کا قصہ زمانہ سے بجنسہٖ نقل کر دیا گیا تھا۔ غالباً نامہ نگار صاحب نے ایڈیٹر صاحب ہزار داستاں کی لاعلمی میں وہی مضمون انکے

پاس اشاعت کی غرض سے بھیجدیا ہوگا۔ مگر اس قسم کے مضمون نگاروں کا کچھ نہ کچھ تدارک ضروری ہے۔

بعض مضمون نگاروں کا ایک اور وطیرہ بھی بہت ہی قابلِ اعتراض ہے۔ یعنی بعض اصحاب ایک ہی نظم یا غزل کو ایک ساتھ کئی جگہ اشاعت کے لئے بھیجدیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز دو جگہ سے شایع ہوجاتی ہے۔

کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض اصحاب دوسرے مضمون نگاروں کے مضامین کو مسخ یا مختصر کرکے اور عنوان وغیرہ تبدیل کرکے بے تکلف اپنے نام سے شایع کرادیتے ہیں۔ مخزن کے آخری دور میں ایک صاحب نے رسالۂ زمانہ کے ایک شایع شدہ قصہ کو جو حضرت نیاز فتحپوری کا تصنیف شدہ تھا مختصر کرکے اپنے نام سے شایع کرادیا۔ اسکا عنوان بھی بدل دیا گیا تھا۔ مگر پڑھنے بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ مضمون نگار نے شروع اور درمیان کی چند سطریں حذف کرکے حضرت نیاز کے افسانے کو ہو بہو نقل کرکے مخزن میں اپنے نام سے چھپوا دیا ہے!

اُردو میں بہت سے رسالے جاری ہوئے اور بند ہوگئے اور انمیں سے اکثر ایسے پرچے تھے جن میں زیادہ بڑے بڑے نامور مصنفین کے پرانے اور مطبوعہ مضامین ہی نکالا کرتے تھے۔ اب بھی پنجاب سے ایک ایسا رسالہ نکلا ہے جسمیں شروع سے آخر تک منقول مضامین درج ہیں اور سب بلا حوالہ شایع ہوئے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض مصنفین کی مستقل تصانیف دوبارہ شایع کردی گئی ہیں۔

ہمارے مخدوم محترم خواجہ حسن نظامی صاحب اُردو پر جو احسانات عظیم کر رہے ہیں اُنکا حال ناظرین زمانہ سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن یہ صریح زیادتی ہے کہ انکی سرپرستی میں دو رسالے خطیب اور نظام المشایخ ایسے شایع ہو رہے ہیں جو بظاہر دو مگر بباطن ایک ہیں۔ انمیں سے ایک ہی پرچہ دو مختلف ناموں سے علٰحدہ علٰحدہ شایع ہو رہا ہے!

ہماری رائے میں پبلک کے ساتھ یہ ایک قسم کی بد معاملگی ہے جسکے انسداد کی ضرورت ہے۔

کچھ عرصہ سے ہندی زبان میں معمولی ترقی ہو رہی ہے۔ اُردو کے مقابلے میں اسکا رواج بھی بڑھ رہا ہے اور اسکا ادب بھی غیر معمولی ترقی کر رہا ہے۔ ملک میں جا بجا بیت سے دارالاشاعت قائم ہوگئے ہیں جنکا منشا صرف یہی ہے کہ ہندی زبان کی توسیع اور ترقی ہو۔ ہر سال انکی بدولت صدہا قابل دید کتابیں شایع ہوتی ہیں۔ سنسکرت۔ انگریزی۔ اردو۔ گجراتی اور بنگالی زبان کی بہترین کتابیں ترجمہ ہوکر ہندی ادب میں داخل ہو رہی ہیں۔ شیخ سعدیؒ کی گلستاں۔ مولانا حالی کی نظمیں ڈاکٹر ہوگیو کے بہترین ناول یہ سب ہندی میں موجود ہیں۔ ہمنے قصداً مختلف اصناف ادب کا ذکر کیا ہے تاکہ ناظرین کو ہندی کے ترقی کی وسعت کا اندازہ ہوسکے۔ اس ترقی کا اصلی سبب ہندی داں طبقہ کی عام قدردانی ہے جو نئی کتابوں کی خریداری میں ہمیشہ اولوالعزمی سے کام لینے کے عادی ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی کتابیں ایک ہی دو سال کے اندر کئی کئی بار چھپکر فروخت ہوجاتی ہیں۔ پبلشروں کو بھی اچھا خاصہ نفع ہوتا ہے اور مصنفین اور مترجمین کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور انھیں اپنے علمی مشاغل جاری رکھنے کی پوری ترغیب ہوتی ہے۔ اردو میں ایک کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے میں آٹھ آٹھ دس دس سال لگ جاتے ہیں۔ کاروباری حیثیت سے روپیہ لگانے کا حوصلہ ہو تو کیونکر ہو

مولانا شوکت میرٹھی مرحوم ۲۰ دسمبر ۱۹۳۶ء یوم جمعہ عصر کے وقت مولانا سید احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی نے انتقال فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ دنیائے علم و ادب کے ایک ممتاز رکن تھے، شاعری کے علاوہ آپ فن تنقید کے بھی ماہر تھے، اور مشرقی علوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے، افسوس موت نے کیسی برگزیدہ ہستی کو ہم سے چھین لیا، خدا مرحوم کو جنت اور متعلقین کو صبر عطا فرمائے،

سر اقبال ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹرایٹ لا لاہور کو اس سال گورنمنٹ نے 'سر' کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ علامہ اقبال اپنی عالمگیر شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، آپ کے علمی و ادبی کارنامے ہندوستان کے علاوہ یورپ و امریکہ میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ شکوہ، ترانہ، شمع و شاعر وغیرہ وغیرہ آپ کی بیمثل نظمیں ہیں مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا، یعنی اسوقت آپ علامہ اقبال یا ترجمان حقیقت" اقبال کے نام سے مشہور تھے، اب دیکھنا ہے کہ سر کے خطاب کے بعد آپ کی علمی و ادبی شغف کا کیا رنگ ہوتا ہے، بہرحال ہم علامہ اقبال کی خدمت میں مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں، ہمارے ایک دوست نے خوشی میں ایک شعر کہا ہے ؎ قومیت پر آگئی غالب حکومت کی ادا پہلے تھے علامہ اقبال اب سر ہو گئے۔

الناظر کا اجراء خوشی کی بات ہے کہ رسالہ الناظر جو حضرت ظفر الملک علوی کی اسیری کے باعث بند تھا، اب پھر خوبی سے اپنی سابقہ آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ گذشتہ بارہ سال میں الناظر نے جو کچھ زبان کی خدمت کی ہے اس سے دنیائے ادب بخوبی واقف ہے۔

ادبی درسگاہ ارکان انجمن حلقہ ادبیہ کانپور نے ایک ادبی درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اسکے تین شعبے ہونگے نظم و نثر، تنقید، ہر شعبہ میں باقاعدہ اصلاح کا انتظام ہوگا۔ پہلے یہ ادبی انجمن متامی حضرات کیلئے مخصوص تھی، اب یہ دعوت ادب عام ہے۔ ادب دوست حضرات بذریعہ خط و کتابت استفادہ کر سکتے ہیں۔ ممبری کے لئے دو روپیہ فیس داخلہ مقرر ہے۔
پتہ۔ احسن بھمی ناظم حلقہ ادبیہ (دفتر زمانہ کانپور)

عرض حال

دسمبر کے پرچہ میں ہم نے معاونین زمانہ سے توسیع اشاعت میں امداد کی درخواست کی تھی۔ آج پھر ہم اسکی ضرورت پر ناظرین زمانہ کی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔ زمانہ کو ملک کی ادبی خدمت انجام دیتے ہوئے پورے بیس سال ہو گئے۔ اس عرصۂ دراز میں اسنے سختیاں جھیلیں۔ کڑیاں اٹھائیں۔ لیکن سررشتہ استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہم اپنے مشکلات کے مفصل بیان سے اپنے قدرشناسوں کو بے لطف نہیں کرنا چاہتے۔ تاہم یہ کہنا بے موقعہ نہ ہوگا کہ بہت سے حوصلہ شکن حالات کے باوجود زمانہ اب تک اپنے ادائے فرائض میں برابر ثابت قدم رہا۔ اور اپنے مہربانوں کو تکلیف دینے میں اسے ہمیشہ بہت پس و پیش رہا مگر اسوقت ایک حالت مجبوری کی آگئی ہے۔ کیونکہ سرکاری اسکولوں کے لئے اسکی دو سو کاپیاں جو پچھلے چھ سات سال سے خریدی جا رہی تھیں اس سال مالی مشکلات کی وجہ سے بند کر دی گئیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سوسائٹی کی طرف سے بھی خریدے جاتے تھے مگر وہ بیشتر ہی سے بند ہو گئے ہیں۔ تین سو خریداروں کی کمی ایسی نہیں ہے کہ اسکا اثر کارکنوں کو محسوس نہ ہو۔ گو اسوقت بھی دنیائے ادب کا یہ پرانا خادم اپنی طرف سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹانا نہیں چاہتا ہے بلکہ وہ اسکے آگے ہی بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ مگر یہ اسیوقت

ہوسکتا ہے کہ جب ہمارے احباب جنکی علمی دلچسپیاں زمانہ کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اپنے دیرینہ ہمنشین کی دستگیری فرمائیں موجودہ مشکلات کے علاوہ ابتدائی خسارہ کا بوجھ بھی ابھی تک کچھ نہ کچھ سر پر باقی ہی ہے۔ جس سے اسکے مستطر ہستی پر ایک ہلکی سی تاریکی قبضہ کرلینے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن بیس سال کے تجربات نے کارکنان کو مشکلات کا مقابلہ کرنے کا عادی بنا دیا ہے۔ اور گو ایک طرف مالی کمزوری کی شکوہ بجی ہے مگر دوسری طرف ناظرین کی دلچسپی کے لئے اخراجات بڑھا دیئے گئے ہیں جسکا اندازہ اسی نمبر کے ملاحظہ سے ہوجائیگا۔ اگر ہمارے علم دوست احباب نے ہماری حوصلہ افزائی میں دیر نہ کیا تو ہم یقیناً سال حال میں متعدد رنگین اور سادہ تصاویر ہدیۂ ناظرین کرینگے۔ اور بہت سی دیگر ادبی دلچسپیوں کا سامان بھی ہوسکے گا۔ ہمکو امید ہے کہ ہمارے ناظرین ہمکو مایوس نفرمائیں گے۔ بہت سے اصحاب کیلئے دو چار نئے خریدار دیدینا کچھ بھی مشکل نہیں ہیں۔ ہاں توجہ شرط ہے۔ ہمکو اس توجہ کی اشد ضرورت ہے اور ہمکو امید ہے کہ ہماری اپیل بیکار نہ جائے گی۔

شکریہ - جن اصحاب نے گذشتہ نمبر میں ہماری عرض حال کو غور سے پڑھا انکا ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

حیدرآباد سے ایک دوست نے جو حضرت نظام کے تعلقہ دار دوم ہیں دو خریدار عنایت فرمائے ہیں اور اسکے ساتھ ہی یہ حوصلہ افزا الفاظ تحریر فرمائے ہیں۔

دو نمبر ملا، جسکا شکریہ ادا کرتا ہوں، عرض حال کو پڑھ کے مجھے خیال ہوا کہ اگر مجھ سے بھی کوئی مدد اس مشہور و معروف پرچے کی ہوسکے تو کروں، لہذا میں نے اپنے دو عزیز دوستوں سے خریداری کی تحریک کی اور دونوں نے قبول فرمائی۔ آپ ان دونوں صاحبوں کے نام بذریعہ وی۔ پی پرچہ روانہ فرما دیجئے۔ انشاء اللہ میں بقیہ دو سے احباب سے بھی خریداری کی ہمت کرونگا۔ تمہارے دوست کرم فرما منشی سکندر لال صاحب۔ سول اینڈ ملیٹری کنٹریکٹر، گلبرگہ سے تحریر فرماتے ہیں، عرض حال پڑھ کے دل پہ سخت چوٹ لگی، جنوری سے میرا نام بھی جسٹر خریداران میں درج کریں۔

بابو رادھا کرشن صاحب نگم نے بھی ایک خریدار عنایت فرمایا ہے اور آئندہ بھی اپنی مخلصانہ عنایتوں کی امید دلائی ہے۔ بعض دیگر احباب نے بھی توجہ فرمائی ہے۔ مگر ہمکو کثیر التعداد اصحاب کے توجہ کی ضرورت ہے۔ خدا کرے قدر شناسان زمانہ جلد ہی اسکے ضروریات کو محسوس فرمائیں۔

اسی سلسلہ میں ہم زمانہ کے قلمی معاونین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور ان قلمی احباب سے، جنکی خدمات کرتے ہیں جو ایک مدت سے، خاموش ہیں، اور جو احباب کہ زمانہ کو سرفراز فرماتے رہتے ہیں وہ پھر اسکو ممنون کرم بنائیں گے۔ جس طرح ہمارے کرم فرما نواب حیدر یار جنگ صاحب طباطبائی نے حال ہی میں ہماری ناچیز کوششوں کی حوصلہ افزائی میں ایک دلچسپ مضمون عنایت فرمایا ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی ایک خط بھیجا ہے جسکا لفظ لفظ محبت و قدر دانی میں ڈوبا ہوا ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

"شفیق، شوق ملاقات و عرض نیاز قبول ہو، زمانہ کے دفتر سے ایک کارڈ طلب مضمون میں نیازمند کے نام آیا، مجھے اپنی کوتاہ دستی و کم فرصتی سے نہایت ندامت ہوئی، کچھ وقت نکالکر چند سطریں لکھی ہیں۔ اگر میرا کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہو تو زمانہ ہی میں شایع کرنے کے لئے۔ اسکا سا وقار اردو کے کسی رسالہ کو حاصل نہیں، جن لوگوں کی نگاہیں اس رسالہ پر پڑتی ہیں وہ بہت نقاد نگاہیں رکھنے والے ہیں"

امید کہ ہمارے دیرینہ احباب جناب شوق۔ جناب چکبست۔ پنڈت رتنشی۔ ڈاکٹر سر اقبال شیخ عبدالقادر حضرت محروم۔ حضرت برق۔ جناب محوی۔ منشی پریم چند وغیرہ بھی حسب سابق رسالہ کی امداد فرماتے رہیں گے۔

سب سے افضل اور پہلی چیز جو پہچانی جاتی ہے وہ ہماری ذات ہے۔ ہم اس دُبدھے میں ہیں کہ ہم ہستی ہیں۔ قائم ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ہستیاں محدود ہیں ہم جیتے اور مرتے ہیں۔ ہمارا خطِ تحتانی چھوٹا ہے۔ ہم محدود ہیں۔ ہمارے چاروں طرف کائنات ہے۔ قدرت ہماری ہستی کو ایک لمحہ میں مٹا سکتی ہے۔ ہمارے حقیر اجسام ایک لمحہ کے اندر ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو تیار ہیں۔ ہم محدود ہیں۔ ہم اس دار الافعال (کرم بھومی) میں کس درجہ لاچار ہیں۔ ہر بار ہماری خواہشات کی پامالی کی جاتی ہے۔ ہم کتنی زیادہ چیزیں کرنی چاہتے ہیں اور کتنی تھوڑی کر سکتے ہیں۔ ہماری خواہشات کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ہم ہر شئے کی خواہش کر سکتے ہیں۔ ہم ہر شئے چاہتے ہیں۔ لیکن ہماری خواہشات کتنی تھوڑی پوری ہوتی ہیں۔ جسم اسکی اجازت نہیں دیتا۔ قدرت ہماری خواہشات کی تکمیل کے خلاف ہے۔ ہم کمزور ہیں۔ پھول۔ خاک کا ذرّہ۔ اور طبعی دُنیا کی حقیقت کیا ہے۔ ہماری ہر ایک خواہش۔ ہمارا ہر ایک خیال۔ ہم سے سوگنا زیادہ سچا ہے۔ ہماری ہستی بھی دُبدھے میں ہے۔ یعنی فنا پذیر بھی ہیں اور غیر فانی بھی۔ ہم سمندر کے موجوں کی مانند ہیں۔ جو سمندر ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ موج کا کوئی جزو ایسا نہیں کہ جسکو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ سمندر ہے۔ سمندر کا اسم جس طرح ہر موج پر چسپاں ہوتا ہے۔ اُسی طرح دوسرے ہر ایک اجزا پر بھی۔ لیکن تو بھی وہ سمندر سے علٰحدہ ہے۔ اسی طرح اس لامحدود بحرِ ہستی میں ہم گو حباب کے مانند ہیں پھر بھی ہم جب اپنی ذات کو پکڑنا چاہتے ہیں تو نہیں پکڑ سکتے۔ اور لامحدود بنجاتے ہیں۔

ہم خواب میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ خواب۔ خواب میں تو صحیح معلوم ہوتے ہیں لیکن جب ہم اُنمیں سے کسی ایک کو پکڑنا چاہتے ہیں تو غائب ہو جاتا ہے۔ کیوں۔ اِسلئے نہیں کہ وہ جھوٹا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ فہم و ادراک کی طاقت گرفت سے علٰحدہ ہے۔ اِس کائنات میں ہر ایک شئے اس درجہ وسیع ہے کہ جسکے مقابلہ میں عقل کوئی چیز نہیں۔ وہ دائرۂ عقل میں نہیں سما سکتی۔ عقل اُسکو پکڑنے کے لئے جو دام بچھاتی ہے وہ اُسپر خندہ زنی کرتی ہے اس سے ہزار گنا زیادہ روح انسانی کا معاملہ ہے۔ یعنی ہماری ذات کا۔ کائنات کا سب سے بڑا راز یہ ہے۔

یہ جملہ موجودات کس درجہ عجیب ہیں۔ انسانی آنکھوں کی طرف ملاحظہ کیجیے۔ کس طرح آسانی سے وہ برباد کی جاسکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی بڑے سے بڑے آفتاب کی ہستی کی تصدیق ہماری آنکھوں سے ہوتی ہے۔ دنیا قائم ہے۔ کیونکہ ہماری آنکھیں اُسکی ہستی کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس راز پر ذرا غور کیجیے۔ ان چھوٹی۔ حقیر۔ آنکھوں کو ایک تیز روشنی اور آلپین۔ برباد کرسکتی ہے۔ لیکن تو بھی نہایت طاقتور برباد کن آلہ (انجن) نہایت زوردار طوفان۔ عجوبۂ روزگار ہستیاں۔ لاکھوں۔ سورج۔ چاند۔ ستارے۔ زمین کے کرہ جات کا وجود اُنکی ہستی پر موقوف ہے۔ کیونکہ اُنکی تصدیق صرف انھیں دو چھوٹی چیزوں سے ممکن ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ قدرت کا وجود ہے۔ اور ہم قدرت کی ہستی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اِسی طرح ہمارے دیگر حواسات کا بھی معاملہ ہے۔

ایک دوسرے پر ممکن کائنات کی عجائبات میں یہ کیا ہے۔ کون کمزور۔ کون شہ زور۔ چھوٹا کیا۔ بڑا کیا۔ اونچا کیا اور نیچا کیا۔ اس جمیع کائنات میں ایک چھوٹے ذرہ کی ضرورت کیا۔ کون چھوٹا ہے اور کون بڑا۔ یہ انکشاف کُنہہ ہے۔ کیوں۔ کیونکہ نہ تو کوئی بڑا ہے اور نہ چھوٹا۔ اِس بحرِ ناپیدا کنار میں تمام چیزیں ایک دوسرے سے گُتھی ہوئی ہیں۔ اُنکی حقیقت وہی لامحدود ہے۔ اور اُسکی سطح پر جو کچھ بھی ہے سوائے لامحدود کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس طرح درخت لامحدود ہے۔ اُسی طرح ہر ایک شئے جو نظر آتی ہے یا محسوس کی جاتی ہے۔ یعنی۔ خاک کا ہر ذرّہ۔ ہر ایک خیال۔ ہر ایک روح اور وہ ہر شے جسکا وجود ہے لامحدود ہے۔ یا یوں کہئے کہ لامحدود محدود ہے اور محدود لامحدود ہے۔ اور ہماری یوں ہی ہستی ہے۔

فی الحال ممکن ہے کہ یہ سب درست ہو۔ لیکن لامحدود کی بابتہ یہ تمام معلومات ناواقفیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم اپنی لامحدودیت کو بھولے ہوئے ہیں۔ جسکو کبھی کوئی بھول نہیں سکتا۔ کون شخص ایسا ہے جو کبھی خیال کرسکتا ہے کہ وہ نیست و نابود کیا جاسکتا ہے۔ کون خیال کرسکتا کہ وہ مرجائیگا۔ کوئی نہیں۔ لامحدودیت کے ساتھ ہمارے تمام کمال تعلقات ہم میں انجان بنکر اس ڈھنگ سے کام کر رہے ہیں کہ جس سے ہم اپنی اصلی ہستی کو بھول جائیں۔ اور یہی جملہ خرابی کا باعث ہے۔

اس عملی زندگی میں روزمرّہ میں چھوٹی چھوٹی چیزیں تکلیف دہ ہوا کرتی ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی

ہستیوں کے پابند ہیں۔ اور اس پریشانی کا یہی باعث ہے۔ کہ ہم اپنی ذات کو محدود اور حقیر ہستی سمجھتے ہیں۔ لیکن تو بھی یہ مان لینا کہ ہم محدود ہستیاں ہیں امر مشکل ہے۔ اِن تمام مصائب اور پریشانی کے درمیان میں مجھکو ایک چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی دائرۂ اعتدال سے گرا سکتی ہے۔ پس میرا یہ فرض ہے کہ میں اپنی ذات کو لامحدود تسلیم کروں سچ تو یوں ہے کہ ہم چاہے جان میں۔ چاہے انجان میں اُسی شئے کے متلاشی ہیں جو لامحدود ہے۔ ہم ہمیشہ اُسی چیز کے متلاشی ہیں جو مطلق العنان ہو۔

پردۂ دنیا پر کسی وقت بھی کوئی ایسی انسانی قوم نہیں رہی جسکا کوئی مذہب نہو۔ اور کسی نہ کسی شکل میں خدا یا دیوتاؤں کی پرستار نہ رہی ہو۔ کسی وقت کسی خدا یا دیوتا کا وجود تھا یا نہیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن اِس اِنسانی روح کا مظہر کیا ہے۔ تمام خلق خدا کسلئے خدا کی متلاشی اور اُسے جاننے کے لئے کوشاں ہے۔ کیوں ہے۔ اس لئے کہ برخلاف اِن تمام پابندیوں کے۔ برخلاف قدرت اور اس خوفناک قانون قدرت کے جو ہم کو پیس رہا ہے۔ اور ہمیں کسی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اُس قانون قدرت کے ہاتھوں جو ہر جگہ موجود ہے۔ ہم متغیر کئے جاتے ہیں تو بھی برخلاف ان تمام مشکلات کے انسانی روح اپنی مطلق العنانی نہیں بھولتی اور ہمیشہ اُسکی متلاشی رہتی ہے۔ تمام مذاہب کی تلاش آزادی کی تلاش ہے۔ چاہے وہ اُسے جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں چاہے اُسے بُرا بتاتے ہوں یا بھلا۔ لیکن خیال تو ہے۔ حقیر سے حقیر انسان جو جاہل مطلق ہے وہ بھی اُسی شئے کا متلاشی ہے جو قانون قدرت پر حاوی ہو۔ وہ کسی دیو۔ بھوت۔ دیوتا۔ یا کسی ایسے وجود کو دیکھنا چاہتا ہے جو قدرت کو زیر کر سکے۔ جسکے لئے قدرت قادرِ مطلق نہو۔ جسکے لئے کوئی قانون نہو۔ چاہے کوئی بھی ہو جو قانون شکنی کر سکے یہی وہ آواز ہے جو ہمیشہ قلبِ انسانی سے نکلتی رہتی ہے۔ ہم ہمیشہ کسی ایسے وجود کی تلاش کیا کرتے ہیں جو قانون شکنی کرتا ہے۔ ایک انجن ریل گاڑیوں میں جُتا ہوا تیزی سے دوڑتا ہوا چلا آتا ہے۔ ایک چھوٹا سا کیڑا رینگ کر اُسکی زد سے بچکر نکل آتا ہے۔ معاً ہم کہہ اُٹھتے ہیں کہ انجن بے جان ہے اور کیڑا جاندار۔ کیونکہ کیڑے نے قانون توڑنے کی کوشش کی۔ انجن باوجود اس طاقت و قوت کے قانون شکنی نہیں کر سکتا۔ وہ اسی لئے بنایا گیا ہے کہ انسان جس طریقہ سے چاہے اُسے چلائے وہ اُسکی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ لیکن کیڑا باوجود یکہ ننھا سا اور چھوٹا ہے

اُسنے قانون شکنی کی اور خطرہ سے محفوظ رہا۔ اُسنے قانون کی مخالفت کرنے کی کوشش کرنے کا ثبوت دیا اُسنے اپنی مطلق العنانی اور آزاد ہونے کا ثبوت دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُسمیں خدائی جلوہ موجود تھا۔

ہر جانب اُسی آزادی کا وجود نظر آرہا ہے جو روحانی ہے۔ ہر مذہب میں وہ خدا یا دیو کی شکل میں عکس افگن ہے۔ مگر اُن لوگوں کے لئے بالائی ہے جو دیوتاؤں کو بالائی شئے سمجھتے ہیں۔ انسان اس خیال میں ہے کہ وہ ناچیز ہے اُسے خوف ہے کہ وہ کبھی آزاد نہو سکے گا۔ پس وہ قدرت کے علاوہ کسی ایسے وجود کا متلاشی ہوا جو مطلق العنان ہو اور ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آیا کہ ایسی بہت سی ہستیاں ہیں اور بالآخر بتدریج اُسنے اُن سبھوں کو ایسے خدا میں مستغرق کر دیا جو خداوند خدا اور حاکم الحاکمین ہے۔ اس سے اُسے گو اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ مگر تاہم کسیقدر سچائی کے نزدیک آیا اور قریب آیا۔ اور رفتہ رفتہ اُسے معلوم ہوا کہ جو کچھ بھی تھا اور ہے کسی نہ کسی ذریعہ اُسے خدا سے تعلق رکھتا ہے جو خداوند خدا اور حاکم الحاکمین ہے۔ حالانکہ اُسنے اپنی ذات کو پابند۔ حقیر۔ اور کمزور تصور کیا تھا۔ تو بھی کسی نہ کسی طرح اپنی ذات کو اُسی خداوند خدا سے متعلق پایا۔ اُسکو کسیقدر بینائی حاصل ہوئی معلومات بڑھی۔ اور آخر کار اُس خدا کے قریب قریب پہونچا جسکا تعلق خدا۔ جملہ دیوتا۔ تمام تغیر پذیر کائنات اور اسی مطلق العنان روح کی تلاش سے ہے۔ جو خود اُسکی اپنی روح کا عکس ہے۔ اور آخر کار اُسے معلوم ہو گیا کہ یہ درست ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ خدا نے انسانی شکل کو اپنا ہم شکل بنایا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ انسان نے خدا کو خود اپنی شکل کا بنایا ہے۔ اِس سے خدائی مطلق العنانی کا دھیان آیا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ خدا کی ہستی ہمیشہ اُسکے اندر ہی نہیں بلکہ نزدیک سے بھی نزدیک ہے۔ جس شئے کو ہمیشہ ہم باہر تلاش کیا کرتے تھے وہ ہمارے دلوں کا بھی دل ہے۔ شاید آپ کو اُس شخص کا قصہ معلوم ہوگا جسنے اپنی قلبی حرکت کی آواز کو غلطی سے یہ تصور کیا کہ کوئی شخص باہر سے دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے اُسنے اُٹھ کر دروازہ کھولا لیکن باہر کوئی نہ تھا۔ مایوس واپس آیا اور پھر دوبارہ اُسے دروازہ کی کھٹ کھٹاہٹ معلوم ہوئی لیکن باہر کوئی بھی نہ تھا۔ اور آخر کار وہ سمجھ گیا کہ یہ میرے دل کی حرکت کی آواز ہے جسکو میں غلطی سے دروازہ کی کھٹ کھٹاہٹ سمجھ رہا تھا۔ اسی طرح بعد تلاش

بسیار انسان سمجھ جاتا ہے کہ وہ لامحدود مطلق العنانی جسے وہ بالائی قدرت کا جامہ پہنا رہا تھا اندرونی معاملہ ہے۔ غیر فانی روح الارواح اور اصلیت خود اُسکی ذات ہے۔

اِسی طرح آخر کار وہ پہچاننے لگتا ہے کہ ہستی کی عجیب و غریب روانگی یعنی محدودیت و لا محدودیت کا مضمون ایک ہی ہے۔ یعنی لامحدود ہستی اور محدود روح ایک ہی ہے۔ اور لامحدودیت اِس طرح دام ادراک میں اُلجھی ہوئی ہے کہ صریحاً دو ہستیوں کی صورت میں نظر آرہی ہے۔ لیکن اصلیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اسلئے صحیح معلومات بھی ہے کہ روح الارواح۔ اصلیت۔ ہمارے اندر ہی موجود ہے جو تغیر پذیر نہیں بلکہ مدام مطلق العنان اور مکمل شادمانی (ستِ۔ چِت۔ آنند) ہے اور صرف یہی ٹھوس زمین یا سبب ہمارے کھڑے ہونے کے قابل ہے۔

پس یہی موت کا اختتام۔ حیات ابدی کی آمد۔ اور جملہ آلام کا خاتمہ ہے۔ اور اُسی شخص کے لئے ہے جو کثرت میں وحدت۔ تغیر پذیر عالم میں لاتغیر پذیری۔ اُسی روح الارواح کو دیکھتا ہے۔ اور دوسرے کسی کو حیات ابدی نہیں حاصل ہو سکتی۔

تمام مصائب اور بربادی کی تہ میں روح روشنی کی ایک ایسی رَو بہو بچاتی ہے جس سے انسان جاگ اُٹھتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ وہ اُسکی ذاتی حقیقت سے کبھی محروم نہیں کیا جا سکتا نہیں کبھی نہیں۔ ہم اُس شئے سے کبھی محروم نہیں رکھے جا سکتے جو واقعی ہماری ہے۔ کون اپنی ہستی کو کھو سکتا ہے۔ کون اپنے قیام وجود کو کھو سکتا ہے؟ اگر میں نیک ہوں تو پہلے وجود زاں بعد نیکی کی رنگینی۔ اگر میں بُرا ہوں تو وجود پہلے۔ زاں بعد برائی کی رنگت۔ اول۔ آخر ہمیشہ۔ وہی ہستی ہے جو کبھی کھو نہیں سکتی بلکہ ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

اِسی وجہ سے سب کو امید رکھنی چاہیے کہ کوئی مر نہیں سکتا۔ کسی کا زوال ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتا۔ یہ دنیا صرف ایک بازیگاہ ہے۔ کھیل چاہے جتنا خطرناک ہو۔ ہمکو چوٹیں لگیں گی۔ ہم گرائے جائیں گے مگر ہماری روح کبھی زخمی نہیں ہوتی۔ یعنی ہم لامحدود ہیں۔

ایک ویدانتی نے کیا خوب گایا ہے (یہ گیت انگریزی ترجمہ کا ترجمہ ہے ورنہ نظم کر دیا جا سکتا تھا)۔ نہ مجھکو خوف ہے نہ شک۔ موت میرے پاس کبھی آنہیں سکتی۔ میرے ماں باپ کبھی نہ تھے۔

میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ میرا دشمن کوئی نہیں کیونکہ میں سب سے ملا ہوا ہوں۔ میں ہستی۔ معلومات اور مکمل شادمانی (ست۔ چت۔ آنند) ہوں۔ میں وہی ہوں۔ میں وہی ہوں۔

ہمارے تمام امراض کا علاج بھی ہے۔ یہی وہ آبِ حیات ہے (امرت) ہے جو موت سے بچاتا ہے۔ ہم یہاں ایسی دنیا میں ہیں جہاں قدرت ہمیشہ ہماری مخالفت پر کمربستہ ہے۔ لیکن مجھے اسکا ورد کرنے دو کہ میں وہی ہوں۔ میں وہی ہوں۔

مجھے نہ خوف ہے۔ نہ شک۔ نہ موت۔ میں نہ مرد ہوں نہ عورت۔ میرے پاس نہ کوئی عقیدہ ہے نہ رنگت۔ مجھے کسی عقیدہ کی ضرورت نہیں۔ کون ایسا فرقہ ہے جسمیں میں شامل ہوں۔ کون فرقہ مجھے قبول کرسکتا ہے۔ میں ہر فرقہ میں ہوں۔

جسم چاہے جتنی سرکشی کرے۔ خیال چاہے جسقدر سرکشی کرے۔ غایت درجہ کی تاریکی میں حد درجہ کی پریشانی میں۔ عذاب میں۔ حد درجہ کی مایوسی میں۔ ایک بار۔ دو بار۔ تین بار۔ یا زیادہ اسکا ورد کرو۔ روشنی چاہے آہستہ آہستہ آئے۔ دھیمی دھیمی آئے۔ لیکن آنی ضرور ہے۔

بارہا میں موت کے منھ میں رہا۔ بھوکا رہا۔ پانوں میں چھالے پڑے ہوئے۔ تھکا ہوا۔ قدم نہیں اُٹھ سکتے تھے۔ کسی درخت کے سایہ میں پڑجاتا۔ جان نکلتی ہوئی معلوم ہوتی۔ طاقت گفتار ندارد۔ حواس باختہ۔ لیکن جوں ہی اُدھر خیال متوجہ ہوتا کہ نہ مجھکو خوف ہے نہ موت۔ نہ کبھی بھوکا تھا نہ پیاسا۔ میں وہی ہوں۔ میں وہی ہوں۔

قدرت کی ساری طاقت مجھے پامال نہیں کرسکتی۔ وہ میری خادمہ ہے۔ اپنی طاقت کا خیال کر کہ تو خداوند خدا اور حاکم الحاکمین ہے۔ اپنی کھوئی ہوئی شان از سرِ نو حاصل کر۔ اُٹھ۔ چل۔ نہ رُک۔ میں اُٹھتا۔ تازہ دم ہوجاتا۔ اور آج میں جیتا جاگتا آپ لوگوں کے روبرو ہوں۔ اسی طرح جب کبھی تاریکی کا سامنا ہو اپنی حقیقت کا خیال کر۔ وہ تمام اشیاء جو مخالفت پر کمربستہ ہیں زائل ہوجائینگی کیونکہ انکی وقعت خواب سے زیادہ نہیں۔ مشکلات کے پہاڑ چاہے جسقدر اونچے ہوں۔ تمام اشیاء چاہے جسقدر بھیانک اور مایوس کن معلوم ہوں پھر بھی وہ صرف مایا (چھلاوہ) ہے۔ اس سے خوف نہ کرو۔ خود بخود غائب ہوجائیگا۔ اُسے پامال کرو۔ کافور ہوجائے گا۔ اُسپر قدم رکھو۔ مرجائیگا۔ خوف نہ کرو۔ اسکا خیال نہ کرو کہ تم کتنی بار ناکامیاب رہے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ وقت لامحدود ہے۔ آگے بڑھو۔

بار بار اپنی ذات کا خیال کرو۔ تندرستی ضرور حاصل ہوگی۔ تم ہر ایک جاں دار سے مدد کی استدعا کرو۔ مگر تمھاری امداد کون کریگا۔ کون کا سبب کیا جس سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ تو اپنی مدد آپ کر۔ اے دوست تیری امداد کوئی نہ کریگا۔ کیونکہ تو ہی اپنا بُرے سے بُرا دشمن اور بھلے سے بھلا دوست ہے۔ اپنی ذات کو سنبھال۔ اُٹھ۔ خوف نہ کر۔ اِن تمام تکالیف اور کمزوریوں کے درمیان سے خود کو نکال باہر کر۔ اولاً چاہے جسقدر کم۔ نامعلوم ہو مگر قوت مردانگی ضرور آئے گی۔ اور تو شیر کی طرح گرج اُٹھیگا کہ میں وہی ہوں۔ میں وہی ہوں۔

میں نہ مرد ہوں نہ عورت۔ نہ دیوتا ہوں نہ دیو۔ میں نہ کسی جانور۔ نہ پودھے۔ نہ درخت کی قسم سے ہوں۔ میں نہ غریب ہوں نہ امیر۔ نہ ہوشیار ہوں نہ جاہل۔ میں چاہے کچھ بھی ہوں۔ مگر اِن جملہ اشیاء کے مقابلہ میں سچ ہوں۔ کیونکہ میں وہی ہوں۔ میں وہی ہوں۔

سورج۔ چاند۔ ستارہ کی طرف نظر کر۔ میں وہی روشنی ہوں جو ان میں جھلک رہی ہے۔ میں آگ کی تمازت ہوں۔ اِس کائنات کا حکمراں میں ہی ہوں۔ کیونکہ میں وہی ہوں میں وہی ہوں۔

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں جو ہوں وہ غلطی پر ہے۔ کیونکہ وہ اُسی کی ذات ہے جسکا نام ہستی ہے۔ سورج متکمن ہے کیونکہ میں اُسکی ہستی کا اقرار کرتا ہوں۔ دنیا قائم ہے۔ کیونکہ میں اُسکی ہستی کو تسلیم کرتا ہوں۔ بغیر میرے اُسکا قیام دشوار ہے۔ کیونکہ۔ میں ہستی۔ معلومات۔ اور مکمل شادمانی (ست۔ چت۔ آنند) ہوں۔ سورج کی طرف غور کرو یہ ہماری نگاہ سے قائم ہے۔ اگر کسی شخص کی آنکھ میں کوئی نقص ہو تو اُسکا اثر سورج پر نہیں پڑتا۔ اُسی طرح میں بھی ہوں۔ میں تمام حواسات (اندریوں) اور ہر شئے کے ذریعہ کام کرتا ہوں مگر جو کام میرے متعلق ہے اُسکی بُرائی بھلائی سے مجھے غرض نہیں۔ کیونکہ میرے لئے کوئی قانون نہیں۔ کوئی فعل (کرم) نہیں قوانین افعال میرے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ میں ہمیشہ تھا۔ ہمیشہ موجود ہوں (اور ہمیشہ رہونگا)

دنیاوی املاک۔ بیوی۔ شوہر۔ بچے۔ اور دیگر اشیاء میں مجھے سچی خوشی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ میں اُس نیلے آسمان کے مانند ہوں جو لامحدود ہے۔ جس پر رنگ برنگے بادل آتے۔ چلتے پھرتے۔ اور چند منٹ جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ اور نیلا آسمان اُسی طرح ہے جس میں تغیر ناممکن ہے۔ خوشی۔ رنج۔ بُرائی۔ بھلائی۔ چند منٹ کے لئے چاہے مجھ پر اپنا اثر

ڈالے - میری ہستی پر پردہ ڈالے - مگر میں پھر بھی وہی ہستی ہوں - وہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں - کیونکر تغیر پذیر اور فانی ہیں - میں چمکتا رہتا ہوں کیونکہ میں نہ تو تغیر پذیر ہوں اور نہ فانی - اگر مصیبت آتی ہے تو میں جانتا ہوں کہ وہ فانی ہے اور ہٹ جائیگی - اگر بُرائی آتی ہے تو میں جانتا ہوں کہ وہ محدود ہے اور چلی جائے گی - میں ہی واحد لامحدود ہوں - مجھے کوئی شے پہونچ نہیں سکتی کیونکہ میں لامحدود - ابدالآباد تک قیام پذیر - اور ناتغیر پذیر ہستی ہوں - ہمارے ایک شاعر نے کیا خوب لکھا ہے -

مجھے اس جام سے پینے دو - یہ جام مجھے اُس ذات تک پہونچائے گا جو فنا پذیر نہیں - اُس شئے تک پہونچائے گا جو تغیر پذیر نہیں - اس بات پر یقین نکرو کہ ہم ہیچ ہیں - ہم محدود ہیں - ہم فنا پذیر ہیں - کیونکہ اسمیں سچائی نہیں ہے -

پہلے اسے سُنو - سوچو - اور خیال کرو - ہاتھ کام میں مشغول رہے اور دل اس وظیفہ میں کہ میں وہی ہوں - میں وہی ہوں - اُسی کا خیال کرو - اُسی کا خواب دیکھو - جب تک وہ ہماری ہڈیوں کی ہڈی اور گوشت کا گوشت نہ بن جاوے - جب تک ہمارے پوشیدہ خواب - چھوٹاپن - کمزوری - افسردگی - اور بُرائی - بالکل معدوم نہوجاوے - اُسوقت پھر تمسے سچائی پوشیدہ نہ رہے گی - اور نہ پوشیدہ رہ سکے گی - اوشانتی - شانتی - شانتی -

پربھودیال مصر - عاشق لکھنوی

کلام مہجور

تم نے منہ پھیر لیا اُسنے بھی منہ پھیر لیا
آئینہ میں کوئی مغرور تماشائی ہے

سزا کے تمنے حشر میں کیوں منہ چھپالیا
کیا جانے کسکو مانگ رہے تھے خدا سے ہم

یہ کیسا تھا اثر یارب نگاہِ یاس بسمل میں
جو سر قدموں پہ تھا اب ہے وہی آغوشِ قاتل میں

تلوّن کا گلہ کیا ہے قصورِ خود فراموشی
جگہ میری مجھی سے کھوگئی ہے اُنکی محفل میں

مہجور دہلوی

ہندوستان میں روزنامچہ نویسی

ابھی خیال ہین بمبئی کے مشہور اخبار ٹائمس آف انڈیا نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ آیا آجکل کے جو انگریز صاحبان ہندوستان مین مقیم ہین وہ روزنامچے لکھتے ہین یا نہین اسپر اسی اخبار مین سر نارائن چندر وارکر صاحب نے خود ہندوستانیون کے متعلق اسی قسم کا سوال اٹھایا ہے آپ نے لکھا ہے کہ بقول سرجان ملکم جو گذشتہ صدی کے آخری حصہ مین احاطہ بمبئی کے گورنر تھے اہل ہند اس باب مین بھی اور باتون کی طرح بالکل رسم و رواج کے غلام ہین معمولی شخص جو کچھ اپنے خاندان یا اعزا یا وقتی تحریکات کے متعلق لکھتے ہین اسپر کوئی زیادہ توجہ نہین کرتا۔ اور جو لوگ علمی قابلیت رکھتے ہین انکا وقت زیادہ تر مقدس مذہبی کتابون کے پڑھنے مین صرف ہوتا ہے اور اگر کبھی کچھ لکھنے کی نوبت آئی تو وہ مذہبی کتابون کی نقل کرتے ہین یا کسی راجہ رئیس کی خوشامدانہ تعریفین لکھتے ہین۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکو اپنے وقت کے واقعات اور کارنامون کو تاریخی حیثیت دینے کا خیال بھی نہین آتا۔

بعض روزنامچے پونا مین ضرور برآمد ہوے ہین لیکن انمین مالگذاری کے تحصیل وصول کی تفصیل کے سوا اور کوئی ذکر نہین ہے۔ جن مرہٹہ کھبارون کی مسٹر پرائس اور مسٹر کنکیڈ نے تفتیش کی ہے، انسے کچھ اہم حالات ضرور برآمد ہوئے ہین لیکن اصولاً سرجان ملکم کا خیال درست ہے۔ کیونکہ گذشتہ صدی کے نامورون ہند مثلاً دادا بھائی نوروجی جسٹس رانا ڈے سر فیروز شاہ مہتا مسٹر تلنگ، وید یاساگر، راجندر لال متر، کرسٹو داس پال، سرٹی مادھو راؤ۔ دیوان بہادر رگھوناتھ راؤ وغیرہ مین سے کسی نے اپنے وقت کا کوئی روزنامچہ اپنی یادگار نہین چھوڑا۔ ان بزرگان ملک کے کوئی روزنامچے نہین تھے اور انکے بعد بھی اس فن کی طرف کسی صاحب نے

توجہ نہین کی۔ سرنارائن چندرورار کرنے اکثر اصحاب کی توجہ اسطرف مبذول کی لیکن روزنامچون کی اہمیت کے اعتراف کے سوائے کوئی عملی نتیجہ نہ نکلا۔

درحقیقت ہندوستانی اپنے اپنے گردوپیش حالات کے روزنامچے لکھکر ملکی مفاد کو اہم نقصان پہونچا رہے ہین چنانچہ ایک مرتبہ ہندو یونین کلب بمبئی مین مسٹر جسٹس تلنگ نے یہ تذکرہ کیا کہ اُن تمام ہندوستانی راجگان و رہنمایان ملک کو جو ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار قیصر ہند مین شریک ہوئے تھے بہت سے دلکش اور نتیجہ خیز واقعات معلوم ہین جنکا کسی اخبار یا تاریخ مین کوئی تذکرہ موجود نہین ہے حالانکہ اُسمین سے اکثر سے جو گفتگو مین نے کی ہے اُس سے مین کہہ سکتا ہون کہ یہ حالات اور تذکرے آیندہ مورخ کے لیے بہت ہی مفید اور دلچسپ ثابت ہونگے لیکن یہ سب مسالہ سینہ ہی مین بند رہکر بالکل ضایع ہو جائے گا کیونکہ روزنامچے لکھنے کی ہندوستانیون کی عادت نہین کہ یہ سب باتین اور واقعات قلمبند ہو جائیں۔ سرنارائن چندرورار کرنے اس واقعہ کے چند سال بعد خود مسٹر تلنگ سے اس گفتگو کی یاد دلاکر دریافت کیا کہ کیا آپ اپنا روزنامچہ لکھتے ہین۔ مگر اُنھون نے نفی مین جواب دیا۔ مسٹر تلنگ کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد سرنارائن موصوف نے سرفیروزشاہ مہتا سے ذکر کیا کہ مین مسٹر تلنگ کی سوانحعمری لکھنا چاہتا ہون۔ کر آپکے پاس اُنکے جو خطوط ہون اُنھین عنایت فرمایئے۔ اسی سلسلہ مین سرنارائن نے انسے یہ بھی پوچھا کہ کیا آپ کوئی روزنامچہ لکھتے ہین یا نہین۔ سرفیروزشاہ نے اسکا جواب عجیب وغریب دیا۔ آپنے فرمایا کہ کیا تمکو اس بارے مین یارک ٹومین کا قول معلوم ہے اُسنے ایک سال تک اپنا روزنامچہ لکھا۔ لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہ لکھ سکا کہ مین صبح کو اُٹھا غسل کیا، کھانا کھایا اور سو رہا۔

سرنارائن لکھتے ہین کہ مئی ۱۸۹۴ء مین اسی قسم کی گفتگو مین نے جسٹس رانا ڈے سے کی۔ اُنھون نے یہ جواب دیا کہ مین بھی روزنامچہ نہین لکھتا، مین نے پوچھا کیا آپنے کبھی اسکی کوشش کی ہے؟ اور کیا آپنے کبھی اس بات کا خیال کیا ہے کہ آپ جیسے بیدار مغز رہنما جو ملکی حالات کا مشاہدہ اور ملکی مسائل پر غور کرتے رہتے ہین روزانہ اپنے حالات لکھا کرین تو آیندہ مورخ کے لیے کیسا قیمتی مسالہ چھوڑ جائین۔ اسپر اُنھون نے ارشاد فرمایا کہ جب مین

روزنامچہ لکھنے بیٹھتا ہون تو ایک مضمون تیار ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ مین روزنامچہ نویسی کی قابلیت ہی نہین ہے۔ اسپر مین نے عرض کیا کہ انھین معمولی چیزون سے انگریزون نے تاریخون کے انبار تیار کر لیے ہین۔ جسٹس رانا ڈے نے اس بات کو تسلیم کیا اور کہا کہ ابھی ہملوگون کو یہ بات انگریزون سے سیکھنا باقی ہے

ڈاکٹر راجندر لال متر اپنے وقت کے مشہور و معروف مصنف تھے، انکو قدیم تاریخی حالات کی تحقیق و تفتیش کا بہت شوق تھا اور اس بارے مین وہ ڈاکٹر کرسٹو داس پال کے دست راست تھے۔ یہ انھین کی ذات تھی جسکی بدولت "ہندو پیٹریٹ" نامی (اخبار) کو ہندوستانی اخبارون کی صف مین ایک ممتاز جگہ ملی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف انگریزی کے ایک ممتاز انشا پرداز تھے اور اپنے حسن بیان اور مذاق سلیم کے لیے مشہور تھے۔ انکی گفتگو ہمیشہ پُر از معلومات ہوا کرتی ہے۔ ایک موقع پر ہوا خوری کے دوران مین انھون نے سرنارائن سے بہت سے دلچسپ مسئل اور سیاسی واقعات بتائے۔ سلسلہ سخن سے کچھ ایسا مترشح ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنا روزنامچہ پڑھ رہے ہین۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ بھی اپنا روزنامچہ نہین لکھتے۔ سرنارائن نے جب اسپر زور دیا اور انگریزون کی مثال پیش کی تو آپ نے کہا کہ "ہم مین اور انگریزون مین بڑا فرق ہے۔ ایک انگریز کی زندگی خانگی اور خارجی دونون حیثیتون سے ایک مستقل جد وجہد کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہمارے لیے ہماری زندگی ورڈس ورتھ کے قول کے بموجب ایک خواب بیخبری ہے انگریز روزنامچے لکھتے ہین اور ہم تن بہ تقدیر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہین۔ بنگال کے نامور پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر سے بھی سرنارائن چندر وارکر نے ۱۸۸۶ء مین ملاقات کی تھی، اور اس ملاقات کا حال آپنے اخبارات مین بھی شایع کرا دیا تھا۔ پنڈت ودیا ساگر صاحب نے اپنے روزنامچہ نہ لکھنے کی ایک دوسری وجہ بتلائی "وہ ہندوستان کے آیندہ عظمت و عروج کی بابت بہت ہی مایوس تھے اور کہتے تھے کہ ایسے مورخین کے لیے جنکو تاریخ مین ایک بھی زرین ورق نہ مل سکے، کوئی روزنامچہ چھوڑنا فضول ہے۔

روزنامچون کی اہمیت کے متعلق سرنارائن چندر وارکر صاحب نے اپنے ذاتی تجربہ پر ایک سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے کہ "چند سال ہوئے آپ کو پونا کے ایک دیوانی مقدمہ کی اپیل

جسٹس مٹی کے ساتھ سننے کا اتفاق ہوا۔ جہان آپ کو ایک مفصل روزنامچہ دیکھنے کو ملا جسکو ایک چہاردہ سالہ برہمن لڑکے نے لکھا تھا۔ مقدمہ کی بنیاد ایک خانگی نزاع سے شروع ہوئی تھی جو ایک وصیت کی بابت تھا۔ زبانی گواہیان ایک دوسرے کے خلاف تھین اور جج صاحبان صاف طور سے اسپر کوئی رائے قائم نہ کر سکتے تھے۔ اس اثنا مین ایک نوعمر لڑکا شہادت کے لیے پیش ہوا یہ گواہی دیتے وقت بار بار اپنی جیب کی طرف دیکھتا تھا اسپر عدالت نے اُس سے دریافت کیا کہ تم بات کا جواب دینے سے پہلے اپنی جیب کی طرف کیون دیکھتے ہو، اسکا جواب ملا کہ مین اپنے روزنامچہ کی طرف دیکھتا ہون، اسپر عدالت نے اسکا روزنامچہ طلب کیا اور دیکھا تو اُسمین تمام جھگڑے جو گھر مین ہوئے تھے نہایت ہی وضاحت و تفصیل کے ساتھ انگریزی اور مرہٹی زبان مین لکھے ہوئے تھے۔ اس روزنامچہ کی بدولت مقدمہ کی اصلی کیفیت عدالت پر آئینہ ہوگئی گو اس سے اس لڑکے کو نقصان پہونچا کیونکہ وہ خود وصیت کی رو سے جائداد کا دعویدار تھا۔ سوال یہ تھا کہ لڑکے کے سوتیلے باپ پر لڑکے کے اصلی باپ کی طرف سے وصیت نامہ لکھتے وقت کوئی ناجائز دباؤ تو نہین ڈالا گیا تھا۔ لڑکا عدالت ابتدائی مین ہار گیا لیکن جج نے اس کے روزنامچہ کی بڑی تعریف کی۔ جب ہائی کورٹ مین اپیل آئی تو سر نارائن کے سامنے پیش ہوئی اور صاحب موصوف نے روزنامچہ کو خود بغور معائنہ فرمایا۔ اسکا بیان ہے کہ یہ روزنامچہ بجائے خود ایک دلچسپ افسانہ تھا جسمین ایک ہندو گھر کی روزمرہ زندگی اور تمام خانگی حالات کا مفصل ذکر تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑکے نے انگریزی کے نامور شاعر براؤننگ سے یہ سبق حاصل کیا تھا کہ ہمکو نہ صرف اپنی معمولی زندگی ہی سے سبق لینا چاہیے بلکہ ایک خاص گھر کے روزانہ معاملات اور تجربات سے بھی سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اس بنا پر لڑکے کو کامیاب ہونا چاہیے تھا لیکن اسکے روزنامچہ نے خود اسکے مقدمہ کا فیصلہ کر دیا تھا۔ سر نارائن چندرواکر کا خیال ہے کہ اس لڑکے کو ہندوستان کا مشہور روزنامچہ نویس ہونا چاہیے۔ گو اس صفت کی بدولت اسکو سخت مالی خسارہ ہوا۔

سر نارائن چندرواکر کے مضمون سے یہ تو بخوبی ثابت ہے کہ وہ روزنامچہ نویسی کی اہمیت کے پورے طور پر قائل ہین لیکن یہ سوال دریافت طلب رہجاتا ہے کہ وہ خود بھی اپنا

روزنامچہ لکھتے ہیں یا نہیں۔ موصوف اسوقت ہندوستانی لیڈران کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ انکا روزنامچہ بہت ہی سبق آموز ہوگا۔ لیکن روزنامچہ لکھنے کی عادت بشرطیکہ اسکو صحیح طریقہ پر ترقی دی جائے۔ ملک کے تاریخ اور ادب دونوں کے لیے ایک قابل قدر سرمایہ بہم پہونچا سکتی ہے۔ جو بات آج بالکل غیر معمولی اور غیر دلچسپ ہے وہ سو یا دو سو سال بعد غیر معمولی اہمیت اختیار کرلیگی۔ کاش ہمارے ہموطن ادھر متوجہ ہوں۔

عالی لکھنوی

مقالات حکمت

انسان دوسروں کی خدمت کے لئے ہے، نہ اس لئے کہ دوسرے اُسکی خدمت کریں۔

اسوقت دنیا کو جس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ غیر محسوس طریقہ ترقی فنا ہوچکا، اب ایک محسوس طریقہ کی ضرورت ہے۔

اکثر اوقات انسان خیال کرتا ہے کہ ابتدائی ایمان اب تک مجھ میں موجود ہے، حالانکہ اُسکا ایک ذرّہ بھی باقی نہیں ہوتا۔

ایمان، زندگی کی طاقت ہے۔

ایمان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ زندگی کی اُس حقیقت کو بتائے، جسکو موت کی حقیقت نہیں زائل کرسکتی۔

اگر انسان کمال حاصل کرنے کی کوشش کرے، تو اُسے کبھی رکاوٹیں نہیں پیش آسکتیں۔

میرا خیال ہے کہ حیات بعد الموت میں بھی انسان حصول کمال کی کوشش کرتا رہیگا۔

شخصی، حصول کمال کی کوشش میں زندگی کی تمام حقیقت اور خوشی پنہاں ہے۔

روحانی زندگی کے لوازم ہمکو عطا کئے گئے ہیں۔ اُسکے بعد ہمکو اختیار دیا گیا ہے کہ اُنکو جیسے چاہیں، استعمال کریں۔

اس سے زیادہ مفرت رساں اور کوئی تعلیم نہیں ہوسکتی کہ "انسان اپنی کوشش سے درجۂ کمال تک نہیں پہونچ سکتا۔"

اگر کوئی شخص سمجھ لے کہ میں اپنے فرض کو انجام نہیں دے سکتا تو وہ فی الواقع اُس سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

حقیقت، کوشش کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے نہیں معلوم ہوسکتی۔

سب سے ارفع، اعلیٰ، اور صحیح بات، جسکو انسان دیکھ سکتا ہے اور جسپر غور کرسکتا ہے، وہی اُسکے لئے حقیقت ہے۔

حیات انسانی کی فطرت ایسی ہے کہ کوئی شخص پوری حقیقت پر کبھی بھی مطلع ہوسکتا، بلکہ رفتہ رفتہ اس حد تک پہونچ سکتا ہے۔

ہم چاہیں یا نہ چاہیں، حقیقت، وجود و ثبوت کی بندشوں سے آزاد رہکر ہمارے دلمیں جگہ نہیں پاسکتی۔

فلسفہ اور سائنس کے سمجھنے کے لئے پڑھنے اور تیاری کی ضرورت ہے۔ لیکن مذہب کے سمجھنے کے لئے انمیں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

عالی لکھنوی

ٹائر ۱۰ اب

ڈیانہ کا مندر

حضرت مسیحؑ سے چھ سو برس قبل جبکہ خطۂ یونان بُت پرستی کے عمیق ترین سمندروں میں غوطے کھا رہا تھا۔ اِنکی بارہ مشہور دیبیوں میں ایک ڈیانہ بھی تھی جسکی پرستش اہل روما کیا کرتے تھے۔

ڈیانہ کے معنی چاند کے ہیں جو یونانی لغت سے تعلق رکھتا ہے۔ اکثر مورخ نے اسے تین نام والی دیبی بھی کہا ہے۔

دراصل (یونانیوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے) اسکے تین نام ہیں (ا) لونا جو آسمان پر مروج ہے۔ (ب) ڈیانہ جو روئے زمین کے لئے مخصوص ہے (ج) ہیکیٹ دوخ (مراد زیر زمین) میں بولا جاتا ہے۔

رُومیوں نے اسکا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ ایک حسینہ جوانی کی اُمنگوں میں مست ایک ہاتھ میں تیر دوسرے میں کمان لئے ہوئے مشغول شکار ہے۔ کاندھے پر ترکش ہے۔ اور مدد کی غرض سے چند شکاری کتے بھی ہمراہ ہیں۔ جبین ناز پر ہلال نما ستارہ روشن ہے جسکی روشنی اسکے دلفریب حسن میں چار چاند لگا رہی ہے۔ پنڈلیاں کسیقدر کھلی ہوئی ہیں اور پانوں میں شکاری جوتہ ہے۔

اِس نقشہ کی تصدیق اِس بُت سے ہوتی ہے جو رومۃ الکبریٰ کے عجائب خانہ میں لایا گیا ہے جس پر بخط یونانی "مقدس ڈیانہ دیبی کابت" کندہ ہے۔ یہ بُت خالص سنگ مرمر کا ہے اور اسکی شکل و شمایل بھی اسی نقشہ سے ملتی جلتی ہے۔ کاندھے پر ترکش کا داغ بھی ہے۔ مگر دونوں ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ یہ گمان غالب ہے کہ ایک ہاتھ میں تیر اور دوسرے میں کمان ضرور ہوگی۔

رُومیوں نے ڈیانہ کی خیالی تصویر مختلف صورتوں میں کھینچی ہے۔ مثلاً

اکثر نے ڈیانہ کو ایک نوخیز جمیلہ سے مشابہت دی ہے جسکے سینہ پر بارہ برجوں کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ یعنی اسکو بارہ موسموں پر پورا قبضہ ہے۔

دیگر قدیم مصوروں نے اپنا زورِ قلم اس طرح دکھایا ہے کہ ایک کمسن عورت کے بارہ پستان ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نوجوان دیبی (ڈیانہ) کو کرۂ ارض سے مادرانہ شفقت ہے۔ واللہ اعلم۔

شہر سمرنا سے ۳۸ میل جنوب جو گردش فلک کے ہاتھوں ہزاروں بار بن بن کر بگڑا اور بگڑ بگڑ کر بنا ہے) شہر ایمفیسس واقع تھا۔ جسے ایک زندہ دل شاعر کی زبان سے "چشم ایشیا" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ وہی شہر تھا جسے کبھی ایشیا کوچک کے باشندے اپنا دل و جان سمجھتے تھے۔ جہاں بار برداری کے جہازات دنیا کے ہر حصوں سے آیا کرتے تھے۔ گویا یہ ایشیا کی تجارت کی منڈی تھی۔ مگر آج ویران و سنسان پڑا ہے۔ جہاں عالیشان عمارتیں تھیں وہاں مٹی کے ڈھیر ہیں۔ اور جہاں بنی آدم کی بستی تھی وہاں درندے اور خوفناک جانور رہا کرتے ہیں۔ سچ ہے۔

؎ بیک حصہ بیک ساعت بیک دم دگرگوں میشود احوال عالم

مورخین اس نقطہ پر مختلف الرائے ہیں کہ اس ایشیا کی جان اور تہذیب کی کان کا بانی کون تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ایمفیسس وہیں کا باشندہ اس شہر کا بانی تھا۔ مگر دوسری روایتوں سے یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ امیزن نے ہرقل کے خوف سے بھاگ کر ڈیانہ کو اپنا پشت پناہ بنایا اور اس شہر کی بنیاد رکھی۔ ان دو روایتوں میں اول الذکر قرین قیاس ہے۔

ایک معتبر مورخ جو اسی زمانہ میں گذرا ہے رقم طراز ہے کہ پہلے بحر روم کے جزائر کے باشندے وہاں آکر آباد ہوئے اور ڈیانہ دیبی کا آبنوسی بت تیار کر کے پرستش کرنے لگے۔

شاہ ٹولیس نے جو عیسیٰ علیہ السلام سے چار سو برس قبل گذرا ہے ایک عالیشان عمارت اس بت کے واسطے تعمیر کرائی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ یہ عمارت جلکر خاکستر ہوگئی۔

یونانیوں نے پھر کمر ہمت باندھکر ایک عمارت بنوائی جسکے سامنے پہلی عمارت ہیچ تھی اور اس طرح یونانیوں کی یاد کا زخم جو ناسور ہو چلا تھا بھر آیا۔ ۳۵۰ برس قبل (مسیح کے) اس عمارت میں آگ لگی۔ اور آگ اُسوقت تک نہ بجھی جب تک کہ ساری عمارت جلکر خاک کی ڈھیر نہ ہوگئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ دنیا کا بیشل حکیم سقراط اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پی کر اس عالم فانی سے رخصت ہوا۔

تیسری بار پھر اُس شجر میں ثمر لگے جسمیں ثمر لگنا تو درکنار سرسبز ہونے کی بھی امید مٹ چکی تھی۔

یعنی یہ عمارت پھر بنی - خدا کی قدرت اس دفعہ بھی اس مقدس مندر کو آگ ہی کے ہاتھوں تخت و تاراج ہونا تھا - یہ واقعہ اُس شب کا ہے جس رات کو مقدونیہ میں سکندر کی پیدائش پر خوشی کے شادیانے بج رہے تھے - اس بات پر ہر مورخ متفق الرائے ہے کہ اس دفعہ آگ حکیم طراطیس نے لگائی تھی جو عوام الناس میں "پاگل سقراط" کے نام سے مشہور تھا -

حکیم طراطیس نے یہ منصوبہ گانٹھ کر مندر میں آگ لگائی تھی کہ گو لوگ مجھے اس جرم پر سخت سے سخت سزا کا مستحق سمجھیں گے اور میرا نام تواریخ عالم میں جلی قلم سے لکھا جائیگا اور ہوا بھی یہی - ورنہ آج طراطیس کو کون جانتا - ع بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا - ۳۵ برس تک مندر یونہی منہدم اور ویران پڑا رہا - اس دفعہ معتقدین کی کمر ہمت ٹوٹ گئی - سکندر اعظم نے اس شرط پر مندر بنوانے کا وعدہ کیا کہ اُسکا نام دروازہ پر کندہ ہو - جو نامنظور ہوا اور مندر کا وہ حصہ جو آگ کے دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا فروخت کر دیا گیا -

اب یونانیوں نے اس حادثہ کی خبر تمام ایشیا میں مشتہر کر کے چندہ کی درخواست کی - کہتے ہیں کہ مرد تو مرد عورتوں نے اس امر سے اسقدر دلچسپی لی کہ اپنے اپنے زیورات اُتار کر حوالے کر دیئے - غرض پھر ایک کثیر رقم سے عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا -

یہ عمارت شہر اور بندرگاہ کے درمیان ایک پہاڑ کے دامن میں بنائی گئی تھی، پاس ہی ایک دلدل تھی جسکے نزدیک ایک عالیشان عمارت کا بنانا پُرخطر تھا - اسلئے اُس زمانہ کے مشہور صنّاع کرسی خورم کی رائے سے عمارت کی بنیاد اس طرح رکھی گئی جیسا کہ مورخ پلائینی لکھتا ہے -

اسکی بنیاد میں اوّل ایک تہ کوئلوں کی جما کر کوٹ دی گئی اور اسپر اُون کی ایک تہ رکھ کر سنگہائے بنیاد رکھے گئے - پرکسی ٹیلس نے قرباں گاہ بنا کر اپنی سنگ تراشی کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا - اسی طرح کوئیپس نے ایک ستون پر پچکاری کر کے خراج تحسین وصول کیا - مگر افسوس کہ عمارت کو پھر تباہ و برباد ہونا تھا - چنانچہ قوم گاتھ نے اسکے قیمتی اشیا لوٹ کر عمارت کو آگ کی بھٹی کا ایندھن بنا دیا -

۲۶۲ء میں سیاح لارڈ پاوری پوتوگ نامی ڈیانہ دیبی کا مندر دیکھنے کی غرض سے ایشیا کوچک آیا - وہ لکھتا ہے "ڈیانہ دیبی کا مندر جو دنیا میں شہرۂ آفاق ہے - پہاڑ اور جھیل کے درمیان

واقع تھا۔ نہایت غور کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مندر کے گرد وسیع احاطے چھوڑے گئے تھے جس میں غلام گردش بنائی گئی تھی۔ مندر کا دروازہ مشرق رویہ تھا۔ شرقی حصہ میں ۱۵ فیٹ لمبے ۳ ستون کے ٹکڑے ہیں جنمیں ایک خاکی سنگ مرمر کا ہے۔ جا بجا سنگ مرمر کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مندر خالص سنگ مرمر سے تعمیر کرایا گیا تھا۔

اسی طرح انیسویں ۱۹ صدی عیسوی کا انگریزی سیاح مسٹر اسٹیفن لکھتا ہے کہ وہ جگہ جہاں ڈبانہ دیبی کا مندر واقع تھا۔ وہاں اب خاک اڑ رہی ہے۔ اُلو بول رہے ہیں۔ پہاڑ خونخوار درندوں کا آشیانہ بنا ہوا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ میں نے ہر چند تلاش کی کہ وہ جگہیں کہاں ہیں جہاں یونانیوں نے تھیٹر بنوائے تھے۔ دنگل گھر تعمیر ہوا تھا۔ حوض بنے تھے۔ مگر کسیکا کچھ نشان نہیں ملا۔

تخت والوں کا پتہ دیتے ہیں تختے گور کے — کھوج ملتا ہے یہیں تک بعد ازاں کچھ بھی نہیں

غرض دنیا کی وہ عالیشان عمارت جسکو "ہفت عجائبات" عالم میں جگہ دیتے ہیں۔ زمانہ کی گردش سے یوں ملیامیٹ ہوگئی کہ نشان تک باقی نہیں۔ آہ۔ اے چرخ کج رفتار کوئی تجھ سے بقا کی کیا امید کر سکتا ہے۔ جبکہ تو نے اُس مستحکم چیز کو جسکی استواری پر ایک عالم کو بھروسہ تھا یوں نیست و نابود کر دیا

نصیر بھاگلپوری

جذبات احسن

غنیمت تھا سر شوریدہ بھی وحشت کے ساماں میں — خیال آیا تو رخنے کر دیئے دیوار زنداں میں
عجب وحشت برستی ہے مرے پہلوئے ویراں میں — کبھی رہتا تھا شاید کوئی وحشی اس بیاباں میں
قفس میں آکے ایسی خود فراموشی ہوئی طاری — بس اتنا یاد ہے اپنا نشیمن تھا گلستاں میں
دعائیں دیں اجل کو جاگنے والے شب غم کے — کہ اب سوتے ہیں کس آرام سے گور غریباں میں
نہ پوچھو مجھ سے روداد اسیری مختصر یہ ہے — اجل آئی تھی پیغام رہائی لے کے زنداں میں
کیا منہ بند اُسنے اس طرح فریاد محشر کا — مری یاد اُنکو کیوں لے آئی تھی گور غریباں میں

کہیں انکوں سے اے احسن نہ پردہ فاش کر دینا
چھپی بیٹھی ہے اک صورت عجاب راز پنہاں میں

احسن سہسی

باغ جہان آرا

مین

پھولوں کی نمایش

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

حضرت اجمیر کے کئی عرس ناغہ ہوئے - مگر امسال خواجہ بزرگ کے جذب پاک نے فقیر کو کھینچا ۲۲ فروری ۱۹۲۲ء کو دہلی سے ڈاک گاڑی میں سوار ہوکر ۲۳ فروری کو ۹ بجے دن کے دار الخیر اجمیر میں پہونچ گیا اور حسب معمول متولی صاحب کی قدیم حویلی پر حاضر ہوا فقیر برسوں سے اسی حویلی میں فروکش ہوتا ہے - صاحب خانہ سید ظہور الحسن عرف عیدو میاں ہمہ تن اخلاق مجھ ناچیز کو اپنے خاص مسکن میں ٹھہراتے اور دن رات خاطر تواضع فرماتے ہیں - حویلی میں گھستے ہی دل نے وحشت کی لی میں نے کہا خدا خیر کرے - بالاخانہ پر پہونچکر اُنکے فرزند ارجمند سید نور الحسن صاحب سے نیاز حاصل ہوا - اُنکا چہرہ اُداس دیکھ کر دل بے تاب ہوگیا - میں نے گذارش کی حضرت کیا حال ہے فرمایا والد ماجد نے پرسوں دار فنا کو چھوڑ کر عالم بقاء کی طرف رحلت کی - ؎

چہ می پرسی زمن حال دل غم دیدہ ام چوں شد دلم شد خون و خون شد آب و آب دیدہ بیروں شد

اس بات کو سنکر سخت رنج و ملال ہوا - کیونکہ اجمیر شریف میں میرا اُن سے زیادہ کوئی شفیق و قدردان نہ تھا - مین نے رخت سفر کھول ڈالا - نہا دھو کر خواجہ بزرگ کی خانقاہ میں حاضر ہوا فاتحہ پڑھی - اور دل میں جو کئی برس کی کدورتیں بھری ہوئی تھیں وہ آن کی آن میں رفع ہوگئیں - ایسے تو اجمیر میں سیکڑوں ہی ملنے والے ہیں مگر بابو عبد الکریم خاں صاحب اکبر آبادی میرے ایک مخلص دوست ہیں چونکہ فقیر برسوں اجمیر میں رہا ہے اسلئے علاج معالجہ کی ضرورت سے بابو جی لڑکپن سے میرے پاس آتے جاتے رہے ہیں - اُنکا بیاہ بھی میرے سامنے ہوا - اب خدا رکھے بچوں والے ہیں مگر میں انھیں اب بھی بچہ ہی سمجھتا ہوں - بڑے بردبار حلیم الطبع - مگر ان میں ہنسنے کی ایک خاص ادا ہے پہلے ہنسیں

پیچھے بات۔ اور پھر اس مزہ کی ہنسی کہ اپنے ساتھ مجھ پتھر کو بھی ہنسا دینا۔ مجھے انکا ہنسنا بہت پسند ہے۔ بابو صاحب کو جب ہنسی آجاتی ہے تو معاذ اللہ دریا چڑھکر اُتر جائے۔ ابر برس کر تھم جائے۔ مگر انکی ہنسی نہیں تھمتی اور کسی طرح نہیں تھمتی۔ میں مُردہ دل ہنسنا بھول گیا ہوں۔ مگر جب اجمیر آتا ہوں تو انکو ہنستا دیکھ کر خیال کرتا ہوں کہ گویا میں ہنس رہا ہوں۔ اجمیر پہونچکر انکو اپنے آنے کی اطلاع کرنی ضرور تھی۔ بابو جی نے پہلا مکان چھوڑ دیا ہے اور دوسری جگہ اُٹھ گئے ہیں۔ اسلئے حضرت کا گھر مشکل سے ملا۔ خود بدولت کہیں گئے ہوئے تھے۔ مولوی عبدالعلیم صاحب انکے چھوٹے بھائی ملے وہ مجھے مکان میں لے گئے۔ جو بابو صاحب بھی تشریف لے آئے۔ گلے ملے اور ملاقات سے دل شاد ہو گئے۔ بابو جی ایک بزرگ کامل کے دیکھنے والے ہیں اسلئے اِنمیں جوہر عشق اثر کر گیا ہے۔ ایک نازنین کی خلخال اور گھنگرو کی آواز اِنکے لئے اَلَستُ بربکم کی صدا ہے۔ اور ایک دلربا کا بھولا اور گورہ چہرہ اِنکی نظر میں قرآن ناطق ہے۔ دوسری بات جو اُنھوں نے مجھ سے کی وہ یہ تھی کہ پرسوں ۲۵ فروری شنبہ کے دن دولت باغ میں پھولوں کی نمائش ہے سرِ شام چلئے اور سیر کیجئے۔ اجمیر شریف کے دلی دروازہ سے باہر شمال کی طرف کوئی چار فرلانگ کے فاصلہ پر ایک باغ دلکشا شاہجہاں بادشاہ ہندوستان کی دختر فرخندہ اختر جہان آرا بیگم صاحبہ نے ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۷ عیسوی میں بنایا ہے۔ باغ کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آنا ساگر کے کنارہ پر کئی ہزار فٹ لمبی ایک مستحکم فصیل بنا کر اُتنا ہی لمبا ایک چبوترہ تیار کیا ہے۔ اور اس چبوترہ کے اوپر موقع بموقع سنگ مرمر کی بارہ دریاں اور ایوان مرتب کئے ہیں جنکے دیکھنے سے آدمی کو جنت الفردوس کے قصر و ایوان یاد آجاتے ہیں۔ اِن طلسماتی مکانات کے نیچے آنا ساگر کا پانی موجیں مارتا ہے اور انکا سفید عکس جب پانی میں پڑتا ہے تو بس یہی گمان ہوتا ہے کہ حورانِ بہشتی حوضِ کوثر کے آئینہ میں اپنا جمال دیکھ رہی ہیں۔ اِن عمارتوں کے سامنے باغ ہے۔ خیاباں چمن کیاریاں روشیں پگڈنڈیاں حوض آبشار جلوہ دیتے ہیں کہیں موزائچے ہیں کسی تختہ میں سرو و شمشاد پرفاختہ اور قمریاں نعرۂ جاں سوز کھینچتی ہیں۔ کہیں پپیہا کہیں بی کوئل اپنے نالوں اور شیوں سے عاشقوں کے کلیجہ چھلاتی ہیں۔ وجعلنا فیھا جنات من نخیل واعناب وفجرنا من العیون لیاکلوا من ثمرہ۔ میں نے کہا بابو جی باغ جہان آرا ہمارے آپ کے لئے کوئی نئی جگہ نہیں ہے اُسکی بارہا سیر کی ہے۔ نمائش نہ دیکھی نہ دیکھی۔ بابو صاحب نے فرمایا نہیں جناب یہ موقع قابلِ دید ہے آپ کو چلنا پڑیگا اور ضرور چلنا پڑیگا۔ میں نے کہا خواجہ کا عُرس کیا پھولوں کی نمائش سے کم ہے تم تو آنکھیں

رکھتے ہو۔ خواجہ کی خانقاہ میں وہ وہ لالہ و گل دکھائی دیتے ہیں جنکے آگے باغ جہاں آرا کی بہار۔ خزاں سے بھی کمتر ہے۔ مگر بابو صاحب کا زور شباب مجھے کھینچکر باغ جہان آرا میں لے گیا۔ بادشاہی زمانہ میں تو سبحان اللہ اس باغ کا کچھ اور ہی عالم ہوگا۔ مگر جب سے انگریزی سلیقے نے اسے آراستہ و پیراستہ کیا ہے تو اسمیں کچھ اور ہی رونق پیدا ہوگئی ہے۔ اور خاصکر ۲۵ فروری کو اسکا نظارہ طرفہ تر تھا۔ جب ہم دونوں نمائش کے بہارستان میں پہونچے تو میں نے دیکھا مثلث مربع مثمن مدور مستطیل عریض مختلف شکلوں میں چمن بنائے ہیں۔ ایک چمن سے دوسرے چمن تک صاف روشیں ہیں۔ کیاریوں میں رنگارنگ پھولوں کے درخت اُگ رہے ہیں اور ہر درخت پھولوں سے لدرہا ہے۔ روشوں کے حاشیہ پر زینہ بزینہ پایہ بپایہ گملے سجائے ہیں اور انھیں ایسا موزوں کرکے رکھا ہے کہ سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اِن گملوں سے نیچے ایک خوش نما سائبان سفید کپڑے کا رنگین ابستادہ پر چھایا ہوا تھا۔ اور اس سائبان کے نیچے اُن نازک تن نازنین بدن پھولوں کے درخت تھے جو فرطِ نزاکت سے دھوپ کی سہار نہیں رکھتے۔ دس دس بیس بیس گملوں کے پھول جو ملتے جلتے تھے اُنپر ایک ٹکٹ لگا ہوا تھا۔ اور ٹکٹ پر انگریزی زبان میں اُنکا نام اور جس سرزمین سے وہ لائے گئے تھے وہاں کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ مجھے تو ان مختلف رنگ کے پھولوں کا مجمع دیکھکر یہ گمان ہوا کہ باغ جہان آرا میں ہفت اقلیم کے محبوب اور معشوق سیر کو چلے آئے ہیں۔ جسمیں سے کہیں بی لیلیٰ اپنے قبیلہ کی گلروسنبل موسمیلیوں کو ساتھ لئے کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ کہیں بی عذرا اپنی بستی کی رنگین ادا بہنوں کے جھلّر میں اپنے جوبن کی بہار دکھا رہی ہیں۔ کہیں رادھکا جی اپنی ات سندر چیریوں کے جھومر میں براج رہی ہیں اور اپنے کرشن مُراری کے انتظار میں ناگ پہاڑ کی طرف بار بار دیکھتی ہیں کہ مہاراج اب پشکر جی سے اشنان کرکے یہاں تشریف لائینگے اور اپنی بنسی سُنا کر اس نمائش کی رونق کو دوبالا فرمائیں گے۔ پھولوں کے اس مرقع کو دیکھ کر مجھ پر ایک حیرت طاری ہوگئی۔ میرے مجروح اور زخمی دل میں سوزش ہونے لگی۔ یہ اچھا تھا کہ بابو عبدالکریم خاں صاحب کے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھا ورنہ میرا کھڑا رہنا دشوار تھا۔ اس عالم نباتات میں بھی نازونیاز اپنے اپنے کام میں مشغول تھے ایک پھول کے کان سے ایک کلی اپنا ننھا سا منہ لگائے کچھ ہنسی کی بات کہہ رہی تھی۔ اور پھول سُنکر کھلکھلا رہا تھا۔ ایک کلی دوسری کلی کے مُنہ کو چوم رہی تھی۔ کسی ٹہنی پر کسی پھول نے اپنا سر رکھدیا تھا۔ بعض درختوں کی شاخیں اِتنی نازک تھیں کہ وہ اپنے پھولوں کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتی تھیں مارے نزاکت کے اُنکی کمر دوہری ہورہی تھی

اسلئے ادا شناس باغبان نے ایک باریک کھپچی اُسکی مدد کے لئے کمان بنا کر لگا دی تھی اس معاملہ کو دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اور وہ رات کا سماں اور تنہائی کا موقع اور کسی کا کہنا یاد آگیا۔ اچھے خدا کو مان کر مجھے سنبھالنا میرے ہاتھ پانوں قابو میں نہیں ہے۔ میرا دل دہڑکتا ہے میری کمر میں درد ہونے لگا۔ نوج ایسی بھی کیا بے پروائی سُنی ان سُنی کئے دیتے ہیں۔ خدا غارت کرے اس موئے سہاگ کے عطر کو۔ ناشدنی نے میرا دماغ اُڑا دیا۔ سارے درد کے پھٹا جاتا ہے (یہ کہکر خاصدان کو جو ٹھوکر ماری تو گلوریاں چاندنی پر جا کر گریں اور اُنپر جو چاندی کے ورق لگے ہوئے تھے اُنکی چمک نے شمع کی روشنی میں کچھ اور ہی جلوہ دکھایا)۔ وہ اگلشن ٹھہر جا صبح ہونے دیکھنا کیسی تیری بوٹیاں نوچتی ہوں جھٹیسی رسّی جل گئی مگر رسّی کے بل نہ جلے۔ میں اس شاخِ گل کو غور سے دیکھ رہا تھا جو اُسکے تاجدار پھولوں نے کہا اے فراق دھلوی ذرا ہوش کی بناؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ کیسی نمایش اور کیسا باغ جہان آرا۔ اے نادان یہ سارے خواجہ کے رنگ ہیں۔ خواجہ پتی پتی میں سمایا ہے۔ خواجہ ٹہنی ٹہنی میں موجود ہے۔ خواجہ ہی غنچہ ہے۔ خواجہ ہی گل ہے۔ خواجہ ہی رنگ ہے۔ خواجہ ہی بُو ہے ؎

یک ببین و یک بدان و یک بخواں — خواجہ را در خواجۂ خود محو داں
و رجدا بینی ز خواجہ خواجہ را — گم کنی ہم متن و ہم دیباچہ را

کوچہ چیلان۔ بارہ دری خواجہ میر درد۔ ناصر نذیر فراق دھلوی

مغربی جواہر ریزے

ہم سب کے لئے بڑی خوشی کی بات ہوتی۔ اگر ہم بہتری کی اتنی ہی زیادہ قدر کرتے جتنی بدتری کی مذمّت کرتے ہیں۔ "سوتھی"

نرمی بہترین طرزِ عمل ہے۔ دنیا میں عمدہ عادات سے بہتر کوئی چیز نام پیدا کرنے یا اُسکی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہیں ہے۔ "لارڈ لٹن"

خاموش دوستیاں اکثر دفعہ سب سے زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ اسلئے میں محتاط دوست کو جوشیلے دوست پر ترجیح دیتا ہوں۔ "ایڈیسن"

خوشی آنکھوں میں نور۔ چہرہ پر سرخی۔ رفتار میں تیزی اور تمام اندرونی اعضاء رئیسہ میں طاقت لاتی ہے۔ جن پر کہ زندگی کا دارومدار ہے۔ "ڈاکٹر سینڈمن"

دوست زر کی مانند کھرے اور کھوٹے ہوتے ہیں۔ ضرورت سے پیشتر اُن کی شناخت ضروری ہے۔ تاکہ ضرورت کے وقت ناقص ثابت نہوں۔ "پلوٹارک"

قربانی

(ایک انگریزی افسانہ کا ترجمہ)

نیلگوں آسمان پر بادل کے بکھرے ہوئے ٹکڑے اس طرح پھر رہے ہیں گویا چھوٹی چھوٹی کشتیاں بندرگاہ بہشت میں لنگر انداز ہیں۔ پہاڑی پر عجب سپاہیانہ شان سے سپیدہ کے پیڑ تنے کھڑے ہیں۔ اُنکے بیچ بیچ بھینی بھینی خوشبو والے گل و بوٹے اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ رنگ برنگ کی تتلیاں اُنکے حسن و خوشبو کا لطف اُٹھا رہی ہیں۔ سبزے سے لدے ہوئے وادیوں میں مسکین بھیڑوں کا گلہ گھاس چر رہا ہے۔

اُسی پہاڑی کی چوٹی پر ایک بھورے رنگ کا مکان عشق پیچاں سے گھرا ہوا کھڑا ہے۔ مکان سے ہوتی ہوئی ایک پگ ڈنڈی دو رسیبوں کے ایک جھنڈ میں جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ پگ ڈنڈی پر سیبوں کے قریب ایک بھیڑ اور ایک لڑکی سیر میں مشغول ہیں۔

لڑکی خوبصورت ہے۔ اُسکے گالوں کی رنگت ہوا سے ہلتے ہوئے سیب کے پھولوں کے مانند سرخ و سپید ہے۔ عنفوانِ شباب کی بہار اُسکے سبز فراک میں سے جھلک رہی ہے۔ سر پر کوئی ٹوپی یا دوپٹہ وغیرہ نہیں ہے۔ بے چین ناگنوں کی طرح زلفیں ہوا کے تھپیڑے کھا کھا کر اِدھر اُدھر لہرا رہی ہیں۔

ایک مرد جوان رعنا ہے۔ جسم کا ہٹا کٹا۔ صحت عمدہ۔ اچھا خاصہ پہلوان معلوم ہوتا ہے۔

پہاڑی پھولوں کی خوشبو چاروں طرف سے آ آ کر دل کو شگفتہ کر رہی ہے۔ اور شہد کی مکھیوں کی سُریلی بھنبھناہٹ مسرت بخش رہی ہے۔

پہاڑی والے بھورے مکان کے اندر ایک پلنگ پر ایک کمزور و ناتوان مریض لیٹا ہوا ہے۔ جنگ یورپ نے اسے بُری طرح پامال کیا ہے۔ مشکل سے جان بچا کر اپنے گھر واپس آیا ہے۔ جب اُسکی شادی ہوئی تھی تو اسکا عالمِ شباب تھا اور وہ ایک سرخ و سپید نوجوان تھا۔ اسکے حسن مردانہ

کی دُور دُور شہرت تھی اور گرد و نواح کی لڑکیاں اسپر ہزار جان سے شیدا تھیں۔ بہرحال اسکی بیوی نے نہایت خوشی سے بیاہ کیا تھا لیکن اب اسکو حسن و عشق کے جذبات سے حظ اُٹھانے کے بجائے غریب زار و نحیف خاوند کی ہمیشہ کے لئے تیمارداری میں مشغول ہونا پڑا۔

لڑکی بار بار بھورے مکان کی طرف دیکھتی ہے۔ اُسکے ہونٹوں سے ترشروئی ٹپک رہی ہے۔ آنکھیں دلی بے چینی کا نقشہ کھینچ رہی ہیں۔ اسوقت جو آدمی اُسکے ساتھ ہے وہ محبت کا پتلا اور بہادری کا مجسمہ ہے۔ اور قدرتاً یہ اُسے اپنی طرف کھینچنے کی زبردست کوشش کر رہا ہے۔

"اصل میں تو اُسے تمہاری ضرورت ہی نہیں" مرد ذرا جوش میں کہتا ہے۔ اُسے ایک تجربہ کار نرس (تیماردار) درکار ہے۔ نہ کہ بیوی۔

اِس پر نوجوان حسینہ تھوڑی دیر خاموش رہ کر کہتی ہے۔

"زندگی اچھی طرح کٹے یا بُری طرح۔ اس سے کیا۔ میں نے تو اُس سے ہمیشہ کے لئے شادی کی تھی۔ بیاہ کوئی ہنسی مذاق نہیں کہ جب چاہا ساتھ رہے اور پھر علٰحدہ ہو گئے۔

نوجوان لڑکی نے آدمی کی طرف سے منھ پھیر لیا۔ پہاڑ کی وادی پر قدرتی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں اُنپر نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چڑھ رہی ہیں۔ موسم بہار نے اُنکے دلوں کو اُمنگوں سے بھر دیا ہے اور سب نوشگفتہ غنچوں کی طرح کھلی جاتی ہیں۔ پھولوں سے لدے ہوئے پیڑوں پر چھوٹے چھوٹے پرندے سُریلے سُروں سے گا رہے ہیں۔ کبھی اِس پھول کو سونگھتے ہیں اور کبھی اُس پھول کو۔ کبھی ایک درخت سے اُڑکر دوسرے درخت پر جا بیٹھتے ہیں۔ کبھی آسمان میں اُڑتے اور کبھی زمین پر چہل قدمی کرتے ہیں۔ گویا تمام زمین اور آسمان اِنھیں کی ملک ہے۔ چاروں طرف خوشی اور زندہ دلی کی حکومت ہے۔

لڑکی کو سارا جہان خوشی سے معمور نظر آتا ہے لیکن آہ! خود اُسکے لئے کوئی مسرت باقی نہیں ہے۔ آخر لڑکی کچھ سوچ کر بول اُٹھی کہ منکل بہت منکل۔ بلکہ درحقیقت دُکھ کی زندگی بسر کرنا محال ہے۔

آدمی جوش سے "ہاں۔ یہی تو میں بھی کہتا ہوں" تم جیسی لڑکی کے لئے تمام عمر کے واسطے ایک دائم المریض شوہر کے ساتھ زندگی بسر کرنا عقل کے خلاف ہے۔ بیشک یہ ایک زیادتی ہے۔

اور اُسکو رد نہ ہونا چاہیئے۔ تم اسکے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ تم کہتی ہو شادی ہنسی مذاق نہیں ہے یہ ٹھیک ہے۔ لیکن شادی جس دوام بھی نہ ہونا چاہیئے۔ آج کل کے زمانے میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ جس طرح چاہے زندگی بسر کرے۔ ہمیں ایک ہی مرتبہ زندگی ملی ہے کچھ بار بار اس دنیا میں آنا نصیب نہ ہوگا۔ اتنا کہکر اُسنے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا "پیاری۔ آؤ۔ ایک جان دو قالب ہو جائیں"

مگر لڑکی نے یکایک اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

افسوس بیارے رابرٹ پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ جب اُسنے شادی کی تھی اُسے کیا خبر تھی کہ ایسا ستم ٹوٹ پڑیگا اور زندگی جو اسوقت ایسی خوش آیند معلوم ہوتی تھی اُسکا ایسا اندوہناک انجام ہوگا۔ آہ اسوقت ہم نے کیا کیا باتیں سوچیں تھیں۔ کیسے کیسے منصوبے باندھے تھے مگر اب یہ سب ارمان خاک میں مل گئے۔ سب اُمیدیں یوں ہی ختم ہوگئیں۔ اے خدا کیا..... لڑکی بولتی بولتی خاموش ہوگئی۔

مرد یکایک آگے کی طرف جھک کر لڑکی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا اور پھر بولا کہ "وہ سب ارادے اب بھی پورے ہو سکتے ہیں"۔ جو باتیں کہ تمنے رابرٹ کے ساتھ سوچی تھیں اُنھیں ہم پورا کریں۔ بیچارہ رابرٹ! اُسکے زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں۔ اُسکو آج نہیں تو کل اس دارِ فانی سے کوچ کرنا پڑیگا۔ لیکن تم نوجوان ہو۔ تمھارا دل جذبات سے پُر ہے۔ تم مایوسی کی زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ تمھیں جینی جاگتی محبت درکار ہے۔ تمھیں ایک درخت میں لگا ہوا گل شگفتہ چاہیئے۔ نہ کہ خاک میں پڑی ہوئی خشک پنکھڑی۔ چلو اگلے ہفتہ میرے ساتھ مصر چلو۔ مجھے اُسی پرانے کھدائی کے کام پر جانا ہے۔ جو چاند کہ کلیوپٹرا اور اُسکے عاشق اینٹونی کے لئے زمانہ قدیم میں چمکتا تھا اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس موسم بہار کے صاف و شفاف آسمان میں چمکتے ہوئے چاند کی مسرت بخش روشنی میں تمھیں بتاؤنگا کہ محبت اور خوشدلی کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کیجاتی ہے

صاف و شفاف آسمان میں چمکتا ہوا چاند! آہ اسکا خیال آتے ہی لڑکی کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور اُسکا تخیل اُسکے روبرو نیلگوں آسمان اور آخری رات کا نظارہ پیش کرتا ہے۔

خاموشی کا عالم۔ آسمان پر لاکھوں ستاروں کی چمک دمک طلسمات کا دھوکا دے رہی ہے۔ اسے معلوم ہو رہا ہے کہ اس دلفریب منظر میں وہ کھجور کے درختوں تلے اپنے عاشق زار کے پہلو میں کھڑی ہے!

دم بھر کے بعد جب پھر اُسنے آنکھ کھولی تو اُسے بھورے مکان کے گرد کا عشق بیچارا سوکھا ہوا دکھائی دیا۔ مکان کے اندر پلنگ پر لیٹا بات بات پر چڑچڑانے والا مریض اُسے اپنے زندان ہستی کی ایک وزنی آہنی بیڑی کے مثل معلوم ہو رہا ہے۔

یکایک وہ اپنے عاشق سے لپٹ گئی۔ اور آہستگی سے بولی "میں تمھارے ساتھ چلونگی" اتنا کہنا تھا کہ جوش مسرت سے اُسکے گال سُرخی سے چمک اُٹھے۔ . . . . . .

سامنے بھورے مکان میں وہی دائم المریض سپاہی پلنگ پر دھوپ سے منھ ہٹائے ہوئے لیٹا ہے۔ آہ! اس بیچارے کو شائد پھر یہ دھوپ دیکھنا نصیب نہ ہو۔ زندگی کے ابتدائی حالات باری باری سے اُسکے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے واقعات ایک ایک کرکے اسکے سامنے آرہے ہیں۔ ایک نوجوان لڑکے کا کندھے پر بندوق رکھکر اکڑ کر چلنا۔ ہشاش بشاش نوشہ کی اپنے عروس نو سے ملاقات۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ کا میدان جنگ کو روانہ ہونا۔ وہاں ناگہاں ایک گولے کا پھٹ کر اردگرد کی سب چیزوں اور جانداروں کو اسطرح خاک سیاہ کر دینا جیسے کوئی کمہار اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو غصہ میں آکر خاک میں ملا دے۔ اسکے نگاہ تصور میں پھر ایک عورت کی شکل دکھائی دی۔ جسنے ایک فربہ بچہ کو چھاتی سے لگا رکھا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس نمائشی محبت سے بچہ اصلی نہیں بلکہ اسی طرح بہت سے خواب پریشاں اُسکو دکھائی دے رہے ہیں۔ ایام گذشتہ کی یاد اُسے بہت ہی دلکش معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حالت موجودہ کا خیال آتے ہی اُسکی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

لڑکی اپنے عاشق سے ملکر واپس آتی ہے۔ اور اپنے خاوند کے بگڑے ہوئے چہرہ پر آنسوؤں کے قطرے دیکھکر اُسکی آنکھیں بھی از خود ڈبڈبا آتی ہیں۔

یکایک اُسکے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے کہ وہ پچھلے چند روز سے اپنی ہی حالت پر

آنسو بہاتی رہی ہے۔ اور خاوند کی بیتا کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ اِس خیال کے آتے ہی اُسکا دل رحم و محبت اور اخلاص و ہمدردی سے بھر جاتا ہے وہ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رومال سے اپنے بے بس و بیمار شوہر کے آنسوؤں کو پونچھنا چاہتی ہے کہ وہ جاگ اُٹھتا ہے اسکی آنکھیں کھلتے ہی بیوی آنکھوں کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتی ہیں اور بچّہ کی طرح اپنے ہاتھ سے اُسکے ہاتھ کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

مین نے خواب دیکھا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ اس خواب کو بیان کرتے ہوئے اُسکی آواز بھرا گئی اور وہ بولا معلوم نہیں میرے پانوں میں کہاں سے طاقت آگئی کہ میں اوپر تمھارے کمرہ مین پہونچ گیا اور وہاں تم مجھے نہیں ملیں۔ مگر گلاب کی ٹہنیاں تمھاری کھڑکی کے گرد پہلے ہی کے طرح اترا رہی تھیں۔ وہ زمانہ جبکہ ..... ایام گذشتہ کی پُر مسرّت یاد نے لڑکی کے دل میں بھی ایک ہیجان سا پیدا کر دیا اور بے چین ہو کر بول اُٹھی۔

لیکن میں تمھیں کیوں چھوڑنے لگی؟ لڑکی نے زرا تیزی سے پوچھا۔ مرد نے افسردگی سے کہا "آخر تم یہاں کیوں رہوگی" اور پھر ایک نفرت بھری نظر سے اُسنے تن زار و نزار کی طرف دیکھا۔

مگر یکایک ایک بے اختیاری کے عالم میں لڑکی کے مُنھ سے نکل گیا۔ کیونکہ یہ میرا حق ہے۔ کیونکہ تم میرے اور میں تمھاری ہو چکی ہوں۔ جب تک موت جُدا نہ کرے ہم اکٹھے رہیں گے۔ اور اکٹھے ہی تمام مصیبتیں جھیلیں گے۔ "ہم اکٹھے رہیں گے اور اکٹھے مصیبتیں جھیلیں گے" مرد رُکتا رُکتا لڑکی کے سامنے دھراتا ہے "میں تمھارے کس کام کا" وہ حسرت سے کہتا ہے اور گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر لڑکی کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیتا ہے۔

مرد کے آنسوؤں نے لڑکی کے دلمیں گھسکر پہاڑی وادی کے ملاقات کی یاد کو حرف غلط کیطرح ہمیشہ کیلئے مٹا دیا۔ تم سے بڑھکر میرا کوئی نہیں ہے؟ وہ آہستہ سے کہتی ہے" اور اس طرح پر اُسنے اپنے تمام ارمانوں کی اپنے ہی دل میں قبر بنا دی۔

ترجمہ
(از فس لوئس ہلجرس)
گوپال کرشن یاس

تنقید کتب

انتخاب زرّیں

یہ شعرا ز اردو کا ایک مختصر تذکرہ ہی، مسٹر سید راس مسعود (آکسن) ناظم تعلیمات حیدرآباد اسکے مؤلف ہیں، آپ کی یہ تالیف اُردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ اور آپ کے ذوق ادب کا بیّن ثبوت ہے۔

ابتک اردو شعراء کے بہت سے تذکرے شایع ہو چکے ہیں۔ تذکرۂ آب حیات بہ لحاظ تفصیل و تنقید سب میں ممتاز ہے، لیکن مولانا آزاد مرحوم نے دور حاضرہ کے صرف چند خاص شعراء کا ذکر کیا ہے، حالانکہ مرحوم کے وقت میں بھی دھلی لکھنؤ میں اکثر ممتاز شاعر موجود تھے، پہلے حکیم مومن خاں دھلوی کو بھی آپ نے تذکرۂ آب حیات سے الگ رکھا تھا۔ لیکن بعد کو مولانا حالی فیضیاب اور محترم ارباب قلم کے اصرار سے اُنکا ذکر دوسرے اڈیشن میں کر دیا گیا۔ بہرحال آب حیات میں یہ کمی رہ گئی، ممکن تھا کہ مولانا آزاد آب حیات کا کوئی دوسرا حصہ بھی تالیف فرماتے اور اُسمیں یہ کمی پوری ہو جاتی۔ لیکن عمر نے اجازت نہ دی۔

تذکرۂ خمخانۂ جاوید بھی ایک جامع اور مبسوط تذکرہ ہے۔ مگر طریقۂ انتخاب میں کوئی امتیازی خصوصیت نہیں بلکہ عمومیت غالب ہے۔ اکثر غیر معروف اور مبتدی شعراء کا کلام بھی گلدستوں سے انتخاب کر دیا گیا ہے اور مزید حالات کی زیادہ تفتیش نہیں کی گئی۔ بہرحال خمخانۂ جاوید ایک جامع تذکرہ ہے۔ مگر افسوس کہ ابتک اُسکی صرف چند جلدیں شایع ہو سکی ہیں۔

انتخاب زرّیں میں منتخب اور مشہور شعراء کے مختصر حالات کے ساتھ مختصر کلام کا انتخاب شایع کیا گیا ہے۔ مؤلف کی نظر شروع ہی سے اختصار پر تھی۔ اختصار بیشک بہترین طریقہ ہے لیکن اس قسم کے اختصار میں تشنگی باقی رہتی ہے اور سیری نہیں ہوتی۔

مثلاً بیان یزدانی مرحوم کے مختصر حالات کے بعد جو نمونہ کلام پیش کیا گیا ہے اُس سے بیان مرحوم کے تمام اصناف کلام پر کافی روشنی نہیں پڑتی، امید، اور رخصت عروس دراصل اُنکی دو نظمیں ہیں۔ اگرچہ ان نظموں سے بھی اُنکی قادرالکلامی ثابت ہوتی ہے لیکن ایک ایسا شخص جو اُنکی غزل گوئی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہو۔ بالکل فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

سب سے زیادہ قابل تعریف بات جو اس مختصر تذکرے میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نمونہ کلام کے لئے پوری نظمیں یا غزلیں دی گئی ہیں، سید راس مسعود کی یہ سعی عمل دنیائے ادب میں ضرور مشکور رہوگی۔ خدا کرے کہ آپ آیندہ بھی اُردو زبان کے خزانے میں اس قسم کے بیش بہا جواہرات کا اضافہ کرتے رہیں، کاغذ کتابت وطباعت کے لحاظ سے بھی انتخاب زریں کا درجہ ممتاز ہے، جلد خوشنما، ٹائیٹل نظر فریب، قیمت عہ، شائقین ادب حضرات مؤلف سے طلب فرمائیں۔

شاعری کی تیسری کتاب

یہ کتاب قافیہ کے عیب وصواب کے متعلق جناب خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت نے تصنیف فرمائی ہے، ہم اس مفید سلسلہ کی تالیف پر جناب عشرت کو مبارکباد دیتے ہیں، اور شائقین شاعری کو مشورہ دیتے ہیں کہ ضرور اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ مگر ضخامت کے لحاظ سے قیمت کچھ زیادہ ہے۔

ملنے کا پتہ۔ خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت احاطہ خانساماں لکھنؤ۔

آزادی

یہ مختصر رسالہ حضرت مولانا آزاد سبحانی کی فلسفیانہ افکار طبع کا نتیجہ ہے، آزادی کی تعلیمات عامہ میں آزادی ناقص کی جگہ آزادی کامل کا اُصول پیش کیا گیا ہے، اور سوراج کے ساتھ ساتھ آزادی کو ملکی نصب العین بنانے کی تلقین کی گئی ہے، قومی آزادی اور نوعی آزادی پر علمی بحث کی گئی ہے اور قومی آزادی کو قومی ترقی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے، آزادی کا تعلق روحانیت سے بتایا گیا ہے اور مادی آزادی پر روحانی آزادی کو ترجیح دی گئی ہے۔ ارتقا وانقلاب میں انقلاب کو ترجیح دی گئی ہے اور انقلاب کو دو قسموں میں تقسیم کرکے پُرامن طریقۂ انقلاب کو

پُرحرب طریقۂ انقلاب سے بہتر بتایا گیا ہے۔ آزادی کامل اور اسکی ہر نوع پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملک کے لئے کس آزادی اور کون سے طریقۂ کار کی ضرورت ہے، اور آزادی کا انجام کیا ہے، غرض رسالہ آزادی، سیاسی مسائل کی شرح ہے، عبارت سادہ مختصر اور آسان، طرز بیان فلسفیانہ اور معلمانہ اختصار کے ساتھ تفصیل کا نادر الوجود اتصال قابل دید ہے۔ طباعت عمدہ۔ قیمت ۵ رحجم چھوٹی تقطیع کے ۴۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر دائرۂ علمیہ کانپور۔

تجارت کی پہلی کتاب

اِس سلسلہ کی چار کتابیں ہمارے پاس بغرض ریویو موصول ہوئی ہیں، جن میں فن تجارت کے متعلق ضروری باتوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور تجارت کے ہر مفید پہلو پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پہلی کتاب مبادیات تجارت سے متعلق ہے۔ دوسری کتاب میں فن اشتہار سے بحث کی گئی ہے۔ تیسری کتاب میں معاملات تجارت اور دوکانداری کی تعلیم دی گئی، چوتھی کتاب میں تجارت کے متعلق مراسلات کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ بلاشبہہ یہ سلسلہ تصنیفات نہایت مفید اور کامیاب سلسلہ ہے، اُردو میں اس قسم کی کتابوں کی بہت ضرورت تھی، تجارت پیشہ احباب اِن کتابوں کا ضرور مطالعہ فرمائیں، پہلی دوسری تیسری کتاب کے مؤلف مولوی سید ظہور احمد صاحب وحشی اور چوتھی کتاب کے مؤلف سید صغیر علی صاحب قادری ہیں، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ پہلی کتاب کی قیمت غیر مجلد ۱۲ر مجلد ۱۴ر دوسری کتاب کی قیمت غیر مجلد ۱۴ر مجلد ۱۶ر تیسری کتاب کی قیمت غیر مجلد ۱۲ر۔ مجلد ۱۴ر مقرر ہے۔ چوتھی کتاب کی قیمت کتاب پر تحریر نہیں۔ یہ کتابیں نظامیہ دارالاشاعت دھلی سے مل سکتی ہیں۔

حیاتِ خسرو

یہ حضرت امیر خسرو کی سوانح عمری ہے جو چھوٹی تقطیع کے ۱۰۶ صفحوں پر دائرۂ ادبیہ لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے، اسکے مصنف مولانا شبلی نعمانی مرحوم ہیں۔ مرحوم کا حقیقت نگار قلم اس مختصر سی سوانح عمری کی تاریخی وادبی دلچسپیوں کا ضامن ہے، کاغذ معمولی کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ قیمت مجلد ۱۴ر غیر مجلد ۸ر۔ ملنے کا پتہ۔ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ۔

اسلامی جنتری

اس دلچسپ اور کارآمد جنتری میں مفید و نتیجہ خیز اور مفید مضامین شائع ہوئے ہیں، حجم سو صفحہ سے زائد ہے، آخر کے چند صفحات کے علاوہ باقی صفحے مذہبی، تاریخی، علمی، معلومات سے پُر ہیں، ادبی دلچسپیوں کا بھی کافی ذخیرہ ہے، شروع میں ایک صفحہ پر مشاہیر اسلام کی تصویریں دی گئی ہیں، اسی کے ساتھ ایک محمدی کیلنڈر بھی شایع ہوا ہے، اُسمیں بھی یہی تصویریں ہیں جو اسلامی جنتری میں ہیں، غرض یہ جنتری مسلمانوں کے لئے ایک خاص چیز ہے،

قیمت فی جلد مجلد ۱۳ر ملنے کا پتہ - دفتر اسلامی خلافت جنتری موچی دروازہ کوچہ آہنگران، لاہور

تحفۂ خوشتر

یہ شعر و سخن کا ایک ماہوار گلدستہ ہے جو ۲۴ صفحہ پر جناب وسیم کی ادارت میں بالالتزام گورکھپور سے شائع ہوتا ہے، ترتیب اور انتخاب قابل تعریف ہے، سالانہ قیمت عہ،

شائقین شعر و سخن، سید محمد عسکری صاحب وسیم، محلہ مفتی پور شہر گورکھپور سے طلب فرمائیں۔

شگوفہ

اس نام کا ایک ادبی و تعلیمی رسالہ کانپور سے بڑی تقطیع کے ایک جزو پر ماہوار شائع ہوتا ہے جناب صلیح بلہوری اسکے اڈیٹر ہیں: بچوں کی تعلیم و تربیت اسکا مقصد خاص ہے، عام شائقین ادب کی تفریح طبع کے لئے بھی مفید اور دلکش ادبی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ کشتۂ کیمیا کے عنوان سے ایک دلچسپ ناول کا کچھ حصہ بھی ہر مہینہ ناظرین شگوفہ کی تفریح طبع کے لئے شائع کیا جاتا ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت سالانہ عہ۱۲ر ملنے کا پتہ - منیجر شگوفہ، پنچ باغ کانپور۔ اعظمی

تصحیح - ہمیں افسوس ہے کہ جنوری نمبر میں کتابت و طباعت کی بعض بعض قابل افسوس غلطیاں رہگئی ہیں۔ بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جنسے نفس مضمون پر کوئی حرف نہیں آتا۔ لیکن بعض غلطیوں کا مفہوم پر خاص اثر ہوتا ہے۔ اسلئے انکی تصحیح ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۵۲ پر سلسلۂ تنقید معارف ملت وغیرہ تمہید مؤلف کا پہلا فقرہ غلط درج ہوگیا ہے، اصل فقرہ یوں ہے "اردو شاعری کی عجب قادیری"۔ ناظرین درست فرمالیں

پیامِ دمن

دیکھتی ہون اپنی ان آنکھون سے کیا پروردگار
خواب ہے یہ یا طلسمِ دشت کوئی آشکار

تھا ابھی زانو پہ سر کیا کوئی پتھر ہو گیا
خیر یارب خیر ہو اے میرا کہان شیرین نگار

باعثِ وحشت ہین مجھکو اونچے اونچے یہ درخت
وجہِ بیم و یاس ہین یارب صدائین بے شمار

سہم جاتی ہون مین سنکر کانپنے لگتا ہے دل
شامِ تنہائی مین کرے کون مجھکو ہمکنار

میرے پانون مین کہان طاقت جو طے کرتی سفر
جا رہی تھی جذبِ الفت سے کھینچی بیگانہ وار

اک قدم کے بھی اٹھانے کی نہین طاقت مجھے
چلتے چلتے خار صحرا سے ہوئے تلوے فگار

مجھپہ کس کس کی نظر ہے اژدر و صیاد و شیر
آہ کس کس کا ہے جو لانگاہ اک جسمِ نزار

کیا نہ ٹوٹے گا کبھی یہ کیا نہ دے گا تو جواب
تیری ضد بھی ہو گئی ظالم مرے اشکون کا تار

بول بھی اٹھہان کہین سنکر صدائے بازگشت
ڈھونڈھتے پھرتے ہین تجھکو نالہائے بیقرار

چھپنے والے حد بھی ہے یہ دل لگی اچھی نہین
وہ ہنسی بھی کیا، کوئی خندان ہو۔ کوئی شکبار

آزمائش ہو چکی ہان آزمائش ہو چکی
رحم کے قابل ہے اب بیمارِ غم کا حالِ زار

نقشِ پا کا بھی کہین ڈھونڈھے نہین ملتا پتہ
ہائے مین صحرا مین ڈھونڈون کسطرف دیوانہ وار

اے محبت کے فرشتے پیکرِ صدق و وفا
چھوڑ جاتے ہین کسی بیکس کو یونہی دوست دار

تو وہی ہے ہمنشین کو قاصد بنایا تھا کبھی
یادِ دمن کا دیکھنا بھی ہے تجھے اب ناگوار

رہنے دے اے حافظے تو بس بھی کر عنایان
یادِ ایامِ تعیش مت دلا اب بار بار

ہائے یہ صحرانوردی اور کہان وہ تخت و تاج
ہائے وہ پھولون کا بستر اور یہ تکلیفِ خار

اب غرورِ حسن باقی ہے نہ وہ آرائشین
اب نہ وہ جوشِ جوانی ہے نہ وہ میرا سنگار

کسکو بھاتی ہین تری اٹھکھیلیان بادِ صبا
یاد آیا میکہ تیری تتلیان تھین خوشگوار

ہوک سی اُٹھتی ہے دل مین ابتو صورت دیکھکر
پیک راحت تھا کبھی ہمکو تو اے ابر بہار

ظلمتِ طولِ شبِ ہجران ہے تو زلف سیاہ
دور ہو شانون سے ہٹ کیون چھیڑتی ہے بار بار

رحم یارب ٹکڑے ٹکڑے ہے کلیجہ دیکھکر
وہ ہجومِ آرزو اور یہ تمنا کا فشار

آرزو اب حسن کی ہے اور نہ خواہش وصل کی
بھر گیا جی سب سے اپنا آہ دور روزگار

چار دن قسمت مین تھا کاشانۂ راحت فزا
دو گھڑی تقدیر مین لکھا تھا اپنی وصلِ یار

ابتو کانٹون کی خلش ہے اور اندوہِ ہجر کی
یاد ایام گزشتہ ہے کسی کی سوگوار

وہ عروجِ اوجِ ہستی یہ زوالِ لازوال
اور کیا کیا دیکھنا ہے دیدۂ عبرت شعار

اور بھی ارمان ہے باقی کوئی تیرے فلک
اور بھی حسرت ہے کوئی گردشِ لیل و نہار

منتظر ہے اور کسکی آہ اے برقِ اجل
اور کچھ قسمت مین لکھا ہے ابھی پروردگار

دل مین ہو دردِ محبت سر مین سودائے وفا
لب پہ ہو ذکر صنم آنکھون مین ہو تصویر یار

ذرہ ذرہ مین نظر آنے لگے نل کی شبیہہ
اس طرح صحرا مین دم توڑے پریشان روزگار

کہکے گر جاتا تو کیا دامن پکڑ لیتی ترا
جانیوالے تجھکو تھا جانے پہ اپنے اختیار

اوتلون کیش او بیدرد آکر دیکھ جا
پانون کے چھالون سے کیسے خون کی بہتی ہے دھار

روٹھنے والے منالون جانیوالے لوٹ آ
درگذر میری خطاؤن سے کہ مین ہون بیقرار

تو مرا منھ دیکھے میرا جو بڑھائے اب قدم
خون پیے میرا جو رکھے پانون آگے ایکبار

آرزو ہے منھ چھپا کر رؤن تیری گود مین
آگے جانیوالے پیچھے لوٹ آ تیرے نثار

بے مروت دل ترا نازک ہے اتنا یاد رکھ
صدمۂ فرقت کا تجھ سے بھی نہین اُٹھنے کا بار

اپنے زانو پر سُلاؤن آسنا کرین تجھے
شام غم مین قصۂ دردِ دلِ اُمیدوار

نوک مژگان سے نکالون آنسوؤن سے دھوؤن زخم
چبھ گیا ہو پائے نازک مین نہ تیرے کوئی خار

ایک چھوٹا سا چمن ہے سیر کرلے رشکِ گل
آدکھاؤن تجھکو اپنے دل کے داغون کی بہار

اسپہ کیا کس طرح شیون مین آتا ہے اثر
کسطرح ہوجاتی ہین غم کی صدائین دل کے پار

کسطرح سے اپنا دامن گل کیا کرتے ہین چاک
کس طرح نالہ کشی کرتے ہین اے بانگ ہزار

ٹوٹ بھی پڑ بیکسون پر رحم کر ہان ٹوٹ پڑ
ہے کھڑا کسکے سہارے آہ چرخ دون شعار

تھام لے دردِ محبت تو ہی اُٹھکر تھام لے — اپنی نظروں سے گری جاتی ہوں مین بے اختیار
اے زمین اے آسمان اے آب و آتش خاک و باد — مین سما کر ختم کر دون یہ حیاتِ مستعار
لیتجا ہے تجھ سے اتنی میرا کہدینا پیام — باعثِ تکلیف زانو تھا کسی کو تیرا بار
تھی دمن تیری کوئی،، یہ کہہ کے چپ ہو جائیو — تیری قسمت مین تو لکھا ہی نہین دامانِ یار
میرا آنچل بنکے آنسو پونچھ دینا اے صبا — یون نہ پہلو سے کھسک جاتا مگر بیگانہ وار
برتر تو رونے لگیو خاک اُڑانا بیکسی — مجرمِ الفت کرین اب اور کبتک انتظار
پھر یہ کہنا کیا کرے گا اے مسافر پوچھکر — ہے قسم بس یاد مت کرنا دمن کو زینہار
سکو سُنکر اُسکے آنسو پھر اگر گرنے لگین — ڈھونڈھ لونگی مین بھی اپنے واسطے اک رہگزار
پھر یہ کہنا اے نسیمِ غمگسار — اپنے مرنے پر بھی کیا تجکو نہین ہے اختیار
ق
ہون پریشان خاک ہوکر پارہ ہائے سونو دل — کون لے گا پھر خبر تیری مگر اے یادِ یار
دم نکل جائے اگر صحرا مین مجھ رنجور کا — انکی قسمت مین نہین راحت لکھی زیرِ مزار
اے زمین اے آسمان اے آب و آتش خاک و باد — ہو پریشان دیکھئے کس کس جگہ مشتِ غبار
لیتجا ہے تجھ سے اتنی میرا کہدینا پیام — مرمٹون گی پر اجل کی مین نہ ہونگی خواستگار
تھی دمن تیری کوئی،، یہ کہہ کے چپ ہو جائیو — مجھکو مرنے اور جینے پر کہان ہے اختیار
میرا آنچل بنکے آنسو پونچھ دینا اے صبا — اور مٹ کر خاک صحرا ہو مرا مشتِ غبار
برتر تو رونے لگیو خاک اُڑانا بیکسی — اور آنکلے ادھر سے وہ مرا شیرین نگار
پھر یہ کہنا کیا کرے گا اے مسافر پوچھکر — اے درختانِ بیابان اے نسیم کوہسار
سکو سُنکر اُسکے آنسو پھر اگر گرنے لگین — چار حرفون کا نہ کہنا ہو اگر کچھ ناگوار
ڈھونڈھ لونگی مین بھی اپنے واسطے اک رہگزار — نام سنکر میرا گر ہونے لگے وہ اشکبار
پھر یہ کہنا اے نسیمِ غمگسار — اور کہنا بیوفائی پر ہو اب کیون شرمسار
اپنے مرنے پر بھی کیا تجکو نہین ہے اختیار — پوچھے گر انجام میرا کیا ہوا پایان کار
کون لے گا پھر خبر تیری مگر اے یادِ یار — اُٹھتے ہی جاتے ہین دنیا سے نحیف و خستہ زار
انکی قسمت مین نہین راحت لکھی زیرِ مزار — تیرے صدقے پھر یہ کہنا اے نسیمِ غمگسار

تیرے آنسوں سے دمن کی روح کو کیا فائدہ
تیری آہوں کی اُسے پروا نہیں اے بیقرار

ہاں اگر فرصت ہو تجھکو اے بتِ وعدہ شکن
سُن لے روداد جفا یا عشق کا انجام کار

کیا دمن پر منحصر ہے موت ہے سب کے لیے
ہستیِ دورِ جہان کا ہے اسی پر انحصار

روح نے فرقت مین چھوڑا جسم کیونکر اب یہ سُن
ہاتھ رکھ سینے پہ دل کو تھام رہنا ہوشیار

مرتے مرتے نام تیرا تھا لبِ بیتاب پر
ہر اُکھڑتی سانس مین تھا اے نہالِ الفت شعار"

رگھونندن پرشاد آنند

پھر بسنت آیا

صبا نے مژدہ سُنایا کہ پھر بسنت آیا
گلوں نے جلوہ دکھایا کہ پھر بسنت آیا

کلی کلی نے چٹک کر خوش آمدید کہا
یہ کس نے اِن کو بتایا کہ پھر بسنت آیا

طیورِ زمزمہ پرداز نے بر نگِ دگر
چمن میں جشن منایا کہ پھر بسنت آیا

نکھرتا جاتا ہے کیا حسن شاہدِ فطرت
پلٹتی جاتی ہے کایا کہ پھر بسنت آیا

چمن کو وادی و صحرا کو دستِ قدرت نے
بہ ذوق و شوق سجایا کہ پھر بسنت آیا

سحابِ فیض نے سبزے کی نرم اطلس کا
زمیں پہ فرش بچھایا کہ پھر بسنت آیا

پلٹ کے تیرِ اعظم سوئے شمال آیا
سمٹ کے رہگیا سایا کہ پھر بسنت آیا

زمیں نے سرسوں جمائی ہے کیا ہتھیلی پر
کرشمہ خوب دکھایا کہ پھر بسنت آیا

رہا فسردہ و پژمردہ کیوں دلِ محروم
اسے یقین نہ آیا؟ کہ پھر بسنت آیا

محروم

دُنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

از جناب صدرالدین صاحب سرشار سمندری

حیران ہو کیوں دُنیا کے لئے — دنیا کی دولت کچھ بھی نہیں — دنیا کی طلب کرتے ہو مگر — دنیا کی فراغت کچھ بھی نہیں
دنیا سے محبّت کرتے ہو — دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

کیوں آئے تھے تم اِس دُنیا میں — کچھ اسکی خبر بھی ہے تم کو — دیکھو تو سہی دنیا کیا ہے — کچھ ذوق نظر بھی ہے تم کو
دنیا سے محبّت کرتے ہو — دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

کیوں بھول گئے اپنا وعدہ — جو روزِ ازل کر آئے تھے — اب تمکو یہ بھی یاد نہیں — کیا ساتھ دہ لینے لائے تھے
دنیا سے محبّت کرتے ہو — دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

بے درد بہت ہی یہ دُنیا — بالکل نہیں اسمیں خوئے وفا — برباد ہو کیوں تم اسکے لئے — کیوں ڈھونڈھ رہے ہو بوئے وفا
دنیا سے محبّت کرتے ہو — دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

دنیا ہی آفت لاتی ہے — دنیا ہی مصیبت ڈھاتی ہے — سو رنج تمھیں پہونچاتی ہے — پھر بھی یہ تم کو بھاتی ہے
دنیا سے محبّت کرتے ہو — دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

نادان ہو تم دنیا سے تمھیں — اک روز ضرور ہی جانا ہے — برحق ہے قیامت کا آنا — اللہ کو مُنھ دکھلانا ہے
دنیا سے محبّت کرتے ہو — دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

تم جاؤ نہ باتوں پر اِسکی — مکّار ہے یہ پھسلاتی ہے — تعبیر جہنّم ہے جس کی — وہ خواب تمھیں دکھلاتی ہے
دنیا سے محبّت کرتے ہو — دنیا کی محبّت کچھ بھی نہیں

قسمت کو بُرا کیوں کہتے ہو پھر — کیوں تمکو فلک سے ہے شکوہ — مذہب کو تمنے چھوڑ دیا — ملّت سے ہوئے تم برگشتہ

دنیا سے محبت کرتے ہو دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں

مذہب پر صدقے ہونے کو ہر حال میں تم تیار رہو آغاز ہو گو امید فزا انجام سے بھی ہشیار رہو

دنیا سے محبت کرتے ہو دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں

تم کیوں ہو مسرت کے جویاں دنیا کی مسرت کچھ بھی نہیں ہے مثل حباب اسکی ہستی دنیا کی حقیقت کچھ بھی نہیں

دنیا سے محبت کرتے ہو دنیا کی محبت کچھ بھی نہیں

اپنے وطن پہ صدقے

بہ نقیح جناب اقبال

پرتھی نے جاں گنوائی پیارا رتن سمجھ کر رانا نے خوں سے سینچا اپنا چمن سمجھ کر
نل ہو گئے ہزاروں اسکو دمن سمجھ کر ہم ہو گئے تصدق اپنا وطن سمجھ کر

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

یونانیوں کو کس نے علم و ہنر سکھایا تاتاریوں کو کس نے یوں آدمی بنایا
ایرانیوں کا کس نے آتشکدہ بجھایا دنیا کو سیر حق کا کس نے سبق پڑھایا

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

نے کرشن نے بجائی جس راز کی یہاں پر گو تم کے وعظ میں تھا نانک کی تھا زباں پر
چشتی نے جس زمیں کو پہونچایا آسماں پر کیونکر نہ سر جھکائیں ہم ایسے آستاں پر

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

ہر گل میں ہے ابھی وہ خوشبوئے روح پرور کرتی ہے اُن پہ شبنم اب تک نثار گوہر
کانٹوں پہ لوٹتے ہیں اب تک سنان و خنجر موسم بتا رہے ہیں اب تک یہی گزر کر

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

قدرت کی دلفریبی احسان کر رہی ہے آئینہ بن کے کیا کیا حیران کر رہی ہے
ہمت ہماری ہمکو بے جان کر رہی ہے غیرت یہی اشارہ ہر آن کر رہی ہے

اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

کلیم اعظم گڈھی

جذباتِ حسن

اِک برقِ حسن شب کو تجلّی فروش تھی
جذباتِ مضطرب کی مرے پردہ پوش تھی

تھا اقتضائے دل لبِ اظہار وا کروں
تاثیرِ رعبِ حسن کو لیکن میں کیا کروں

وہ گردشِ نگاہ عجب کام کر گئی
سو بار آ کے ہونٹھ پہ آواز مر گئی

جب مسکرا کے اُس نے کیا مجھ سے یہ سوال
کس نے کیا ہے تیری تمنا کو پائمال

کس کشمکش میں جان ہے کیا اضطراب ہے
کس آرزو کے کھیل میں ناداں خراب ہے

میں کر سکا نہ ضبط تو آنسو ٹپک پڑے
پیمانہ ہائے بادۂ اُلفت چھلک پڑے

بس ترجمانِ رازِ نہاں ایک آہ تھی
بیتابیوں کی شرح مری اِک نگاہ تھی

اُس پیکرِ جمال نے پھر یوں کیا خطاب
اے محوِ شوق میرے سوا لو نکالے جواب

کیا حسنِ ظاہری کا پجاری ہے؟ سچ بتا
کیا میری شکل ہی تجھے پیاری ہے؟ سچ بتا

کیا میرے وصل ہی کے لئے ناشکیب ہے
ایسا ہی ہے اگر تو ہلاکِ فریب ہے

حسنِ نظر فریبِ فریبِ شباب ہے
یہ میری آب و تاب تو موجِ سراب ہے

نفسانیت کا تیری یہ سب مکر و کید ہے
ہاں دامگاہ حرص و ہوا کا تو صید ہے

مجھ سے تو بڑھ کے فصلِ بہاری ہے دلربا
وہ کونپلوں کی کوک وہ جھونکا نسیم کا

مجھ سے زیادہ حسن تو ہے آفتاب میں
تنویر یہ کہاں مرے رنگِ شباب میں

بہتر ہے جی لگائے جو فصلِ بہار سے
ہر سال یہ دکھائیگی منظر نئے نئے

حقدار تیرے دل کی ہے خورشید کی چمک
ممکن نہیں کہ اسمیں تغیر ہو حشر تک

سودا اگر مرا ہے تو سن گوشِ ہوش سے
اب سے خیال گیسو و کاکل کو چھوڑ دے

اسواسطے کہ جذبۂ اُلفت نہ ہو فنا
اور میرے حسن کو بھی ملے دائمی بقا

نافہم خدّ و خال پہ مائل کبھی نہو
ایسے اثر کو ڈھونڈھ جو زائل کبھی نہو

مجنوں - گورکھپوری

لطفِ سخن

جناب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی

کیا ہے جذب دل نے اسقدر کثرت کو وحدت میں
کہ قطرہ اور دریا ایک ہے چشمِ حقیقت میں

غنیمت ہے وطن کی یاد بھی اندوہِ غربت میں
وگرنہ کون کسکا ساتھ دیتا ہے مصیبت میں

بتا دو اُن گنہگارانِ الفت کی سزا کیا ہے
قیامت کیکے تمکو جو پکاریں گے قیامت میں

ہر اک نقشِ قدم پر اپنے سو سو سجدے کر غافل
عبودیت اسی کا نام ہے سودائے اُلفت میں

نہیں فوقِ گنہ، لطفِ ندامت، حاجتِ مگر یہ
الٰہی دل نہیں لگتا ہمارا ایسی جنّت میں

تعجب کیا سیہ بختی ہمارے کام آجائے
سُنا ہے ایک راحت کا بھی پہلو ہے مصیبت میں

دبے پاؤں قیامت فاتحہ خوانی کو آتی ہے
شبِ فرقت کا اک جاگا ہوا سوتا ہے تربت میں

ازل کی بزم افروزی فسانہ ہوتی جاتی ہے
ذرا پھر جلوہ آرا ہو شبستانِ محبت میں

ہر اک خارِ الم نشتر سے بڑھکر دل میں کھٹکے گا
قدم رکھنا سنبھل کر اے اثر دشتِ محبت میں

جناب مولوی حافظ محمد اشرف علی صاحب حافظ کانپوری

حکم سجدہ پے اظہارِ وفا دیتا ہے
کبھی توفیق جو اُس بت کو خدا دیتا ہے

تو اگر آئینہ کو شکل دکھا دیتا ہے
عکس تیرا اُسے تصویر بنا دیتا ہے

کیوں نہ خاموش رہیں مستِ شرابِ عرفاں
جام جو ہوتا ہے وہ خالی صدا دیتا ہے

اے مرے نالۂ دل تو ہی یہ کہدے جا کر
دیکھ لو کون ترے در پہ صدا دیتا ہے

قتل گہ میں نہ مجھے خوف نہ جلّاد کا رعب
خود بخود کون مرے سر کو جھکا دیتا ہے

دردِ دل کو ہوئی تسکیں جو گئی جانِ حزیں
زہر دیتا ہے مسیحا کہ دوا دیتا ہے

میرے مٹنے کا سبب ہو گئی خود میری حیات
زیست کا راز ہی تعلیمِ فنا دیتا ہے

حسن اور عشق کا ہے وصل بھی ہمنگامۂ راز
کوستا ہے کوئی اور کوئی دعا دیتا ہے

عرصۂ قتل میں کیوں نیند نہ آئے حافظ
وہ مجھے دامنِ خنجر کی ہوا دیتا ہے

جناب جوش ملیح آبادی

جواں ہوں ہر چند، پھر بھی چہرہ ہے جوش بے آب تابیدا
مری عروسِ سخن کے رُخ پر جھلک رہا ہے شباب میرا

جہاں تھا داؤد سامنیؑ جہاں تھا یوسف سا حسنِ مطرب
اُسی گلستاں میں ہر نغمہ ہوا ہے اب انتخاب میرا

اُدھر مری نغمہ سنجیوں سے تری جبیں پر ہے اک تڑپ سی
اِدھر ترے رُخ کی روشنی میں چمک رہا ہے رباب میرا

تری تجلی کہاں نہیں ہے، تری کچھ آنکھیں خطا نہیں ہے
محل ہی میرا غبارِ ہستی، مری نظر ہے حجاب میرا

جو اشکِ غم میں چمک رہا تھا، ٹپک پڑا صبحِ چشمِ تر سے
مری فراست میں شیب آکر اضافہ کچھ بھی نہ کر سکیگا

سحر کی تنویر پھیلتے ہی ہوا غروبِ آفتاب میرا
کچھ ایسے پیچیدہ راستوں سے گذر رہا ہے شباب میرا

تلاش میں جوش نے اپنی ہزاروں دروازوں صدا دی
یہ کاش پہلے ہی مجھ پہ کھلتا کہ دل ہی میرا ہے باب میرا

جناب نظر لکھنوی

ہوا کو چارہ سازی، لیکن اثر نہیں ہے
ہاں درخورِ مداوا زخمِ جگر نہیں ہے

مدت سے ڈھونڈتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے

سُن لو کہ رنگِ محفل کچھ معتبر نہیں ہے
ہے اک زبان گویا شمعِ سحر نہیں ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی
زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھکو خبر نہیں ہے

آہیں بھریں بہت کچھ، دم توڑنا ہے باقی
اس آہ میں بھی دیکھوں، ہے یا اثر نہیں ہے

تاریک ہو گئی ہو دنیا ہی جب نظر میں
پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے

پردہ اُٹھا دے اِکدن تو اے حجابِ ہستی
پاتا ہوں اُسکو دل میں دیکھا مگر نہیں ہے

مرنے پہ جسمِ خاکی کیا ساتھ روح کا دے
راہِ عدم میں غافل گردِ سفر نہیں ہے

پھر بھی غمِ جدائی، دوری و نارسائی
ہر چند کوئی بجھ سے نزدیک تر نہیں ہے

ہر چیز کو جہاں میں ہر وقت ہے تغیّر
لیکن شبِ جدائی تیری سحر نہیں ہے

کیا گو مگو میں ہے اے دل اسرارِ بیخودی بھی
سب کی خبر ہے مجھکو، اپنی خبر نہیں ہے

شرطِ وفا انہیں سے ہوتی نہیں ہے پوری
تو داد گر ہے ورنہ، بیداد گر نہیں ہے

دُنیا سے جا رہے ہو کیا بیکسانہ اے نظر تم
زادِ سفر نہیں ہے، رختِ سفر نہیں ہے

جناب احسن بھجھی ناظم حلقہ ادبیہ کانپور

میں کب کہتا ہوں مجھ سے لطف کر بیدار رہنے دے — مجھے ناکام رہنے دے، مجھے ناشاد رہنے دے
دلِ غم دوست کو لذت کشِ بیداد رہنے دے — وفا کی قدر کر اہلِ وفا کو شاد رہنے دے
نہ کر پابند اے ذوقِ طرب آزاد رہنے دے — کہ میں مانوسِ حرماں ہوں مجھے ناشاد رہنے دے
میں اس دنیا کو دنیا زندگی کو زندگی سمجھوں — مگر جب چین سے مجھکو دلِ ناشاد رہنے دے
تو مشقِ جور کر مشقِ تغافل کر تجھے کیا ہے — جسے ناشاد رہنا ہو اُسے ناشاد رہنے دے
امیدِ کامیابی کیوں ستاتی ہے مرے دل کو — بس اب ذکرِ مآل کوششِ بیداد رہنے دے
ابھی ٹوٹی ہوئی امید میں کچھ جان باقی ہے — ابھی سامانِ ماتم اے دلِ ناشاد رہنے دے
مرا کاشانۂ دل ایک دنیائے تمنّا ہے — مگر جب خانہ ویرانی اسے آباد رہنے دے
تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے — جو بربادِ تمنّا ہو اُسے برباد رہنے دے

وہی افسانۂ غم تو نے احسن آج بھی چھیڑا
ارے خاموش، یہ حسرت بھری روداد رہنے دے

جناب زکی اشرفی کچھوچھوی

کہاں ہے آج مرا دلستاں نہیں ملتا — کوئی بتادے کچھ اُسکا نشاں نہیں ملتا
میں اپنے دل کی کہانی کہوں تو کس سے کہوں — جہاں میں مجھکو کوئی رازداں نہیں ملتا
نگاہِ شوق نے ہر رنگ میں اُسے دیکھا — جگہ وہ کونسی ہے وہ جہاں نہیں ملتا
تھرتھر کے میں بیتاب جس سے ہوتا تھا — یہ کیا ہوا کہ وہ دردِ نہاں نہیں ملتا
حرم میں دیر میں کعبے میں ہر جگہ ڈھونڈھا — مگر کہیں وہ مرا جانِ جاں نہیں ملتا
ہزار درد سہی نالہ ہائے بلبل میں — خموش پھولوں کا رنگِ بیاں نہیں ملتا
ہزاروں سجدے ہیں بیتاب سنگِ در کیلئے — مری جبیں کو ترا آستاں نہیں ملتا

زکی کے منہ سے نہ مے چھوٹتی مگر افسوس
اودھ[1] کی جیل میں پیرِ مغاں نہیں ملتا

---

[1] یہ غزل آپ نے لکھنؤ سنٹرل جیل میں فرمائی تھی۔

جلوہ گاہ اثر

۱۰ جنوری ۱۹۲۳ء کو حافظ محمد صدیق صاحب صدیق میونسپل کمشنر کے دولتکدہ پر بہ تقریب تبادلہ مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر (ڈپٹی کلکٹر) ایک مختصر سا الوداعی مشاعرہ منعقد ہوا تھا جسمیں طرح کی قید نہ تھی، غیر طرح کی غزلیں پڑھی گئیں، حضرت احسن مارہروی نے اظہار خلوص اور جوش عقیدت کی بنا پر ایک دلچسپ غزل پڑھی جسکی ردیف جناب اثر کے تخلص کی ممنون تھی، شروع کے چند اشعار میں اثر سے جناب اثر مراد ہیں اور باقی شعروں میں اثر کے عام معنی لے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ نظم فوری جوش فکر کا نتیجہ تھی تاہم ادب نواز حضرات کو بہت پسند آئی، ذیل میں ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے شائع کی جاتی ہے۔

میری ہر سانس ہے اک جلوہ گہ عام اثر — واہ رے شان اثر یاد اثر نام اثر
مست ہے بزم ادب، دور میں ہے جام اثر — دیکھئے فیض اثر، دیکھئے انعام اثر
عام ہے ملک سخن میں، کرم عام اثر — نثر ہے فیض اثر نظم ہے انعام اثر
پھول بھر دے مرے مینائے سخن میں ساقی — آج مجھکو بھی پلا دے مئے گلفام اثر
ہیں محمور سخن جعفر علیخاں یارب — بزم معنی میں چھلکتا ہی رہے جام اثر
گو فلک ان سے چھیڑ آتا ہے جدا ہوتے ہیں — ہم نہ بھولیں گے مگر یاد اثر نام اثر

طائر آہ کو ہے شوق عروج پرواز — عرش پر آج بچھا آئے کوئی دام اثر
تم وہ قاتل، کہ تمھاری نگہ ناز میں سحر — میں وہ بسمل، کہ مری آہ ہے ناکام اثر
آہ وہ آہ، کہ منت کش تاثیر نہو — نالہ وہ نالہ، کہ لے سر پہ نہ الزام اثر
شوق مجبور کو مصروف فغاں رہنے دے — یاس کیوں یاد دلا دیتی ہے انجام اثر
عرش تک جا کے پلٹ آئی دعائے مایوس — شاید اس سے بھی بلندی پہ ہو کچھ بام اثر
طپش دل کہیں محفل میں تماشا نہ بنے — آنہ جائے نگہ یاس پہ الزام اثر

شوق ہر چند ہے آغاز فغاں کی تمہید
مگر احسن مجھے معلوم ہے انجام اثر

علمی نوٹ اور خبریں۔

نواب وقار الملک مرحوم کی ذات ایک ایسی جامع الصفات ذات تھی جو بیشک حقیقۃً نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام ہندوستانیوں کو ناز ہو سکتا ہے۔ ہمکو یہ معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی کہ منشی محمد امین صاحب زبیری مہتمم صیغۂ تصنیف و تالیف بھوپال نے مرحوم کی ایک مفصل سوانح عمری لکھی ہے۔ اور اب یہ سوانح عمری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جانب سے جلد شائع ہونے والی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اب منشی محمد امین صاحب موصوف نواب محسن الملک مرحوم کی سوانح عمری کے ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔

اسی کے ساتھ علمی حلقوں میں یہ خبر بھی دلچسپی کے ساتھ سنی جائے گی کہ نواب صاحب مرحوم و مغفور کے خطوط کو بھی منشی محمد امین صاحب موصوف ترتیب دیکر شائع کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے ایک معقول ذخیرہ خطوط کا فراہم کر لیا ہے اور مزید فراہمی کی سعی کر رہے ہیں۔

نظام المشائخ اور خطیب کے بابتہ گزشتہ نمبر میں جو نوٹ شائع ہوا تھا اُسکے متعلق انکے ایڈیٹر اور ہمارے مکرم جناب واحدی صاحب نے ایک تسکایتی خط لکھا ہے جسمیں آپ نے ہمارے عائد کردہ الزام کو نہ صرف قبول فرمایا ہے بلکہ لکھا ہے کہ نظام المشائخ اور خطیب ہی نہیں بلکہ ایک تیسرا رسالہ "گلچیں" نامی بھی اسی طرز سے آپ کے اہتمام میں شائع ہوتا ہے۔ آپ اسمیں کوئی ہرج نہیں سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان تینوں رسالوں کے خریدار مشترک نہیں ہیں۔ اور بڑے بڑے اخبارات دوسرے پرچوں کو مول لیکر اعلان کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ فلاں فلاں پرچہ شامل ہے۔ آپ نے نظام المشائخ کی طرح خطیب و گلچیں کو بھی باقی رکھا ہے۔ اور اسکے پڑھنے والے اسے خوب جانتے ہیں۔

جناب واحدی صاحب کی یہ ہمت مردانہ قابل ستائش ہے کہ ایک ہی مضامین کے علیحدہ علیحدہ ناموں سے آپ تین مختلف رسالے شائع کر رہے ہیں۔ اور گو انکے خریدار مختلف ہوں اور قریب قریب اسکی اصلیت سے واقف بھی ہوں تاہم یہ صورت کسی طرح پسندیدہ نہیں کہی جاسکتی ہے۔ ہمکو افسوس ہے کہ ہم اب بھی اسکو ادبی خوش معاملگی کے خلاف سمجھتے ہیں کہ ایک ہی چیز تین مختلف ناموں سے فروخت کی جائے۔ ہماری رائے میں یہ ایسی دوکانداری ہے جسکی ہرگز حوصلہ افزائی نہ ہونا چاہیے۔

ایک کرم فرما، ہمیں مسلم یونیورسٹی کے اُردو نصاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔ "قومی یونیورسٹی میں اُردو کا خیال تو ہو رہا ہے مگر کامیابی ایک خواب ہے، جسکا اصل سبب متحنین اور ارباب حل وعقد کی کم نظری اور مغرب پرستی ہے، انٹرمیڈیٹ کا طالب علم دیکھئے اور شکوہ وجواب شکوہ اسکا نصاب ملاحظہ کیجئے، بی۔ اے کا متعلم اشعار غالب پڑھ رہا ہے، کیا حقیقت میں اب شاعری اُردو سکھا سکتی ہے"

ہم اپنے محترم دوست کی رائے سے ایک حد تک متفق ہیں، ہماری رائے میں اُردو زبان حاصل کرنے کے لئے نظم ونثر دونوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ حصہ نظم میں شکوہ اور جواب شکوہ اور اشعار غالب کا انتخاب اچھا ہے۔ مگر نثر کی مستند کتابیں بھی اسکے ساتھ نصاب میں داخل ہونا چاہئے یہ صورت مفید نہیں کہ نصاب تعلیم میں صرف نظمیں ہوں اور نثر نہ ہو۔

ہمارے ایک دوست ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ ہندوستان کے رسالوں کو بھی افسانہ نگاری کی وہ روش اختیار کرنا چاہیے جو یورپ کے ایک مشہور رسالہ اسٹراڈ نے اختیار کی ہے، اُسکے اڈیٹر نے پہلے ایک مشہور افسانہ نگار ای فلیپس اوپن ہینٹ سے ایک افسانہ کا پہلا باب لکھوایا، پھر ایک دوسرے افسانہ نگار سے دوسرا باب لکھنے کی درخواست کی، اسی طرح مسلسل یکے بعد دیگرے تمام مشاہیر اہل قلم کو اس ادبی دعوت میں شریک کرلیا۔ حتیٰ کہ کہانی پوری ہوگئی۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ ایک طریقۂ امتحان ہے، لیکن خیالات کا تصادم اور امتزاج قابل قدر ہوگا۔ ایک کے خیالات کی دوسرے کو خبر نہوگی اور اس طرح ہر شخص گزشتہ ابواب کے رہنمائی کی مدد سے اپنے خیالات کیلئے میدان

تلاش کریگا، یہ طریقۂ کار سخت تو ضرور ہے مگر اس سے افسانہ نگاری میں یقینی ترقی ہوگی، ہمارا ارادہ ہے کہ ہم آیندہ کسی افسانے کا ایک باب پیش کرکے خاص خاص افسانہ نگاروں کو اس دعوت ادب میں شریک کریں، گو ہم ابھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اس کوشش میں کہاں تک کامیابی ہوگی کیونکہ ہندوستان میں ابھی اہل قلم کے لئے وہ ترغیبات مفید نہیں ہیں جو انگلستان میں موجود ہیں اور جنکی وجہ سے بڑے بڑے نامور اہل قلم مشکل سے مشکل تجویز پر عمل کرنے کے لئے مستعد ہوجاتے ہیں۔

ہم ایک مدت سے اودھ پنچ کا بالاستعاب مطالعہ کر رہے ہیں، منشی سجاد حسین صاحب مرحوم بانی اودھ پنچ کی وفات کے بعد موجودہ اڈیٹر صاحب نے جس خوبی سے اسکی گزشتہ آن بان قائم رکھی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ بلاشبہہ منشی سجاد حسین مرحوم جیسے اُردو کے سرمایۂ ناز ادیب کی یادگار اس سے بہتر قائم نہیں ہوسکتی، کہ اُنکے لگائے پودے کو پروان چڑھانے کی کوشش کیجائے۔

ہندوستان کی آب وہوا پنچ اخباروں کے لئے زیادہ مفید نہیں، اکثر ظریفانہ اخبار نکلے اور چار دن اپنی بہار دکھاکے رخصت ہوگئے۔ لیکن اودھ پنچ آج تک اپنی سابقہ روش پر قائم ہے۔ پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اور ہر اشاعت میں معاملات حاضرہ پر ظریفانہ رائے زنی کے علاوہ، ایک دلکش کارٹون بھی پیش کرتا رہتا ہے، ہم شائقین ادب کو اودھ پنچ کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔

حال میں حق تصنیف کے متعلق ایک دلچسپ مقدمہ عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ میں دائر تھا۔ مولانا شرر نے لکھنؤ کے ایک تاجر کتب اور دو مالکان مطابع پر اپنے مصنفہ ناول فلورا فلورنڈا کو بلا اجازت چھاپنے اور فروخت کرنے پر ڈیڑھ ہزار روپیہ کا دعویٰ کردیا تھا۔ ڈسٹرکٹ جج نے مولانا کے خلاف فیصلہ صادر کیا تھا اور مدعا علیہم کو خرچہ مقدمہ بھی دلایا تھا۔ اسپر مولانا ممدوح نے عدالت جوڈیشل میں اپیل کی لیکن فیصلۂ اپیل سے پہلے فریقین میں باہمی راضی نامہ ہوگیا جسکی رو سے نہ مولانا کو خرچہ ادا کرنا پڑا۔ اور نہ مدعا علیہم کو کتاب متنازعہ کے چھاپنے اور فروخت کرنے کا اختیار باقی رہا۔ اِسی سمجھوتہ کے مطابق عدالت عالیہ نے بھی اپنا فیصلہ صادر کردیا۔

کئی اُردو رسالوں کا مختصر ذکر ہم پچھلے نمبر میں کر چکے ہیں۔ اس طرف ہندی کے بھی کئی قابل قدر پرچے جاری ہوئے ہیں۔ پرانے پرچوں میں بھی غیر معمولی ترقی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ نولکشور پریس لکھنؤ سے جولائی گزشتہ میں مادھری نامی ایک اعلیٰ درجہ کا ضخیم بالتصویر رسالہ جاری ہوا ہے۔ اس پرچے کی ترتیب مضامین، نفیس چھپائی اور دلکش تصویریں دیکھکر طبیعت خوش ہوتی ہے۔ ہر پرچہ میں دو تین رنگین اور بہت سی سادہ تصویریں ہوتی ہیں اور ہندی کے بہترین اہل قلم کے مضامین اسمیں شائع ہوتے ہیں۔ قیمت ساڑھے چھ روپیہ سالانہ ہے۔

اس سال کے شروع سے ہندی کے پرانے رسالہ سرسوتی الہ آباد نے بھی غیر معمولی ترقی کی ہے۔ کارکنان سرسوتی نے صفحات اور تصاویر دونوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے۔ جس سے اس پرچہ کی دلچسپی پیشتر کے بہ نسبت اب بہت بڑھ گئی ہے۔ اسمیں بھی دو تین رنگین اور متعدد سادہ تصاویر ہوتی ہیں۔

رسالہ پریما بھی ہندی کا ایک نہایت قابل قدر پرچہ ہے جو ہر ماہ کے شروع میں پرتاپ پریس کانپور سے شائع ہوتا ہے۔ اسمیں بھی ایک رنگین اور کئی سادہ تصاویر اور بہت سے مفید اور دلچسپ مضامین ہر ماہ شائع ہوتے ہیں۔ آج کل اس رسالہ میں رباعیات عمر خیام کے متعلق تصاویر کا ایک نہایت دلکش سلسلہ شائع ہو رہا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسکی بعض تصویریں ہدیۂ ناظرین زمانہ کر سکیں۔

شکر ہے کہ اس صوبہ میں اب اُردو کی ترقی اور توسیع کا خیال پیدا ہو رہا ہے، الہ آباد یونیورسٹی نے ایک اُردو ایسوسی ایشن، قائم کی ہے، جسکا ذکر ہم نے بزم احباب کے سلسلہ میں خاص طور پر کیا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی نے بھی ترقی اردو کے لئے ایک انجمن قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے، خدا اِن اسکیموں کو بار آور کرے اور نتیجہ مفید ثابت ہو،

بزم احباب

احباب کی عنایتیں عموماً مسرت آفریں ہوتی ہیں لیکن بقول غالب مرحوم ؎

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

جب ایک مخلص کی آواز پر احباب کی تلطف آمیز نگاہیں اٹھتی ہیں تو پھر اسکی خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی، چنانچہ ہمارے وہ احباب جو ہماری عرض حال کو تقاضائے توجہ سمجھ کر ملتفت ہوئے ہیں، خاص شکریہ کے مستحق ہیں، اسلئے شکریہ اظہار مسرت کا ایک لطیف پیرایہ ہے، ناسپاسی ہوگی اگر ہم اُن احباب کے التفات خاص کا تفصیلی ذکر نہ کریں،

الہ آباد یونیورسٹی کے اُردو ایسوسی ایشن کے افتتاحیہ جلسہ میں (جو بصدارت جسٹس محمد رفیق صاحب جج ہائیکورٹ الہ آباد منعقد ہوا تھا) مسٹر عبداللہ یوسف علی - آئی، سی، ایس، سابق معین المہام مال سلطنت حیدرآباد دکن نے اپنی تقریر میں زمانہ کی ادبی خدمات کا مخلصانہ اعتراف کیا اور ہماری ناچیز کوششوں کی داد دی، ہم اس حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، خدا کرے ان بزرگوں کا ارشاد پُر اثر ثابت ہو اور زمانہ کی مشکلات آسان ہو جائیں،

کمشنر صاحب قسمت الہ آباد کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا فرض ہے، کیونکہ آپ نے ڈسٹرکٹ بورڈ کو (ڈسٹرکٹ بورڈ اسکولوں کے لئے) زمانہ کی خریداری پر توجہ دلائی ہے -

بعض احباب نے زمانہ کی توسیع اشاعت میں خاص حصہ لیا ہے - ہم اظہار مسرت کے ساتھ، اُنکی خدمت میں بھی مخلصانہ شکریہ پیش کرنے پر مجبور ہیں -

بابو جگدیش پرشاد صاحب - ایم - اے ڈپٹی کلکٹر نے دو خریدار عنایت فرمائے ہیں -

بابو رادھا کمار صاحب نگم نے ایک خریدار عنایت فرمایا ہے -

بابو بنسی لال صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جنوری کا پرچہ وی پی دھول ہوا شکریہ ادا کرتا ہوں، آپ نے خریداران قدیم کو متوجہ فرمایا ہے کہ دو دو نئے خریدار عنایت کریں - میں بالفعل ایک خریدار پیش کرتا ہوں - آپ بذریعہ وی پی رسالہ روانہ فرمائیں -

اس سلسلہ میں مولوی محمد ذکی صاحب (مشرقی (کھجوھوی) اور مولوی محمد لطیف صاحب (بحری آبادی) بھی شکریہ کے مستحق ہیں - آپ حضرات زمانہ کی توسیع اشاعت میں سرگرم ہیں -

ملا واحدی صاحب اڈیٹر خطیب و نظام المشائخ، کی خدمت میں ہم مخلصانہ شکریہ پیش کرتے ہیں - آپ زمانہ پر خاص توجہ فرماتے رہتے ہیں -

آخر میں ہم اپنے اُن احباب کو پھر توجہ دلاتے ہیں جو کسی وجہ سے ابتک خاموش ہیں - خدا کرے مزاج بخیر ہو - اور جلد سے جلد زمانہ کی طرف متوجہ ہوں -

کتب خانہ
یکر دار العلوم عثمانیہ

زمانہ

جلد ۱۴ مارچ و اپریل سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۳ و ۴

اکبر مرحوم کے خطوط

حضرت اکبر الہ آبادی کی ذات اُردو شاعری اور ہندوستانی سوسائٹی کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ انکی مرگ مفاجات سے اُردو شاعری کو بالخصوص ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ امید نہیں کہ یکی عرصہ دراز تک پوری ہوسکے۔ ایک شاعر۔ ایک فلاسفر۔ ایک پالیٹیشن۔ ایک روشن ضمیر اور ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے مرحوم کا پایہ بہت بلند تھا۔ اوصاف اضافی کے لحاظ سے وہ زمانۂ حال کی تہذیب و شائستگی کا ایک مکمل نمونہ تھے۔ علوم مشرقی و مغربی میں اُنکی نظر یکساں وسیع تھی۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو اور انگریزی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز اور اعلیٰ سوسائٹی میں شامل رہنے سے اُن کا معیار تہذیب بہت اونچا ہوگیا تھا۔ علم مجلس کے بادشاہ تھے۔ ظرافت اُنکی فطرت میں داخل تھی۔ سنجیدگی اُنکی طبیعت کا جزو اعظم تھی۔ اور یہ دونوں متضاد رنگ اُنکی طبیعت کے سانچے میں اس طرح ڈھل گئے تھے کہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کیا شاعری میں۔ کیا روزمرہ کی گفتگو میں۔ کیا احباب کی صحبت میں۔ کیا اغیار کی مجالست میں، ہر جگہ اُنکی طبعی ظرافت و سنجیدگی اُنکے طرز بیان میں اسقدر شوخی و دلکشی پیدا کردیتی تھی جسکی تصریح الفاظ سے ناممکن ہے۔ مرحوم کے پرائیویٹ خطوط میں بھی اسکی جھلک نظر آتی ہے جنکے دو مجموعے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔

اس سے پہلے بلکہ سب سے پہلے قابل ایڈیٹر صاحب "زمانہ" نے "حضرت اکبر کے چند خطوط" کے عنوان سے لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط اپنے نامور رسالہ میں شائع کر کے سبقت حاصل کی تھی جو غیر معمولی دلچسپی کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔ حال میں جناب احسن مارہروی نے بھی رسالہ "زمانہ" کے صفحات پر اکبر مرحوم کے چند خط شائع کرائے تھے جنکی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے "خطوط اکبر" کی ایک پوری جلد شائع کی ہے جو کتابی حیثیت میں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہوئی ہے اور جسمیں خطوط اکبر کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ علی ہذا دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے بھی "مکاتیب اکبر" کے نام سے اکبر مرحوم کے اُن خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے جو مرزا محمد ہادی صاحب عزیز کے نام موصول ہوئے تھے۔ ان دونوں مجموعوں کیساتھ اکبر مرحوم کے آخری زمانے کے خود بھی شائع ہوئے ہیں جو غیر معمولی دلکشی رکھتے ہیں۔ دونوں کے ساتھ دیباچے بھی ہیں جنمیں ان خطوط کی نسبت رائے زنی کی گئی ہے اور انکے خصوصیات بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت اکبر کے ایک حقیر نیاز مند کے طور پر میں نے ان تمام خطوط کو نہایت ذوق شوق کے ساتھ اول سے آخر تک پڑھا ہے اور "المکتوب نصف الملاقات" کا لطف اُٹھایا ہے۔ اِن میں اکبر مرحوم بولتے نظر آتے ہیں اور انکی خاموش آواز سُنائی دیتی ہے۔ اُن میں مرحوم کے فلسفیانہ نکتے، ظریفانہ چٹکلے، سنجیدہ خیالات اور عالمانہ مباحثات موجود ہیں مگر خال خال۔ زیادہ تر خطوط پرائیویٹ ہیں اور پرائیویٹ یا نج کی باتوں ہی کا زیادہ غلبہ ہے۔ اختصار بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اور ایسے اشارات کی خاص کثرت ہے جنھیں مکتوب الیہ کے سوا دوسرے لوگ مشکل سمجھ سکتے ہیں غالباً یہی وجہ تھی کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنے خطوط کی اشاعت پسند نہیں کی حالانکہ بعض اصحاب کا سخت تقاضا تھا کہ وہ اسکی اجازت دیں۔ اور خطوط اکبر کا کوئی مجموعہ اُنکی حیات میں شائع ہو جائے مولانا حسن نظامی صاحب کے دیباچے سے واضح ہے کہ حضرت اکبر کے خطوط کی اشاعت کا سامان اُنکی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ اور ایک خاص حصہ مکتوبات کی اُنھوں نے اپنے قلم سے اصلاح و نظر ثانی بھی کر دی تھی۔ مگر اسباب ایسے پیش آتے رہے کہ سالہا سال تک ان کا چھپنا ممکن نہ ہو سکا۔ خیر یہ تو خدا کی مرضی اور وقت پر منحصر تھا۔ کوئی کام اپنے وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرحوم کی وفات کے بعد ہی اُنکے خطوط کی اشاعت کا ایک عام خیال پیدا ہو گیا تھا اور کئی اصحاب نے مجھ سے

بھی مرحوم کے خطوط طلب کئے تھے۔ میرے خیال میں اکبر مرحوم کے خطوط کا کوئی ایسا مجموعہ زیادہ دلچسپ اور مفید عام ہوتا جسمیں اُنکے مختلف اور عام دلچسپی کے خطوط شائع کئے جاتے جو مختلف لوگوں کے نام ہوتے جس طرح مرزا غالب کے خطوط "اُردوے معلیٰ" اور "عود ہندی" میں جمع کئے گئے ہیں۔ بعض علم دوست اصحاب نے یہی کوشش کی تھی مگر غالباً اُنکو کامیابی نہیں ہوئی۔ اب بھی بعض اصحاب اکبر مرحوم کے سوانحی حالات وغیرہ جمع کرنے کی فکر میں ہیں اور اکثر اخبارات میں اسکے متعلق اشتہار بھی دیئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ "یادگار غالب" کی طرح لسان العصر حضرت اکبر کے متعلق بھی کوئی قابل قدر کتاب شائع ہو سکے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ خطوط اکبر کا دوسرا حصہ شائع کرینگے جسمیں دیگر حضرات کے نام کے خطوط ہونگے۔ اور وہ "نہایت دلچسپ اور قابل دید ہیں"۔

بہرنوع خواجہ حسن نظامی صاحب نے خطوط اکبر کی ترتیب میں غیر معمولی احتیاط اور محنت سے کام لیا ہے اور حتی الامکان ایسے خطوط شائع کئے ہیں جنمیں ایک حد تک ادبی شان موجود ہے۔ نیز جا بجا حواشی کے اضافہ سے مطالب کو بھی واضح کر دیا ہے۔ دراصل خواجہ صاحب کو خطوط کی اشاعت کا خاص ملکہ ہے۔ "آداب خطوط نویسی" کے کئی حصے انکے قلم سے نکلے ہیں۔ بہادر شاہ اور ۱۸۵۷ء کے باغیوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی تھی اسکو انھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ علیٰ ہذا محاصرۂ دہلی کے متعلق انگریزی افسروں کے مابین جو خط و کتابت ہوئی تھی اُسکا ترجمہ بھی آپ نے شائع کیا۔ تاہم "خطوط اکبر" کی ترتیب میں جو نقص بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے وہ خطوط کا غیر مسلسل ہونا ہے۔ یعنی تمام خطوط سلسلہ وار نہیں ہیں بلکہ بیشتر خطوط جو بعد کو درج ہونا چاہئے تھے پہلے اور جو پہلے درج ہونا چاہیئے تھے بعد کو درج ہوئے ہیں جس سے مطالب کا سلسلہ غیر مربوط ہو گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس بے ترتیبی کے متعلق کتاب کے آخری صفحہ پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ لیکن اگر وہ کاپیوں کی تحریر پر کافی نگرانی رکھتے تو یہ صریحی نقص پیدا نہ ہو سکتا۔ کاپیوں کے لکھ جانے پر بھی یہ نقص تھوڑی سی قطع برید میں رفع ہو سکتا تھا لہذا محض کاتب کو مورد الزام بنانا قرین انصاف نہیں ہے۔

ان خطوط کے خصوصیات بجائے خود ایک معرکۂ آرا بحث کی محتاج ہیں۔ سب سے پہلے انشا پردازی کا مسئلہ ہے۔ اگلے زمانے میں تعلیم خطوط نویسی کی غرض سے فن انشا کی بعض کتابیں درسیات میں

داخل تھیں - دستور الصبیاں - انشائے مادھورام - رقعات عجمیں زاین - انشائے ابوالفضل وغیرہ فارسی تعلیم میں اسی غرض سے شامل تھیں کہ طلبا کو خط لکھنے میں مہارت حاصل ہو جائے - اردو فارسی انشا پردازی سے واقف ہوں - اس لحاظ سے "خطوط اکبر" جدیدیان اردو کے لئے زیادہ مفید نہیں ہیں - حضرت اکبر کے خطوط کی جس خصوصیت پر بالعموم زور دیا گیا ہے وہ "اختصار" ہے یعنی مرحوم بہت بڑے مطلب کو چند الفاظ میں ادا کر دیتے تھے - یہ ایک مابہ الامتیاز ادبی خصوصیت ہے - اگر کاتب کا مفہوم ہر شخص اسی طرح سمجھ سکے جس طرح مکتوب الیہ سمجھ سکتا ہو - لیکن حضرت اکبر کے خطوط میں جہاں اختصار ہے وہاں زیادہ تر صرف اشارات ہیں جنھیں مکتوب الیہ کے سوا دوسرا شخص باوجود کوشش بھی نہیں سمجھ سکتا - دراصل آج کل کی خطوط نویسی کی یہ عام خصوصیت ہے - کہ وہ زوائد سے پاک ہوتی ہے اور یہ محض مغربی تعلیم کا اثر ہے - یہی وجہ ہے کہ زمانہ حال کی خطوط نویسی محض کاتب و مکتوب الیہ تک محدود ہوتی ہے جس میں پرائیویٹ باتوں کا ذکر اشارات میں کیا جاتا ہے - حضرت اکبر کے خطوط میں اختصار کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ آخری عمر میں (جس زمانے کی خطوط کتابت شائع ہوئی ہے) مرحوم کا دل و دماغ بہت کمزور ہو گیا تھا اور طبیعت پر بھی انتہائی حد تک کمزوری غالب آگئی تھی - اسلئے وہ زیادہ دیر تک دل و دماغ کو کسی طرف متوجہ نہیں رکھ سکتے تھے - انکی شاعری میں بھی یہی بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے - جو خیال ذہن میں آیا فوراً نظم کر لیا - ضرورت ہوئی تو سلسلے کے دو چار شعر اور کہہ لئے ورنہ ایک ہی دو شعر میں مطلب ادا کر دیا - مسلسل اور طولانی نظمیں کلام اکبر میں خال خال ملیں گی اور وہ بھی اس زمانے کی جب انکا دل و دماغ قوی تھا اور طبیعت طولانی فکر سخن کی متحمل ہو سکتی تھی - اسی طرح خطوط میں بھی حضرت اکبر اختصار ہی سے کام لیتے تھے اور اکثر اگر ایک خط میں پورا مطلب ادا نہیں ہوتا تھا تو اس سلسلے میں دو دو تین تین خط لکھتے تھے - خواجہ صاحب کے اسی خطوط سے اسکا کافی ثبوت ملتا ہے - اور آپ نے اپنے دیباچہ میں بھی اسکا اعتراف کیا ہے - البتہ ان خطوط میں کہیں کہیں انشا پردازی کا خاص تکلف ہے اور وہ ظریفانہ لطیفوں کی صورت میں یا بعض الفاظ و تراکیب کی جدت میں - سب سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی شاعری کی طرح نثر کی خط و کتابت میں بھی انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کر جاتے تھے - یہاں تک کہ اگرچہ ایک خط میں خواجہ سید حسن نظامی صاحب کو لکھتے ہیں کہ "الحمد للہ کہ آپ انگریزی داں نہیں ہیں" تاہم ان خطوط میں انگریزی الفاظ عموماً

مستقل ہوئے ہیں جو خواجہ صاحب کے نام لکھے گئے ہیں۔

"خطوط اکبر" کی عام خصوصیات سے قطع نظر کرکے انکے خاص مطالب پر نظر کی جائے تو کاتب و مکتوب الیہ کے ذاتی تعلقات کا مسئلہ سب سے پہلے پیش نظر ہوتا ہے۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ جناب خواجہ صاحب اور حضرت اکبر کے تعلقات تصوف اور روحانیت پر مبنی تھے۔ لیکن ان خطوط سے اسکا پتہ لگانا دشوار ہے کہ کون کسکا روحانی معلّم یا پیشوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونو ایک دوسرے کو اپنا پیر طریقت سمجھتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے دیباچے میں اس معاملہ پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

"گو وہ (حضرت اکبر) بعض اوقات عام مجمع میں میرے مریدوں سے کہدیا کرتے تھے کہ میں بھی تمھارا پیر بھائی ہوں اور حسن نظامی میرے بھی پیر ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مجھکو خاص مریدوں کی طرح سلوک تصوف کی تعلیم دی ہے اور میں نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ وہ میرے مرشد معنوی ہیں"

مولانا حسن نظامی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "سنہ ۱۹۱۰ء سے میری نیازمندی کا عہد شروع ہوتا ہے" لیکن خطوط زیر نظر میں سنہ ۱۹۱۰ء کا کوئی خط نہیں ہے۔ بلکہ انکا سلسلہ ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس تمام سال کے متعلق صرف دو خط ہیں۔ ایک ۱۰ جنوری کا اور دوسرا ۱۶ دسمبر کا۔ اول الذکر خط جس سے کتاب شروع ہوتی ہے حسب ذیل ہے:۔

مُرید پر درسلامت۔ ارادت دلی۔ کوئی عنایت نامہ آپ کا نہیں پہونچا۔ خوشی ہوئی کہ آپ اچھے ہیں۔ خدا اچھا رکھے۔ اب کوئی صورت آنے کی نظر نہیں آتی۔ اس سے بہت ایسی ہوئی۔ ہم کے سبب سے مقید ہوں کسی تعطیل میں اُن کو ساتھ لیکر آسکتا ہوں۔ بہت گھبراتا ہوں کہ کیا کروں حورا بانو کو دعا۔ خاکسار اکبر۔ ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۱۱ء

دوسرے خط میں صرف ایک شعر درج ہے اور کچھ نہیں۔ وہ یہ ہے:۔

قدم انگریز کلکتے سے دہلی میں جو دھرتے ہیں تجلیات خوب کی اب دیکھیں شناہی کیسے کرتے ہیں

اکبر ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء

اس طرح خواجہ صاحب کی "نیازمندی" کے آغاز سے دو سال کے اندر ہمکو صرف دو خط ملتے ہیں

اور خطوط کا اصلی سلسلہ ۲۹ فروری ۱۹۱۲ء سے شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سلسلے میں بھی ۳ اگست ۱۹۱۴ء تک صرف دس خط درج ہیں جو اڑھائی سال کے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ یعنی پورے ساڑھے چار برس کے اندر کل ۱۲ خط۔ اس پر زیادہ تعجب کا مقام نہ تھا اگر خواجہ صاحب اپنے دیباچہ میں یہ نہ لکھتے کہ :-

"۱۹۱۰ء سے میری نیازمندی کا عہد شروع ہوتا ہے اور حساب کیا جائے تو ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۱ء تک گیارہ برس کا زمانہ کچھ بڑی مدت نہیں ہے۔ حضرت اکبر کی بعض لوگوں سے خط و کتابت پچاس برس رہی مگر میری خوش نصیبی اور اللہ کا فضل ہے کہ مجھ سے زیادہ حضرت کے خطوط اور کسی کے پاس نہیں ہیں"

خواجہ صاحب نے حساب کیا تو دوسروں کو حساب جانچنے کا موقع ملا۔ یعنی ابتدائی ساڑھے چار سال کی کائنات تو صفر کے برابر ہے باقی ساڑھے چھ سال البتہ شمار میں آسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اتنا طویل زمانہ محترم مکتوب الیہ کی "تلقین باطنی" میں گذر گیا ہو اور خواجہ صاحب نے جیسا کہ اُنکے دیباچہ سے ظاہر ہے "اصول مشائخ کے بموجب صرف اپنا ذاتی حق خیال" کرکے اس طولانی مدت کی خط و کتابت کو ناقابل اشاعت سمجھا ہو۔ اگر ایسا ہے تو ہمکو شکایت ہے کہ ممدوح نے ان قیمتی تلقینات سے دوسروں کو بہرہ ور ہونے کا موقع نہیں دیا۔ مولانا حسن نظامی ایسے روشن ضمیر بزرگ سے ایسی امید نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً جبکہ آپ کی مشن خلق اللہ کو روحانی فیض پہونچانا ہے۔

یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ خواجہ صاحب نے حضرت اکبر کے خطوط کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اُسمیں مکاتیب کی تعداد کم ہے یا ان خطوط میں عام دلچسپی کی باتیں نہیں ہیں۔ لیکن یہ بالطمینان تمام کہا جاسکتا ہے کہ ان میں عام دلچسپی سے زیادہ پرائیویٹ باتیں ہیں جو محض کاتب و مکتوب الیہ کے ذاتی تعلقات اور ذاتی دلچسپی تک محدود ہیں۔ کوئی ایسا خط بمشکل مل سکتا ہے جس میں حضرت اکبر نے ناسازی مزاج کی شکایت نہ کی ہو۔ یا خواجہ صاحب کے ذاتی معاملات اور خانگی حالات کا ذکر نہ ہو۔ پھر ان خطوط کا بہت بڑا حصہ ایک خاص معاملے سے تعلق رکھتا ہے۔

اگست ۱۹۱۳ء میں مسجد مچھلی بازار کانپور کا ہولناک واقعہ ظہور پذیر ہوا جسنے مسلمانان ہند میں ایک

سخت ہل چل پیدا کردی تھی۔ خواجہ صاحب اس واقعہ کے روز الہ آباد سے چلکر میرٹھ جاتے ہوئے کانپور میں ٹھہرے تھے۔ اسپر بقول ممدوح حکام کو شبہہ ہوا کہ حضرت اکبر بھی واقعات فساد میں درپردہ شریک تھے" بہرنوع خواجہ صاحب حکام کے مورد عتاب ہوئے اور انکو ان صوبجات میں آنے کی ممانعت کردی گئی جسکا سلسلہ پانچ سال تک قائم رہا۔ حضرت اکبر بھی غلط یا صحیح طور پر اندیشہ ہوا کہ حکام ان سے بدظن ہیں اور انھوں نے حکام سے صفائی کے لئے بہت کوشش کی اور کوئی ذریعہ باقی نہ چھوڑا۔ اگرچہ اس مجموعہ میں اس سلسلے کے تمام خطوط کتابت نہیں شائع کی گئی ہے تاہم خطوط کا ایک بڑا حصہ اس پرائیویٹ معاملے سے تعلق رکھتا ہے جو عام دلچسپی سے دور ہے۔ اس سلسلے کا ایک خط حسب ذیل ہے۔

"کرمی سلمہ اللہ تعالیٰ۔ ہرگاہ یوپی آپ کے لئے مخدوش قرار پائی تو آپ مجھ سے کیوں اجازت طلب کرتے ہیں۔ میں حکومت کے خلاف کیوں ہونے لگا۔ مگر اسکا معتمد نہیں ہوں۔ کوئی خدمت نہیں کرسکتا ہوں۔ خانہ نشیں ہوں۔ ایک خیال آیا کہ کلکتہ سے پوچھوں۔ لیکن پھر ذہن میں آیا کہ اچھے بھلے ہو تو کیوں نہ عراق الملک سے استصلاح کے لئے دہلی کا سفر کرو۔ دو ہی چار دن ہیں اسی ضمن میں آپ سے ملاقات ہوجائیگی۔ کچھ تو بار دل اتر جائیگا۔ بہت سی ضروری باتیں تصوف کے متعلق ہونگی۔ ایک یورپین عالم نے ایک جواب کتاب اسکے متعلق حال میں تصنیف کی ہے وہ میرے ہاتھ میں ہے۔ حضرت سے لی ہے۔ واحدی صاحب۔ نیاز صاحب۔ عارف صاحب سے بھی ملئے اور باتیں کرنے کا نہایت مشتاق ہوں۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق کیا دعا کرتا ہوں کہ بالکل آپ کے چارج میں ہوجاؤں۔ لیکن ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس۔ چھوٹا پاندان کٹاؤ کے کام کا بنارسی تحفہ ہے حور بانو نے پسند کیا ہوگا۔ سب کو دعا سلام۔

دست موقوف ہوگئے مگر نزلے کا اثر ہنوز بدن پر ہے معمولی غذا شروع نہیں ہوئی۔ لیکن ضعف افاقہ محسوس ہے۔ اہلے زمانہ پڑھنے کے طریق سے ایک شعر کہا تھا کہ ؎

بقہ بشیں نوچوں شیخ کی بس یہ ارادہ ہے سبب یہ ہے کہ طاقت کم ہے اور دست زیادہ ہے

اکبر۔ الہ آباد۔ ۲۱ مارچ ۱۹۰۷ء

اصل یہ ہے کہ حکام کی بدگمانی کی حالت میں حضرت اکبر مولانا حسن نظامی صاحب سے علانیہ

ملنے سے گریز کرتے تھے اور شاید جبتک اس معاملے کی صفائی نہیں ہوئی علانیہ طور پر نہیں ملے۔ اسکا ثبوت مرحوم کی متعدد تحریروں سے ملتا ہے۔ ذیل کی سطور قابلِ غور ہیں:

"ایک دفعہ خیال آیا کہ میں الہ آباد میں نہ ہوں اور آپ تشریف لائیں اور اسی وجہ سے کہ میں موجود نہیں ہوں۔ آپ کنٹگنج میں تشریف فرما ہوں اور اتنا رہیں کہ آپ کی تشریف آوری کا اعلان ہو جائے۔ پھر آپ چلے جائیں جس سے ظاہر ہو کہ آپ کی تشریف آوری خاص مجھ سے مکالمت و مجالست کے لیے نہیں ہے بلکہ عام شغل ہدایت و ارشاد کے لیے آپ کے سفر ہوا کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "بے اختیار دل چاہتا ہے کہ یارانِ طریقت کو دیکھوں۔ دیکھئے اللہ کیا کرتا ہے۔ بعید نہیں کہ کسی دن بلا اطلاع السلام علیکم کی ٹھہرے"۔ دھلی جا کر خواجہ صاحب سے ملنے کی خواہش کے متعلق متعدد خطوط ہیں۔ بہت سے خطوط میں دنیا سے ترک تعلق کر کے خواجہ صاحب کی خانقاہ میں معتکف ہو جانے کی آرزو ظاہر کی گئی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ اس غرض سے دھلی تشریف بھی لے گئے مگر مزاج کی حالت اسقدر غیر مستقل تھی کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اصل یہ ہے کہ مرحوم کو اپنی طبیعت پر قابو نہ تھا اور تصوف و عرفان کی اس منزل تک نہیں پہونچ سکے تھے جہاں خودی کا احساس زائل ہو جاتا ہے اور ایسی خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ مزاج کی معمولی ناسازی اور ذرا سی شکایت کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ موسم کے تغیرات کا اثر ہمیشہ محسوس کرتے رہتے تھے۔ قریب قریب ہر خط میں موسم کی شکایت موجود ہے۔ جاڑا ناموافق۔ گرمی ناموافق۔ برسات ناموافق۔ اعتدالی موسم کی کوئی صورت نہیں۔ اسکی بڑی وجہ تو ضعف و ناتوانی اور عمر کا تقاضا تھا۔ لیکن اسکے ساتھ مرحوم کو توہمات نے بھی بے انتہا گھیر لیا تھا جسکا انکو خود اعتراف تھا۔ کسی ارادہ پر قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ دھلی جانے کا قصد کیا۔ ریل پر سوار ہوئے اور راستے سے واپس چلے آئے بار بار دھلی جانیکا وعدہ کرتے تھے اور پورا نہ ہوتا تھا۔ اگر بادل ناخواستہ گئے تو چند ہی روز بعد واپس آئے۔ طبیعت میں یکسوئی اور ایسی طمانیت خاطر جو اہل عرفان و تصوف کا خاصہ ہے حضرت اکبر میں بالکل نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ انکو اسکا علم تھا کہ خدا سے لو لگانے میں انشاء طبیعت اور دلی

بیچینی باقی نہیں رہتی - مرحوم کی حسب ذیل تحریر سے ان سب باتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"خدا کا خیال سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ تیری ہستی کیا اور کب تک اور اُنکی ہستی کیا اور کب تک۔ آخر میرے ہی پرتو کی مناسبت سے تو اُنکے لئے بے چینی ہے۔ بیچینی کم کر اور مجھ سے دل بھلا۔ میرے فضل کا منتظر رہ۔ بیگناہ اور پاک طینتوں کا آخر بھلا ہی بھلا ہے۔ بس اسی سے ذرا تسکین ہوتی ہے۔ طبیعت نادرست۔ سردی کا موسم۔ دل افسردہ۔ پرائیویٹ بے تکلیفاں سر پر۔ دنیا کی بدلی ہوئی آنکھ پیش نظر۔ محبوبان رفتہ کی تصویریں آنکھوں میں پھرتی ہوئی مُردہ امیدوں کی زندگی کا زمانہ یاد۔ بس یہی باتیں ہیں کہ خط لکھنے سے روکتی ہیں۔ ایک کلیات کا مرتب کر لینا سہل ہے لیکن آپ کو خط لکھنا مشکل ہے۔ آپ نے اپنی حالت لکھی۔ الحمد للہ۔ لیکن میں خود بہتر حالت میں نہیں ہوں۔ اوہام کا جوش میرے لئے ایک امر طبعی ہے۔ کوئی دل بڑھانے والا نہیں۔ بہرحال نیازنامے لکھتا رہوں گا"

باوصف اُن عارفانہ خیالات کے جنکا اظہار ان سطور کے شروع میں ہوا ہے حضرت اکبر نے حکام سے اپنی اور خواجہ صاحب کی صفائی کے لئے کوئی امکانی کوشش اُٹھا نہیں رکھی اور توکلت علی اللہ پر عمل نہیں کیا۔ طبیعت کی نادرستی، موسم کی شکایت اور اوہام کے جوش سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کے اثرات اُنکی طبیعت پر کسقدر غالب تھے۔ بہرنوع اسمیں شک نہیں کہ حضرت اکبر علم تصوف کے عالم تھے لیکن عامل نہ تھے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے جو اُنکو کوئی بڑا صوفی یا عارف کامل نہیں ثابت کرتی۔ بلکہ اس سے اُنکے کیریکٹر کی کمزوریاں روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہیں۔ بہتر ہوتا کہ اس قسم کے خط کثرت سے نہ شائع کئے جاتے

خواجہ صاحب کی صفائی کے لئے حضرت مرحوم نے کون کون سی کوششیں اور تدبیریں کیں اور کن کن لوگوں کو واسطہ بنایا یہ ان خطوط سے واضح ہے۔ خود خواجہ صاحب کو متعدد خطوط میں حکام کی خوشامد کرنے کی تحریک کی گئی ہے۔ اور بعض خطوط میں خواجہ صاحب کی نقل و حرکت پر قیود و نگرانی سے انکے مالی نقصان کا بھی ذکر ہے۔ ذیل کا خط ملاحظہ ہو:-

"پیارے خواجہ صاحب۔ اللہ کے حفظ و امان میں رہئے۔ ماجد میاں لکھتے ہیں کہ ارادہ ہے کہ برن صاحب سے ملکر آپ کے باب میں تحریک کریں۔ میں مدت سے یہ خیال کرتا تھا اور آپ کو لکھتا

بھول جاتا تھا کہ ممکن ہے کہ برن صاحب کی شخصیت اس باب میں سدراہ ہو۔ ہزار آنرسے کام نہ چلیگا۔ برن کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔ وہ منائے جائیں۔ اُنکی حاکمی مانی جائے۔ کہا جائے کہ آپ لٹریری آدمیوں کے مربی ہیں۔ ہمت افزا ہیں۔ فارسی اُردو کو آپ پر فخر ہے۔ چونکہ طوفان غلط فہمی میں مجھ سے ہوگئی اُس سے قطع نظر فرمایئے۔ میرا بھی بہت نقصان ہو رہا ہے اور میرے وابستگان دامن کا بھی۔

میں خود سب کچھ کرتا لیکن خود آلودگی سے پاک نہیں ہوں۔ غلط قیاس کر لیا گیا کہ معاملہ مسجد میں آپ کا مشیر تھا۔ مجھکو اندیشہ رہا کہ مبادا میری تحریک سے کہیں اُنکے کان اور نہ کھڑے ہوں۔ ؎ چو رستم پدر باشد و من پسر بگیتی نماند دگر نامور

اچھا ہوا کہ ماجد میاں نے یہ خیال پیدا کیا۔ میں نہیں جانتا کیا اثر ہوگا۔ خدا اثر دے۔ بات تو کچھ نہیں۔ آپ بھی ایک عرضی برن کو بھیجدیں تو کیا حرج ہے۔ "آنریبل آر برن (چیف سکریٹری گورنمنٹ یوپی لکھنؤ۔ اُردو ہی میں ہو۔ صاف ہو۔

. . . . . .

اس قسم کی ہدایات دوسرے خطوط میں بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہے کہ حضرت اکبر "عذر گناہ کو بدتر از گناہ" نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح حکیم برہم صاحب ایڈیٹر "مشرق" کو بھی واسطہ ٹھہرایا گیا اور اُنکو نینی تال جانے کے لئے سفر خرچ کی تحریک بھی کی گئی۔ لیکن ان کوششوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ خود حضرت اکبر نے بھی حکام سے ملنے کی کوشش کی مگر ناکام۔ بہرصورت یہ سب پرائیویٹ باتیں ہیں جو عام دلچسپی نہیں رکھتیں۔ حالانکہ "خطوط اکبر" کا بڑا حصہ انھیں باتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ گو ضمناً بعض لٹریری اور پولیٹکل مسائل بھی ہیں جن پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ خطوط کا یہ حصہ بہت دلچسپ اور ایک حد تک سبق آموز بھی ہے۔ اِن تحریرات میں ادبی شان بھی زیادہ ہے اور زور قلم بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ خصوصاً مولانا حسن نظامی صاحب کی اکثر تصانیف اور مضامین کی عموماً داد دی گئی ہے اور آپ کے زور قلم کے حضرت اکبر بھی اُسی طرح مدّاح ہیں جس طرح دوسرے لوگ۔ اس سلسلے میں حضرت اقبال کی مثنوی "اسرار خودی و رموز بیخودی" پر کئی خطوط میں اظہار رائے کیا گیا ہے اور آپ کی آزاد خیالی کو ناپسند کیا گیا ہے

مگر لطیف پیرایہ میں - ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"اقبال صاحب نے البتہ بہت بڑی ترقی کی ہے - اُنکو ضرورت ہے - میں یہ لکھدوں گا - ؎

آپ کے ہاتھ میں میں ہاتھ نہیں دے سکتا داد دیتا ہوں مگر ساتھ نہیں دے سکتا

خدا کے ساتھ رہنا چاہیئے - پھر جو رنگ چاہو اختیار کرو - لیکن حالت یہ ہے ؎

مسلماں تو وہ ہے جو ہے مسلماں علم باری میں کروروں یوں تو ہیں لکھے ہوئے مردم شماری میں

اِسکے متعلق حضرت اقبال اور خواجہ صاحب کے درمیان بھی معرکہ آرائی رہی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو حضرت اقبال حضرت اکبر کے ہم خیال ہوگئے اور یہ معرکہ بخیر و خوبی ختم ہوگیا - ایک اور تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں :-

"بھاگوت گیتا کے اٹھارہ ادھیاؤں کا اُردو ترجمہ نظم میں ہوا ہے - پنڈت دینا ناتھ صاحب ھن مجرد ھلوی - بی - اے - اکونٹنٹ محکمہ تعمیرات پنجاب مصنف ہیں - رسالہ کا نام مخزن اسرار ہے - ڈاکٹر اقبال صاحب نے اسرار بیخودی میں سری کرشن جی مہاراج کو قابل تعریف ادب کے ساتھ یاد کیا ہے اور اُنکی تعلیم کو برقرار رکھا ہے -

مخزن اسرار کے مصنف نے بندگان خدا پر احسان کیا ہے کہ چند اہم مضامین گیتا کا ترجمہ کردیا ہے مگر ترجمہ نظم میں ہے - معانی کا انکشاف اچھی طرح نہیں ہوتا - یعنی عوام کے لئے - کیا آپ یا آپ کے دوستوں میں کوئی صاحب اُسکی تشریح صاف اُردو نثر میں کردینگے . . . .

میں نے اہم مضامین اسلئے کہا کہ ایک پہلو اہمیت کا یہ بھی ہے کہ بنی آدم کا ایک بڑا اور با اثر گروہ اُسکو صحیح سمجھتا ہے اُسکو مستند قرار دیتا ہے - مذہب کی اہمیت "شاید" زیادہ تر اسی بنا پر ہے"

اِسمیں "شاید" کا لفظ شاہد ہے کہ مرحوم بات بات میں کسقدر احتیاط برتنا ضروری سمجھتے تھے لیکن جب خود مولانا حسن نظامی صاحب نے "کرشن بیتی" کے عنوان سے سری کرشن جی کی لائف لکھی تو حضرت اکبر نے اسپر حسب ذیل اظہار رائے فرمایا :-

"آج میں نے کرشن بیتی ختم کردی - آپ کی تمہید و توجیہ بہت معقول اور پولیٹکل ہے - ہندو ظاہرا اُبھرتے جاتے ہیں - ہمکو یہاں رہنا ہے - اُنکے دیوتاؤں سے واقف ہوکر کہیں نہ اُن سے بیگانگی کم کریں - یہ پالیسی انگلوں کی بھی رہی ہے - ہم لوگوں میں یہ وقت افتراق کا ہے - اتحاد کا نہیں ہے -

ہو کیونکر، مرکز ہی قائم ہونے نہیں پاتا۔ طاقت ہی نہیں۔ ہر صاحب دماغ و قلم مضمون آفرینی کر رہا ہے۔ خدا جانے کیا ہونا ہے۔ . . . . . .

کرشن جی کے زمانے میں اخلاقی خوبیوں کا جو معیار تھا اگر وہ اُسمیں کھرے نہ اُترتے تو کیوں مُلک اُن کو دیوتا بنا لیتا۔ معلوم نہیں کُل ہندو اُنکو دیوتا مانتے ہیں یا کوئی گروہ خارج بھی ہے (آریوں کے سوا) گیتا برائے خود دلیل روشن ہے۔ کتاب بہت اچھی کتاب سے نکلی ہے۔ مولوی صاحب تو اگر خاموش رہیں یہی بہت ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے بھی سری کرشن مہاراج کا ذکر خیر اسرار خودی میں کیا ہے۔ جناب امیر کی بہت مدح کی ہے۔ سر علی امام صاحب کے نام معنون فرمایا ہے۔ وہ زیادہ پولیٹیکل ہے۔ آپ کے رنگ میں سادگی ہے۔ آدھے . . . . . "

غالباً اسی کتاب کے متعلق ایک دوسرے خط میں تحریر ہے :-

"آپ نے ہندوؤں کے حق میں انصاف کرنے کی کوشش کی۔ ہندو لٹریچر مجبور ہوگا کہ اپنی لٹریری ہسٹری میں اسکا نوٹس لے۔ لیکن اصلی بات یہ ہے کہ آپ نے تصوف کی دل آویزی سے کا ثبوت دیا۔ جسکا حق آپ پر بہت کچھ ہے۔ حوصلہ بڑھنے کے تو مجھے بھی آثار نہیں دکھائی دیتے لیکن وقت کی خانہ پُری ضرور ہے۔ مجھکو تو اسی شاعرانہ خیال میں مزا آتا ہے ؎

ہوں عرب میں تو اک یزن بھی سہی ہند میں ہوں تو اک بھجن بھی سہی

یعنی جیسا ویسی ویسا بھیس۔ اس سے زیادہ اِن خیالات کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کیجاسکتی

اسی خط میں ہوم رول کی نسبت لکھتے ہیں :-

"ہوم رول کی نسبت میں نے بیباکانہ بہت اشعار کہے ہیں۔ اکثر بہت دلچسپ ہیں۔ آپ نے خوب لکھا "قلم اُٹھاؤں یا گرگس برستے پر"۔ دوسرا جملہ نہایت بلیغ اور با معنی ہے۔ آپ قلم کیوں اُٹھائیں۔ ہنٹرؔ اُٹھیگا۔ اگر نہ اُٹھا تو خدا جانے کیا کچھ اُٹھیگا۔ تاہم لکھنا چاہئے کہ اپنی باہمی اصلاح مقدم ہے ؎

جو گایوں کے سینگوں میں ہو زور کچھ تو شیروں کو روکیں بہت بنکے دوست

مگر اونٹ کا قول تو ہے یہی تواضع زگردن فرازاں نکوست

ان اشعار میں گائے اور اونٹ کی تلمیح سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسبت صاف صاف اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یعنی ہندو مسلمانوں میں اتفاق نہیں ہے اور مسلمانوں کو ہوم رول کی

تحریک میں شریک ہونا مضرت رساں ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور نظم کے چند اشعار درج ہیں اور انکا مدعا دم بھی یہی ہے کہ ہم میں ہوم رول حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

"خطوط اکبر" میں پردہ کے متعلق بھی ایک بڑی بحث ہے۔ مرحوم نے رسم پردہ کے متعلق مختلف اوقات میں مختلف اشعار کہے ہیں جو غیر معمولی طور پر مشہور ہیں۔ ان میں کس پردہ کی تائید ہے کہیں تردید جسپر اعتراضات ہوئے۔ اسکے متعلق اس مجموعہ میں کئی طولانی خط درج ہیں۔ مقصد یہ کہ ان اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ اور جواب کے متعلق مرحوم نے اپنے خطوط میں ضروری میٹر جمع کر دیا ہے۔ چونکہ یہ ایک خالص مذہبی بحث ہے جس سے کم از کم مجھے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ لہذا میں اسکے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اعتراضات سے مرحوم کو بہت پریشانی ہوتی تھی اور چاہتے تھے کہ انکے احباب انکی تردید کریں۔ بعض خطوط سے یہاں تک واضح ہے کہ اعتراضات کا جواب دیا جائے لیکن انکا نام نہ ہو۔ ان خطوط سے ظاہر ہے کہ مرحوم اپنی رائے پر مستقل ہیں اور اسے بدلنا نہیں چاہتے۔ لیکن اعتراضات کا تحمل بھی نہیں کر سکتے۔ یہ طبعی کمزوری کی ایک بیّن دلیل ہے۔ ایک خط میں ریفارم کے متعلق حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی ہے:۔

"میں ڈرتا ہوں کہ اگر شورش ریفارم میں بے اعتدالی ہوئی اور چند نوخیزوں نے پبلک میں صلح کل اور سوشیل آمیزش کا کھوکھلا اور ناپائدار رنگ دکھایا تو دوسری طرف مذہبی تعصب جو زبردست اور مقدس بڑے میاں کے لقب کا مستحق ہے مذموم کیا جائیگا اور فرق مختلفہ میں شدید جنگ شروع ہوگی جس سے روشنضمیر نوجوان بھی بالآخر نہ بچ سکیں گے۔ الا ماشاء اللہ۔ خیر یہ تو ایک عام بات ہے میں خود عجیب وقت میں ہوں۔ پبلک نے فرض کر لیا ہے کہ میں بڑا محب قوم اور اول درجہ کا ریفارم خواہ ہوں۔ حالانکہ میں قوم ہی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ نہ ریفارم کی طاقت ہے۔ میں نے لامذہبی اور تبدیل وضع کے خلاف قلم اٹھایا تھا۔ نہ کہ گورنمنٹ کے خلاف۔

اسوقت آنریبل پنڈت موتی لال کا خط آیا ہے کہ قومی اخبار انڈیپنڈنٹ (آزاد) انگریزی روزانہ پرچہ ۵ فروری سے نکلے گا۔ اپنا فوٹو فوراً بھیجیے اور اشعار جنکا ترجمہ چھاپوں گا (اوہ بچارے) ادھر یہ حالت کہ حکام اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ میں اخبارات سے تعلق رکھوں اور نظمیں

بھیجا کروں۔ معذرتیں کیا کرتا ہوں۔ ایڈیٹروں کے تقاضے چلے آتے ہیں۔ عشرت کا تخلص ظاہراً اور میرا تعلق بھی۔ پھر میری رائے بھی موافق نہیں ہے۔ میرا وعظ قناعت۔ محنت۔ توکل۔ سکوت۔ عبادت ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ رفتار فطرت کس جانب ہے۔ ہر شخص کو اپنی حد جاننا چاہیئے۔ میں نہ معین نہ مزاحم"۔

اس تحریر سے مرحوم کے سیاسی خیالات پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ حالانکہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد حکام کو اُنکے دل و دماغ پر کوئی حق نہ تھا۔ لیکن آپ کے بڑے صاحبزادے سیّد عشرت حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے اور خود سید اکبر حسین صاحب خان بہادر اور پنشن خوار۔ خواہ اِن سب کا لحاظ ہو خواہ کوئی اور سبب۔ لیکن یہ امر واقعی ہے کہ مرحوم حکام کی ناراضی سے بے انتہا خائف رہتے تھے اور اپنے امکان بھر اسکا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ "انڈیپنڈنٹ" ایسے اکسٹریمسٹ اخبار میں اپنے اشعار چھپوانا یا اُس سے اپنے تعلق کا اظہار کرنا تو امر آخر تھا وہ معمولی مذاقیہ اشعار میں بھی بہت بڑی احتیاط رکھتے تھے۔ جب میں الہ آباد میں "ادیب" کو ایڈیٹ کرتا تھا تو مشکل سے کوئی اتوار ناغہ ہوتا تھا کہ میں سید صاحب سے نیاز نہ حاصل کرتا ہوں اور وہ میرے منتظر نہ رہتے ہوں۔ لیکن یہاں مجھے اپنے اور مرحوم کے تعلقات کا اظہار منظور نہیں ہے بلکہ انکے احتیاط کی ایک مثال پیش کرنا ہے۔ نمائش گاہ الہ آباد میں جب نمائش کمیٹی نے دیگر مشاغل تفریح کے ساتھ مس گوہر جان (کلکتہ) کا ناچ کرایا تو حضرت اکبر نے اپنے خاص رنگ کا ایک شعر کہا اور اُس روکھی ہنسی کے ساتھ مجھکو سُنایا جو مرحوم کو اپنے ظریفانہ اشعار پر اکثر آیا کرتی تھی۔ میں نے اس شعر کو حسب عادت لکھ لیا۔ اسکے بعد "ادیب" کے لئے دوسرے نو تصنیف اشعار لکھوائے۔ لیکن جب میں رخصت ہوا تو مجھے دروازے سے واپس بُلا کر فرمایا کہ نمائش والا شعر درج نہ کیجئے گا۔ ممکن ہے کہ حکام کے خلاف ہو۔ اُسوقت تعمیل ارشاد کی گئی۔ لیکن وہ شعر ابتک میرے حافظے کی امانت موجود ہے اور میں نہ اُسوقت اسکی اشاعت میں کوئی مضایقہ سمجھتا تھا نہ اب سمجھتا ہوں۔ سُنئے :-

پٹھ گئی ہاتھ سے تہذیب کی جھنڈی افسوس اگزیبشن بھی نچانے لگے رنڈی افسوس

پالیٹکس کے متعلق سید صاحب کے ذاتی خیالات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر وہ انکا اظہار علانیہ طور پر کبھی نہیں کرتے تھے۔ نجی طور پر مجھے معلوم ہے کہ مرحوم کے اصلی خیالات کو اُنکی تحریروں

سے بہت ہی کم مناسبت ہے - اسلئے میں اُنکی تحریروں کو مرحوم کی اصلی رائے کا آئینہ نہیں کہہ سکتا پرائیویٹ ملاقاتوں میں وہ سیاسی معاملات کے متعلق کچھ اور ہی اظہار رائے کیا کرتے تھے جسکا تجربہ میری طرح اُنکے بعض دیگر احباب کو بھی ہوگا - لیکن ہر حالت میں وہ شورش اور غیر آئینی طریق سے حقوق طلبی کے مخالف تھے - اور یہ مرحوم کی نہایت صحیح رائے تھی -

"خطوط اکبر" پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حسن نظامی اور حضرت اکبر میں ایک روحانی تعلق تھا اور مرحوم چاہتے تھے کہ آخر عمر میں خواجہ صاحب کے قریب رہکر یادالٰہی میں مصروف ہوں - لیکن مرحوم کی یہ آرزو پوری نہو سکی - اسکا کوئی خاص سبب بھی نہیں معلوم ہوتا - گھر سے وہ سخت بیزار تھے - اسکی شکایت متعدد خطوط میں موجود ہے - اُنکی اہلیہ محترمہ کا انتقال ۱۹۱۰ء ہی میں ہوگیا تھا اُنکے چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم نے ۱۹۱۲ء میں داغ مفارقت دیکر سید صاحب کی خانگی زندگی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا - آپ کے بڑے صاحبزادے سرکاری ملازمت کے سلسلے میں الہ آباد سے باہر رہتے تھے - اس صورت میں آپ کے لئے دہلی کا قیام کچھ مشکل نہ تھا - مرحوم کی مالی حالت بھی بہت اچھی تھی - ایک بیش قرار پنشن کے علاوہ ایک معقول رقم بطور اندوختہ بھی پاس تھی اور وہ ہر جگہ آرام اور فراغبالی کے ساتھ رہ سکتے تھے - اس صورت میں اسکے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کی کشش ہی کمزور تھی یا حضرت اکبر کی یہ خواہش انتہائی منزل تک نہیں پہونچ سکی تھی - یہ بھی اُنکی طبعی کمزوری کی ایک دلیل ہے اور ایسی کمزوریاں ان خطوط میں اسقدر عام ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی اُنکو محسوس کر سکتا ہے - اسلئے کتاب کی اشاعت کا اصلی مقصد فوت ہوگیا - غرض تو یہ ہوگی کہ ان خطوط کی اشاعت سے کاتب و مکتوب الیہ دونوں کی شہرت میں اضافہ ہو اور پبلک انکے متعلق پہلے سے بہتر خیال قائم کرے - جب یہ معلوم ہو کہ دونوں کے تعلقات ذاتی اغراض سے مبرا نہ تھے جیسا کہ تمام مجموعہ خطوط سے واضح ہے تو پبلک کا اعتقاد بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب خواجہ صاحب کو نقد روپیہ بھی دیا کرتے تھے - اس قبیل کے دو خط اس مجموعہ میں درج ہیں - ایک میں حضرت اکبر دریافت کرتے ہیں کہ "اُس دن میں نے کئے روپیہ کے نوٹ آپ کو دیئے تھے" اور دوسرے میں تحریر ہے کہ "تحریر حساب میں غلطی تھی رفع ہوگئی" اس پر خواجہ صاحب کا نوٹ ہے کہ "الہ آباد سے چلنے لگا تو کچھ نوٹ عنایت ہوئے دہلی پہونچا تو کارڈ آیا کہ کتنے نوٹ دیئے تھے - پھر دوسرے دن یہ خط آیا" خواجہ صاحب ایک درویش صفت

بزرگ ہیں انکو روپیہ اور روپیہ کے حساب سے کیا تعلق ؟

مجھے افسوس ہے کہ ایسے خطوط کی اشاعت سے دونوں کی شہرت کو نقصان پہونچتا ہے۔ میری رائے میں حضرت اکبر اپنے کلام ہی کی بدولت زندہ جاوید ہیں۔ اُنکے خطوط کی اشاعت اُنکی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتی۔ سبب یہ کہ مرحوم کی نظم اُنکی نثر پر غالب ہے۔ اسیوجہ سے اُنھوں نے نثر سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھی۔ اور یہ خطوط بلا خیال انشا پردازی بھی لکھے گئے ہیں۔ غالب مرحوم کے خطوط اُس زمانے سے لیکر جب اردو نثر ابتدائی حالت میں تھی اب تک جبکہ اردو انشا پردازی بہت کچھ ترقی کرچکی ہے یکساں دلچسپی کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں اور اردو نثر کا بہترین نمونہ خیال کئے جاتے ہیں حضرت اکبر کے بعض خطوط اوپر درج ہوئے ہیں۔ ذیل میں مرزا غالب کا بھی ایک خط درج کیا جاتا ہے جو اُنھوں نے سورت کے ایک رئیس کے نام لکھا تھا :-

"جناب میر غلام بابا خان بہادر کو مسرت بعد مسرت و جشن مبارک و ہمایوں ہو۔ رقعۂ گلگوں نے بہار کی سیر دکھلائی۔ انبساری ربیل روانہ ہونے کی لہر دل میں آئی۔ پانوں سے اپاہج۔ کانوں سے بہرا۔ ضعف بصارت۔ ضعف دماغ۔ ضعف دل۔ ضعف معدہ۔ ان سب ضعفوں پر ضعف طالع۔ کیو قصد سفر کروں۔ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں۔ گھنٹہ بھر میں دوبار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا کسی طرح امکان میں نہیں۔ خط لکھتے لکھتے خیال میں آیا کہ جیسا سید صاحب کی ولادت کی تاریخ لکھی سید ابی صاحبہ کی بسم اللہ کی تاریخ بھی لکھنا چاہیے۔ ماہ نجستہ بہار ذہن میں آیا۔ سات عدد تم پائے۔ نجستہ بہار پر ادب کے اعداد بڑھائے بشمار میں ۱۲۸۳ نظر آئے۔ دوسرے ورق پر یہ قطعہ مرقوم ہے۔ بوڑھوں کی فکر کی طاقت معلوم ہے۔ صرف جوش محبت سے چار مصرعے موزوں ہوئے ہیں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

قطعہ

نجستہ جشن دلستان نشینی بیگم — بفیض بہجت نواب یمین اقبالش
چو از پے ارب آموزیت خوش باشد — اگر نجستہ بہار ادب - بود سالش

سخت ناحق کوشی ہوگی اگر اس سے یہ خیال کیا جائے کہ حضرت اکبر کے خطوط میں کوئی ادبی شان نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بیچ کی تحریریں ہیں جو قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں تاہم ان میں عبارت کی بےتکلفی اول سے

آخر تک موجود ہے اور جستہ جستہ انشا پردازی اور ظرافت کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اگر مرحوم نظم کی طرح نثر کی طرف بھی توجہ کرتے تو اُنکی نثر اگر غالب مرحوم کی نثر پر سبقت نہ لیجاتی تو اُس سے کم درجہ پر بھی نہ ہوتی۔ پھر ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ وہ یہ کہ مرزا غالب کے زمانے میں اردو نثر کا ایک معیار قائم تھا جس پر اُس عہد کے انشا پردازوں کی تحریرات کی جانچ ہو سکتی تھی۔ اس زمانے میں نظم و نثر دونوں کا کوئی معیار نہیں ہے اور سب کی تحریریں قریب قریب یکساں ہوتی ہیں۔ بالخصوص خطوط نویسی کی تو ایک ہی شان ہے جس میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں پایا جاتا۔ غالب کے بعد سے کئی اساتذہ اردو کے خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن خطوط غالب اِسی وجہ سے سب پر غالب ہیں کہ اُنکی شان سب سے جداگانہ ہے۔ بہرنوع ہمکو "خطوطِ اکبر" کے دوسرے حصے کا انتظار رہیگا جسمیں ایسے خطوط کی اشاعت کا وعدہ کیا گیا ہے جو مختلف اصحاب کے نام تحریر ہوئے ہیں اور جنھیں حضرت مؤلف نے نہایت دلچسپ اور قابل دید بتایا ہے۔

نوبت رائے نظر

مقالات ٹالسٹائی

انسان کا اصلی مذہبی جوہر اُسوقت بیدار ہوتا ہے جب وہ دل میں اپنی غیر مستقل مزاجی، خود غرضی اور گناہگاری کو محسوس کرتا ہے، جس طرح انسان بغیر دل و دماغ کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح مذہب کے بغیر بھی اُسکی زندگی نامکمل ہے۔

اپنے اہل و عیال کے کھلانے پہنانے اور دیگر ضروریات کے مہیا کرنے سے آدمی کی جسمانی خواہشات پوری ہو جائیں گی لیکن اگر وہ یہی کام دوسروں کے لئے کرے تو اُسکی روحانی ضروریات پوری ہونگی،

عورتوں کی طاقت زیادہ ہو گئی ہے اور اکثر مقامات پر وہ مردوں پر حکومت کرتی ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ ابتک اپنے قانون پر عمل کرتی ہیں اور مرد اپنے قانون کو توڑ چکے ہیں

(ترجمہ) عالی لکھنوی

بالخصوص

ہندوستان عہد مغلیہ میں

عہد مغلیہ کی تاریخیں اگرچہ فارسی زبان میں اب بھی موجود ہیں لیکن اُنکے مطالعہ سے اتنی توضیح نہیں ہوتی جتنی کہ غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں سے ہوتی ہے۔ مگر ان سیاحت ناموں سے عوام ایک حد تک ناواقف ہیں اور نہ ہر شخص کو اسقدر فرصت ہے کہ پرانی کتابوں کی ورق گردانی اور تلاش سے تشنگیٔ تحقیق بجھائے۔ اسلئے یہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے کہ جو اگلے وقتوں کے حالات سے واقفیت پیدا کرنے کے شوق میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتے اور دماغ سوزی سے کام لیتے۔ لیکن ہم یہاں پر عہد مغلیہ کے مختصر مگر دلچسپ حالات بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

جو لوگ انگریزوں کی حکومت پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُنھوں نے بڑی بیدردی سے ملک ہند کو تباہ اور رعایا کو لوٹ کر نادار بنا دیا ہے وہ ذرا اگلے وقتوں کے طرزِ عمل کو ملاحظہ کریں۔ بعض لوگ انگریزوں کے پیشرو مغلوں کے زمانہ کو تاریخ ہند کا عہد زریں قرار دیتے ہیں لیکن ذیل کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زمانہ ایسا نہ تھا جیسا خیال کیا جاتا ہے۔ ان حالات سے بالواسطہ یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پیشتر ملک ہند کی کیا حالت تھی۔

جنوبی ہند کی ریاستیں شمالی ہند میں مغلوں کی پُرشوکت حکومت تھی اور بندھیاچل کے میں بھی مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں لیکن منتہائے جنوب میں ہندوؤں کا زور شمالی ہند کی تھی وہی جنوبی ہند کی تھی۔ چاہے مسلمانوں کا غلبہ ہو یا ہندوؤں کا زور ورتوں میں یکساں تھے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے وجے نگر کی شان دار ہندو ہو چکا تھا اور اسکے ساتھ ہندوؤں کی عظمت بھی معدوم ہو گئی تھی۔ گو یہ تین سو ریاستی کے کھنڈروں سے ہندوؤں کی پولیٹکل قوت اور شوکت بخوبی عیاں ہے

جو اغیار کے دست برد سے برباد ہوئی تھی۔ مگر سترھویں صدی کے شروع میں ہندوؤں کی سلطنت قطعی طور پر زوال پذیر ہوئی تھی۔ ناٹک کی ریاستیں دکن کے مختلف حصوں میں آزاد و خود مختار موجود تھیں وجے نگر کی تباہی کے بعد چندر گری کا راجہ ان سب کا سرتاج مانا جاتا تھا اور تمام فرمانروا اسکے زیر اثر تھے اور باقی ملک میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔

صوبوں کے گورنر اور اُنکے اعمال

حکومت کے صدر مقام دہلی اور آگرہ تھے اور مختلف صوبوں کا انتظام گورنروں کے سپرد تھا۔ مگر وہ بیشتر دار الصدر کے احکام کے پابند نہ تھے۔ یعنی جو جی میں آتا کرتے تھے۔ گویا اپنے اپنے صوبوں کے حقیقی فرمانروا تھے۔ بادشاہ کا اختیار واقتدار عملاً دار الحکومت کے قرب وجوار کے علاقے ہی تک محدود رہتا تھا صوبہ کے گورنر دو طرح پر مقرر ہوتے یا تو خدمات جلیلہ کے صلہ میں جو میدان کارزار میں یا کسی اور اہم موقع پر انجام دیجاتی تھیں۔ یا بڑی بڑی رقموں کے عوض میں صوبہ کی حکومت دیجاتی تھی۔ جب جنگ چھڑ جاتی تو شاہی خزانہ خالی ہو جایا کرتا تھا۔ اور اُسے پُر کرنے کے لئے سب سے بڑی رقم پیشکش کرنے والے کو کسی اچھے صوبہ کا حکمراں مقرر کر دیا جاتا۔ جب کوئی امیر اس طریقہ سے گورنری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ تو وہ جاتے ہی رعایا سے اپنی خاص تحصیل مالگذاری کے ساتھ شروع کر دیتا۔ اور جسقدر جلد ممکن ہوتا۔ اپنے عالی منصب کی قیمت مع منافع کے بہم پہنچا لیتا۔ اسکا انجام یہ ہوتا کہ رعایا پر سخت ظلم روا رکھا جاتا۔ کوئی سوداگر اور زمیندار خوشحال نہ رہنے پاتا۔ بلکہ معمولی کاشتکاروں کی خون پسینہ کی کمائی بھی چھن جاتی۔ اور وہ افلاس و تنگدستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے طریق حکومت میں محکوم کی فلاح کا کوئی لحاظ ہی نہ ہو سکتا تھا۔ عمّال اپنا اُلّو سیدھا کرنے اور اپنی کامرانیوں میں مشغول رہنے کے سوا اور کسی بات کی فکر نہ کرتے تھے۔ شاید یہ گمان کیا جائے کہ اس قسم کے جور وستم اور سرکاری لوٹ مار صوبوں ہی تک محدود رہتی ہو اور دربار شاہی کے امراء اور ارکان دولت اس قسم کی کمزوریوں اور بداعمالیوں سے محترز رہتے ہوں لیکن اگر ایسا ہوتا تو سلطنت کو استقلال اور استحکام نصیب ہوتا۔ بادشاہ کے مصاحب اور اراکین دربار بھی رعایا کی گاڑھے پسینہ کی کمائی ہتھیا لینا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔

اس زمانہ میں لندن کے چند اولوالعزم سرمایہ داروں نے مشرقی ممالک بالخصوص

ہندوستان کی تجارت سے مالامال ہونے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرکے ملکہ الزبتھ سے ۱۵۹۹ء میں پروانہ اجازت حاصل کیا تھا۔ اُسوقت شہنشاہ جلال الدین اکبر سریر آرائے سلطنت ہند تھا۔ کمپنی کے ملازموں نے جو خطوط اپنے عزیزوں کو لکھے تھے یا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اصل حالات کی رپورٹیں روانہ کی تھیں اُنسے یہ بخوبی روشن ہے کہ صوبوں کے فرمانروا اور اُنکے ماتحت حکام رعایا کو کس طرح لوٹتے تھے عوام کی اقتصادی یا تمدنی حالت سنوارنے یا خوشحالی کی ترقی کے وسائل وضع کرنے اور سوچنے کی کسی کو فکر ہی نہ تھی۔ کمپنی کے ایک گماشتہ جان کرنگھنے ۲۰ جولائی ۱۶۱۴ء کو ایک خط میں گورنروں کی بابت یوں لکھا تھا کہ "گورنر محض اپنا منصب عالی ہی نہیں خریدتے۔ بلکہ ہر قسم کی تجارت و حرفت کے فوائد سے بھی مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ سوداگروں کو اس الزام کی پاداش میں گرفتار کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے تجارت میں بہت نفع کمایا ہے انھیں اُسوقت تک سزائیں دیجاتی ہیں جب تک کہ بیوپار سے کمایا ہوا روپیہ بشکل فدیہ وصول نہ کرلیا جائے۔" ۱۶۱۱ء میں نکو عرف ڈوآن مُن نے اپنے خط میں تجارت کی مشکلات کی یوں شکایت مرقوم کی تھی :۔ منصب دار اپنے علاقہ کے تاجروں کو انگریزوں سے بلا تکلف لین دین نہیں کرنے دیتے۔ بلکہ خرید و فروخت کا تمام کام اپنے ذاتی منفعت کے لئے مخصوص و محفوظ رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ان لوگوں کے ایمان کا کوئی ٹھکانا نہیں اپنی زبان کا پاس بھی نہیں کرتے بلکہ اپنی ذاتی غرض اور نفع کو سب باتوں پر مقدم سمجھتے ہیں" گورنروں کا یہ شیوہ تھا کہ خاص خاص تاجروں کو تجارت کا اجارہ عطا کرتے تھے۔ اور کوئی تاجر بے روک ٹوک خرید و فروخت کرنے کا مجاز نہ تھا۔ نکو کے خط میں مذکور ہے :۔ یورپ کی ساختہ اشیا کا اجارہ دار ایک سوداگر کے ہاتھ میں ہے جو ایسا مطلق العنان آدمی ہے کہ شہر کے تمام سوداگر اس سے ڈرتے ہیں وہ چیزوں کی قیمت بڑی بے پروائی سے مقرر کرتا ہے اور جہاں چاہتا ہے مال روانہ کر دیتا ہے۔ اسکے سامنے کسی اور تاجر کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی۔"

اِن حالات سے عیاں ہے کہ اگر وزرائے سلطنت نیک دل اور ضمیر شناس اور قابل منتظم ہوتے تو گورنروں کو اس قسم کی من مانی کارروائیاں کرنے کی مجال نہ ہوتی جنکی وجہ سے

تجارت پر ایسی تباہ کن قیود عائد ہو گئی تھیں۔ چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب عمال زبردست اور طمع و حرص کے بندے اور پرلے درجہ کے نالائق تھے وہ رعایا کی بہتری کا مطلق خیال ہی نہ کرتے تھے۔

ٹامس کیرج نامی ایک اور ملازم کمپنی تھا۔ اُسنے اپنے خط مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۶۱۶ء میں یوں لکھا ہے:۔ "اگر کوئی آدمی یہاں آکر کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کا خواہاں ہو تو اُسے بادشاہ اور اُسکے امرا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سامان سے آراستہ ہو کر آنا چاہیئے ورنہ کچھ فائدہ نہوگا۔ بادشاہ بڑا نخوت پسند اور پندہ زن ہے۔ وہ اپنے کو دنیا کا سب سے بڑا حکمراں تصور کرتا ہے اسکے امرا ہر بات میں اسکی تقلید اپنا شعار خاص سمجھتے ہیں"۔ ۱۶۲۵ء میں جان ڈریک نے شاہی کیمپ سے ایک خط میں یوں لکھا تھا "درباری بالعموم مٹھی گرم کرنے اور نذرانے لینے کے خواہاں رہتے ہیں۔ خسرو بیگ ایک مصاحب نے مجھ سے پانچ سو روپے طلب کئے۔ آخر کار سو روپیہ نقد اور ایک طلائی زنجیر لے کر میرا کام کرنے کی حامی بھری"۔ شاید یہ گمان کیا جائیگا کہ مغل عمال اور گورنر وغیرہ مغربی سوداگروں ہی کو لوٹنے پر تلے رہتے تھے۔ یہ گمان درست نہیں۔ مرتشی حکام گورے اور کالے میں امتیاز نہ کرتے تھے۔ جو آدمی اُنکے ہتھے چڑھ جاتا اُس سے حسب خواہ نذرانہ لے کر چھوڑتے تھے۔ مینڈلسلو نے ۱۶۳۸ء میں اپنے ایک خط میں یوں لکھا تھا: گورنر اور اُسکے ماتحت عمال کی رشوت ستانی کی عادت شاید درست نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کوئی سخت کارروائی نہ کیجائے۔ وہ ہر ایک آدمی کو لوٹنے کو تیار رہتے ہیں۔ جس سے اُنکا واسطہ پڑتا ہے بادشاہ سے لیکر ادنیٰ عمال تک سب کے سب رشوت لینے کی عادت مذموم میں مبتلا ہیں۔ ۔ ۔ ۔ رشوت دیکر جو کام چاہو کرا لو۔ یا اگر کسی کے بازو میں قوت ہو تو وہ بھی اپنی مطلب برآری کر سکتا ہے۔ بغیر اِن دو باتوں کے کوئی بہم سر نہیں پہنچتی۔ عرصے سے اس ملک سے سچائی۔ ایمان اور انصاف نابود ہو گیا ہے اور اس ملک کی حالت نہایت دردناک ہے۔ امیر غریبوں پر ظلم روا رکھتے اور ہر ممکن طریقہ سے اُنکا خون چوستے ہیں کہ جسکی کوئی داد فریاد نہیں ہوتی"۔ وجہ یہ تھی کہ جیسے حاکم رشوت خوار تھے ویسے منصف اور قاضی بھی تھے۔ عدل کون کرتا!

منھولڈ نے ۱۶۳۶ء میں معدلت گستری کی نسبت یوں لکھا تھا:۔

سرکاری معاملات میں اس ملک اور یورپ کے دستور میں یہ بڑا فرق ہے کہ آخرالذکر ممالک میں وکلا قانونی بحث کے لئے محنتانہ لیتے ہیں۔ اور ہندوستان میں منصف قانون سے چشم پوشی کا معاوضہ طلب کرتے ہیں۔" یہ کیفیت سورت اور دیگر بڑے بڑے شہروں کی تھی۔ جو دارالسلطنت سے براہ راست ربط ضبط رکھتے تھے۔

شاہی فرمان کی حقیقت

گورنر اپنے اعلیٰ عہدہ پر مقرر ہونے کے بعد بادشاہ کے رعب و داب کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ فرمانِ شاہی کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے کرتے تھے۔ انگریز تاجر بھاری بھاری نذرانے ادا کرکے جو فرمان دربارِ شاہی سے حاصل کرتے گورنر انھیں وقعت نہ دیتے۔ جب کوئی فرمان کسی گورنر کو دکھایا جاتا تو وہ دستور کے مطابق اُسے آنکھوں سے لگاتا۔ اور "بسر وچشم قبول" کہہ کر سُرخ روئی حاصل کرتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک اسے رقم خاص نذر نہ کیجاتی تو کوئی کام نہ بن سکتا۔ اور گورنروں کا ظلم سب کو برابر برداشت کرنا پڑتا۔ چاہے ہندوستانی ہوں یا انگریز بغیر رشوت کے انکا کوئی کام نہ نکل سکتا تھا انگریز سوداگر اس غرض سے رشوت دیتے تھے کہ کمپنی کا کاروبار خیر و خوبی سے انجام پذیر ہوتا رہے۔ اور بسا اوقات یورپ کی ساختہ نفیس اور خوبصورت چیزوں سے گورنروں کی خوشنودی حاصل کرنا پڑتی تھی۔ بعض وقت دربارِ شاہی کے وزرا کو نذرانہ دیکر بھی مطلب برآری نہ ہوتی۔

منھ دلڈر رقم طراز ہے "اگر اُس کم بخت گائے کی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو دودھ دے مگر لات مار کر سارا گرادے" جن مراعات کے لئے بھاری رقم خرچ کیجاتی وہ بعد ازاں بیکار ثابت ہوجاتیں۔ گول کنڈے میں رشوت کا ایسا عام رواج تھا کہ انگریز اور ڈچ سوداگروں کی تجارت محال ہوگئی۔ ۱۶۲۸ء میں مچھلی پٹم سے وہ بوریا بستر اُٹھا کر چلے گئے۔ وہاں پر گورنر نے تجارت کا استحقاق تین ہندوؤں کو عطا کردیا تھا اور کوئی آدمی بیوپار نہ کرسکتا تھا۔ اور ان ہندو تاجروں سے گورنر اور حکام آئے دن اسقدر نذرانہ اینٹھ لیتے کہ وہ مال کی قیمت ادا کرنے میں سخت قاصر رہتے۔ انگریز تاجر رات کو چپکے سے ایک کشتی میں سوار ہوکر بھاگ گئے۔ اسی طرح ڈچ لوگ بھی وہاں سے بھاگ نکلے۔ بیجاپور کی حالت یہ تھی کہ "جب جنگ چھڑ جاتی تو بادشاہ زر نقد بالجبر لیتا۔ اور اگر کوئی ساہوکار اور سوداگر برضا و رغبت نہ دیتا تو روپیہ کے ساتھ اُسکا سر بھی اُتار لیا جاتا۔"

بنگال کی حالت | سنہ ۱۶۶۶ء میں بنگال کی حالت بھی ابتر تھی۔ "رعایا سے ہر ممکن طریقہ سے روپیہ چھینا جاتا۔ نواب (شائستہ خاں) ۷۵ سال کی عمر کا تھا وہ بڑا طامع اور زر پرست تھا۔ اسکے عمال ملک کے انتظامی معاملات میں بڑے ماہر تھے۔ اسلئے وہ رشوت ستانی کے ہنر میں بڑے ہوشیار اور اپنے آقا کی خوش کرنے کے ڈھنگ سے خوب واقف تھے۔ بنگلی نواب کے مشاہرے کی جاگیر میں تھا اور بالاسور بھی اسی میں شامل تھا۔ اسی وجہ سے ایک فرد واحد کی حکومت میں تجارتی کاروبار میں سخت مشکلات حائل تھیں۔"

سنہ ۱۶۵۸ء میں مدراس کی حالت حسب ذیل تھی: "ہم بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیوپاری رعایا کو کسیقدر آفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کئی لشکر ادھر اُدھر سرگردان پھرتے تھے۔ ان حالات میں تجارت محال ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے کاروبار کو بہت نقصان پہونچ رہا ہے۔ پس ہم اپنا مال شہر مدراس سے تیس تیس لیگ (تین میل کا اندازہ) دور لیجانے کو مجبور ہو جاتے ہیں۔" جن خطوط کے اوپر اقتباس دیئے گئے ہیں وہ زمانہ امن وسکون کی معمولی حالت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن جب جنگ آرائی ہوتی تو رعایا کے مصائب اور تکالیف بہت بڑھ جاتی ہیں۔ بقول ایک انگریز کے۔ "انکا گوشت پوست اُتار کر انکی ہڈیاں چوس لیجاتی تھیں۔" جب کوئی لشکر کسی ضلع میں نمودار ہوتا تو اُسکی آمد ٹڈی دل کی طرح بربادکن سمجھی جاتی۔

بحری قزاق | ساحلوں کے آس پاس سمندری قزاقوں کی لوٹ مار سے رعایا کی جان عذاب میں رہتی تھی۔ ہندوستان کے سوا اور کئی قوموں کے لٹیرے رات دن لوٹ مار میں مصروف رہتے تھے۔ کیونکہ مخلوق کے پاس کوئی خاص بیڑہ نہ تھا اسوجہ سے اُنھوں نے ان ساحلی مقامات کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں بحری لٹیروں کا برابر زور رہا کہ جو مرہٹوں سے بھی نہ لوٹ سکا! ہندوستان کے بہترین جہازراں اور ماہران فن جہازرانی بحری قزاقی میں مشغول تھے۔ مغلوں اور مرہٹوں نے جو بیڑے تیار کئے تھے وہ غیر قوموں کے قزاق تو درکنار اپنے ہی ہم وطن لٹیروں کو پامال نہ کر سکے۔ اندرون ملک میں بھی راہزنوں کا بڑا زور تھا۔ مسافروں کے مسلح دستے ہی ڈاکوؤں کی دست برد سے محفوظ تھے۔ نہتے مسافر مال و متاع کے علاوہ جان سے بھی محروم ہو جاتے تھے۔

یہ کیفیت اُس زمانہ کی ہے جب مغلوں کی قوت زوال پذیر نہ ہوئی تھی۔ اور جن انگریزوں نے چشم دید حالات خطوط میں مرقوم کئے تھے وہ نہ تو سیاح تھے اور نہ مورخ بلکہ اُنھوں نے تجارت کی مشکلات کا ذکر معمولی طور پر کیا تھا۔ جیسے کوئی اُولوالعزم ہندوستانی کابل یا ایران یا ترکستان میں تجارتی کاروبار شروع کرنے کے بعد مقامی مشکلات اور حکومتی بدنظمیوں کا ذکر اپنے حصہ داروں اور دوستوں کو لکھے۔

فرانسیسی سیاحوں کے بیانات

انگریزوں کے سوا اور قوموں کے تاجر اور سیاح بھی ہندوستان میں آتے اور رہتے تھے۔ برنیر فرانسیسی سیاح ۱۶۵۸ء کے آخر میں آیا اور ۱۶۶۷ء تک ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیر کی۔ اسنے بڑے تجسس سے تمام حالات دیکھے۔ اور بڑی صحت و خوبی کے ساتھ حوالۂ قلم کئے۔ مغلیہ طریقہ حکومت کی حرف گیری جس ڈھنگ سے کی ہے اسکی مثال تلاش کرنا دشوار ہے۔ وہ مغل لشکروں کی بابت لکھتا ہے "وہ ایسی بےقاعدگی سے کوچ کرتے ہیں کہ جس طرح حیوانات چلتے ہیں۔ اور جب انکی ترتیب اور قطار ٹوٹ جائے۔ تو پھر اصلاح محال ہے۔ وہ اُس پرزور دریا کی مانند معلوم ہوتے ہیں جو اپنے کناروں سے باہر نکل کر چاروں طرف پھیل جاتا۔ اور بے روک ٹوک تباہی لاتا ہے" اُسنے یہ بھی لکھا ہے کہ پچیس ہزار تربیت یافتہ اور قواعدداں سپاہ مغل لشکروں کو مغلوب کرنے کے لئے کافی ہے۔ چاہے وہ شمار میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ پھر وہ لکھتا ہے:۔ گو ہندوستان سونے چاندی کی کان ہے۔ مگر دنیا کی اور قوموں کی نسبت اہل ہند کی ظاہری وضع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہے"

برنیر کا مطلب مغلیہ طریقہ حکومت ہے کہ جسکے اراکین رعایا کو لوٹنے میں خوش ہوتے ہیں وہ گورنروں اور اعلیٰ حاکموں کی نسبت لکھتا ہے:۔ "کاشتکاروں پر انھیں اختیار مطلق حاصل ہے شہروں کے اہل صنعت اور تجارت پیشہ لوگوں پر بھی انکا اسی قسم کا غلبہ قائم رہتا ہے۔ جیسے دیہاتیوں پر۔ وہ مطلق العنان حکمرانوں کی طرح حکومت کرتے ہیں۔ کوئی ایسا حاکم اور فرمانروا نہیں ہے کہ جسکے روبرو کسان صناع اور تاجر اپنی جائز شکایات پیش کرکے دادرسی حاصل کرنے کی توقع کرسکیں۔ نہ تو پارلیمنٹ ہے اور نہ انصاف پرست جج ہیں جو ان غریبوں کو ظالم حکام سے بنا معاوضہ دلا سکیں" اسی وجہ سے کوئی آدمی

اپنے کو آسودہ حال ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ وہی لوگ راحت و خوشحالی کا بے کھٹکے ثبوت دے سکتے تھے جو بادشاہ یا کسی بڑے صاحب اختیار و قدرت حاکم کے منظور نظر اور پروردہ تھے۔" زراعت کا حال بہت برا ہے۔ اور بڑا حصہ ویران اور غیر زرعہ پڑا رہتا ہے۔ کیونکہ آباشی کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ کاشتکار اسوجہ سے محنت سے جی چراتا تھا کہ حکام اسکی خون پسینہ کی کمائی چشم زدن میں لیکر چل دیتے تھے اور گورنر اسوجہ سے اصلاح کی تجاویز سے گریز کرتا تھا کہ اُسے اپنا عہدہ متزلزل معلوم ہوتا تھا۔ مغلی طریقہ انتظام کے باعث قصبے۔ شہر اور دیہات پختہ اینٹوں اور اعلیٰ چیزوں کے بجائے مٹی کے بنے ہوئے تھے۔

تعلیم کی بابت وہ لکھتا ہے "جن حالات کا میں نے ذکر کیا ہے۔ انکی روشنی میں رعایا کے درمیان جہالت اور ناخواندگی کا عالمگیر ہونا امر طبعی ہے۔ کیا ان حالات میں ہندوستان میں کالج اور تعلیم گاہیں قائم ہو سکتی ہیں۔ اور اُنکے لئے اوقاف متعین کرنا ممکن ہے؟ ایسے کالجوں کے بانی کہاں ملیں گے؟ اگر بالفرض کسی نے کوئی تعلیم گاہ قائم بھی کر دی۔ تو طلباء اور معلم کہاں سے آئیں گے؟

جو مختصر حالات چشم دید کوائف کی بنا پر مذکور ہوئے ہیں۔ ان کی بنا پر یہ خیال کرنا محال ہے کہ اگلے وقتوں کے لوگ اور ہمارے اجداد ہماری نسبت زیادہ خوشحال تھے۔ یا مغلوں کے زمانہ کی حالت اس زمانہ سے بہتر تھی۔

جے۔ آر۔ رائے۔

مقالات ٹالسٹائی

کبھی اُس شخص کو خوشی نہیں ہو سکتی جو محض حصول مسرت کے خیال سے شادی کرتا ہو۔ شادی سے مسرت اُسوقت حاصل ہو سکتی ہے جب زن و شوہر دونوں کا مقصد ایک ہو۔ جو لوگ شادی کرنا چاہتے ہوں میں اُنسے درخواست کرتا ہوں کہ وہ شادی سے پہلے تو غور کر لیں اور سمجھ لیں کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے۔

مترجمہ عالی لکھنوی

ابتدائی تعلیم پر ایک نظر

ابتدائی تعلیم سے میری مراد اُس تعلیم سے ہے جو درناکیولر مدارس میں دیجاتی ہے۔ اسمیں اُردو ہندی زبان میں تقریباً کل اہم مسائل کی تعلیم زیادہ سے زیادہ سات سال میں ختم ہوجاتی ہے۔ یعنی اگر لڑکا چھ سال کی عمر میں (جیسا حکم ہے) داخل اسکول ہو تو ۱۳ سال کی عمر میں ایک معجون مرکب بنکر نکلتا ہے۔ وہ ادب کے لحاظ سے ادیب، حساب کتاب کے اعتبار سے خاصہ ریاضی داں، تواریخ کی حیثیت سے مورخ، جغرافیہ کے لحاظ سے تمام دنیا کا جغرافیہ داں، اقلیدس و جامیٹری کو پیش نظر رکھتے ہوئے پورا انجینئر، غرض ضروریات زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہجاتی جس میں دسترس نہو۔

میں یہ کہنے کی تو جرأت نہیں کرسکتا کہ "ایں خیال است و محال است و جنوں"، کیونکہ موجودہ تعلیم کے قصیدہ خواں فوراً کہہ اُٹھینگے کہ اتنے دنوں سے تجربہ ہوتا چلا آیا ہے۔ لاکھوں کروروں پاس ہوکر نکل چکے ہیں اور آج ہر قسم کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ لیکن میں ادب سے اُنکی جناب میں گذارش کرونگا کہ پاس کرنا منحصر ہے سوالات کے جواب لکھنے پر۔ غور سے دیکھئے امتحانات کے پرچے۔ کیا ایک طوطا رٹ کر پاس نہیں کرسکتا۔ اور اگر مختلف کاموں کی انجام دہی انکی غرض ہے تو اُن چیزوں کی کیا ضرورت ہے جنکی انھیں مرنے کے بعد بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ خیر میں اس بحث کو کسی دوسرے موقع کے لئے اُٹھا رکھتا ہوں۔ میں آج صرف اُن کتابوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں جسپر ہماری مذکورۂ بالا امتحانوں اور خام خیالیوں کا مدار ہے۔

لو ابتدا سے کہتے ہیں ہم داستانِ عشق — آخر شبِ فراق کی تو انتہا نہیں

سکشن ۱ - اسمیں کوئی کتاب مقرر نہیں ہے۔ اسی میں چارٹ اور نقشوں کی مدد سے حروف پہچنوائے جاتے ہیں اور پھر انہیں کے ذریعہ سے الفاظ بنوائے جاتے ہیں حساب کتاب میں

بالغریم اور تختہ سیاہ کی مدد سے گنتی اور پہاڑہ بتایا اور لکھایا جاتا ہے۔ بس یہی دو کام ہیں۔ چارٹ اور نقشے ممکن ہیں مختلف ہوں مگر اس صوبہ میں جو تعلیمی نقشے مستعمل ہیں ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو لڑکوں کی معلومات کو وسیع کرے۔ یہ میں ماننے کے لئے تیار ہوں کہ لڑکوں کو معلومات سابقہ کی وجہ سے آسان ہوتی ہے مگر اس سے یہ نہیں ہوتا کہ معلومات میں کچھ اضافہ بھی ہو۔ معلومات میں اضافہ ہونا ہی تعلیم ہے۔ مثلاً "آم" "آلو" "آری" وغیرہ الفاظ کے پہلے "آ" کی آواز نکلتی ہے، بشرط "آ" کی صورت تحریر بذریعہ بلیک بورڈ بتا دیتا ہے یہ مان لیا کہ لڑکے "آ" سے تحریراً و تقریراً آشنا ہو گئے اور معلومات کا یہ پہلو روشن ہو گیا مگر ساتھ ہی ساتھ دوسرا پہلو کسقدر تاریک رہگیا کوئی ایسا لفظ نہیں بتایا گیا جس سے اُنکے دماغ پہلے سے ناآشنا ہوں۔ اسکے لئے اگر دو چار دس الفاظ واقفیت سابقہ کے ہوتے اور دو چار انجان ہوتے تو یقیناً اُنکے دماغ میں نئے الفاظ و معانی کا ذخیرہ جمع ہوتا اور یہی تعلیم کا حاصل ہے۔ مثلاً "آم" "آلو" "آری" "آتش" "آب" "آدم" ان سے پہلی غرض بھی پوری ہوتی اور نئے الفاظ اور اُنکے معانی بھی معلوم ہوتے۔ اسی طرح کل حروف کے نکلوانے میں لڑکوں کی واقفیت میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

سکشن ب۔ اسمیں پڑھنے کے لئے کتاب مقرر ہے مگر نصاب کی ساری کتاب اُلٹ ڈالئے ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملیگا جو واقفیت میں ترقی کرتا ہو اسمیں بھی ضرور تھا کہ جہاں آسان الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہاں ہر سبق میں چند مشکل الفاظ بھی مناسب موقع پر چسپاں کئے جاتے۔

درجہ ۱۔ اس کلاس میں جو کتاب پڑھائی جاتی ہے اسپر بھی مجھے وہی شکایت ہے جو اوپر عرض کر چکا ہوں۔ اسمیں کہیں کہیں ایک آدھ لفظ دکھائی دے جاتے ہیں مگر "الناد کالمعدوم" وہ ہماری ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے جس طرح کہیں کہیں اچھے اچھے الفاظ دکھائی دے جاتے ہیں اُس سے زیادہ ایسے لفظ ملتے ہیں جو اُردو کے لئے وبال جان ہیں۔ یہ کتاب ۳۶ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کہانی کا نتیجہ مقولہ کی صورت میں نکالا گیا ہے۔ مقولے اچھے ہیں مگر اسپر جو کہانیاں تیار کی گئی ہیں وہ اکثر اُس سے کم تعلق رکھتی ہیں یا جو کہانیاں ہیں اُنپر وہ مقولے چسپاں نہیں یہ ایک نقص ہے۔

مقولے میٹھے ہندی کے لئے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ اُردو کے فصیح لفظوں میں ادا ہو سکتے تھے۔ کہانیوں میں اگر التزام کیا جاتا تو تاریخی۔ تمدنی۔ اخلاقی ہر ایک ہو سکتی تھیں مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس

کلاس میں نظم سے بھی آشنا کرنا ضروری تھا مگر یہ بھی نظر انداز کیا گیا ہے۔

درجہ ۲ - اسمیں ریڈر نمبر ۲ پڑھائی جاتی ہے۔ زبان کے لحاظ سے جو شکایت مجھے پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ اسمیں ۳۶ کہانیاں ہیں۔ کہانیوں میں جو نقائص پہلے دکھا چکا ہوں، اس سے یہ بھی پاک نہیں۔ اسمیں بھی کوئی نظم نہیں۔

درجہ ۳ - اسمیں جو کتاب ہے وہ تاریخی۔ زراعتی۔ اخلاقی مضمون سے پُر ہے۔ اگر ایسے مضامین کا لحاظ شروع سے رکھا جاتا تو اور بہتر تھا۔ زبان کے متعلق جو شکایت پہلے تھی اب بھی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی لفظ ایسا نہ آنے پائے جو لڑکوں کی سمجھ سے دور ہو۔ اب آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ پانچ سال کی تعلیم کے بعد لڑکے کو اگر معلوم ہوا تو کتے۔ خصی کا قصہ یا درجہ ۳ میں پہونچکر چند تاریخی اور زراعتی باتیں زبان کے لحاظ سے ایک لفظ بھی نہیں آیا اگر انکو فصیح اُردو دیدیجاوے تو نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں درجہ ۳ تک جو کتاب اُردو والوں کو پڑھائی جاتی ہے وہی ہندی حرفوں میں ہندی والوں کو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ میری دانست میں دونوں زبانوں پر ظلم کیا گیا ہے۔

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم نے بھی کتابیں تیار کی تھیں جنکو میں نے دیکھا ہے وہ بہ نسبت اسکے کہیں بہتر ہیں تقریباً کل ضروریات کا اسمیں لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہاں صرف یہ فرق ہے کہ اُس میں تصویریں نہیں ہیں نہ اسکے قاعدہ کے پڑھانے کے لئے ا سے انڈا۔ ب سے بکری کہنے کی ضرورت پڑتی۔

درجہ ۴ - اسمیں سوا اُردو مولفہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم پڑھائی جاتی ہے۔ یہ اُردو کی حیثیت سے عمدہ کتاب ہے۔ نظم و نثر مناسب ہر قسم کے مضامین کا خیال رکھا گیا ہے۔ زبان بامحاورہ اور فصیح ہے مگر درجہ ۳ کی ریڈر کے ساتھ اسکی مواصلت ایسی ہی ہے جیسے حریر میں ٹاٹ کا پیوند۔ میں تجربتاً لکھتا ہوں کہ جو لڑکے درجہ ۳ پاس کرکے آتے ہیں پڑھ نہیں سکتے عرصہ تک انکو محض پڑھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک سال کی مدت کورس کی زیادتی، فیل ہونے کا خوف نہ پوچھئے کیا حالت ہوتی ہے اُن دشواریوں کا ذکر ہم آیندہ کریں گے۔

درجہ ۵ و ۶ - میں ادیب اُردو مولفہ جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم پڑھائی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں یہ کتاب درجہ ۷ کی کتاب سے بہت پیچھے ہے یعنی فائینل ریڈر جو درجہ ۷ میں پڑھائی جاتی ہے۔ اسکے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں کرتی مضامین اچھے ہیں اور ہر موضوع کے ہیں۔

درجہ ۷ - اسمیں فائنل ریڈر ہے جسمیں میر امن صاحب کی "باغ و بہار" "مرزا رجب علی بیگ کا فسانۂ عجائب" "غالب مرحوم کی اردوے معلی" "پنڈت رتن ناتھ سرشار" کی سیر کوہسار "مولوی نذیر احمد صاحب و سر سید صاحب کے مضامین" "حالی صاحب کا مقدمہ - شعر و شاعری حکیم ناصر علی صاحب دہلوی اڈیٹر صلائے عام کے چند مضامین - غرض ابتدا سے لیکر انتہا تک تمام چوٹی کے انشا پردازوں کے مضامین جمع کئے گئے ہیں - اسی طرح نظم میں جملہ استادان سخن کے کلام کے نمونے موجود ہیں یہ کتاب پچھلے کورسوں کو دیکھتے ہوئے ایسی اوق ہوگئی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

ایسے لڑکے جنھوں نے پانچ سال تک ابتدائی تعلیم میں ایک لفظ بھی فصیح اردو کا نہ پڑھا ہو وہ کہاں تک ایسی کتابوں میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں یہ جواب کہ انکا پاس کرنا انکی کامیابی کی دلیل ہے درست نہیں کیونکہ جس طرح پاس کرائے جاتے ہیں انکا جی ہی جانتا ہے - کورس کے علاوہ اس قسم کے مضامین خاک انکی سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ قابلیت اور چیز ہے طوطے کی طرح رٹ لینا اور بات، حالت یہ ہوتی ہے کہ صحیح املا تک نہیں لکھ سکتے - ایک خط میں بہت سی غلطیاں موجود - بولنے کا شعور نہیں - غیر درسی کتب کے ممتحنان پر یہ اچھی طرح روشن ہے کہ لڑکوں میں کہاں تک لیاقت ہوتی ہے -

ایسی تعلیم جسکی بنیاد بالکل کھوکھلی ہو کہاں تک صحیح کہی جا سکتی ہے اسکا انجام اردو سے نفرت اور اس تعلیم سے وحشت پر مبنی ہوتا ہے - میرا مدعا یہ ہرگز نہیں ہے کہ اوپر کی کتابیں آسان کر دی جاویں بلکہ یہ استدعا ہے کہ نیچے کی کتابیں ایسی کر دی جاویں کہ لڑکے علی الترتیب اوپر کی کتابوں کی تعلیم کے لئے تیار ہوتے رہیں - اب لگے ہاتھوں دوسرے سبجکٹ کو بھی ملاحظہ فرمایئے -

حساب کے موجودہ کورس میری دانست میں بہتر ہیں نہ اتنے آسان ہیں نہ مشکل مگر ایسے سوالات کے ترمیم کی ضرورت ہے جنکی زندگی میں ایک عام آدمی کو ضرورت نہیں -

جغرافیہ کی تعلیم مڈل تک پہونچتے پہونچتے تمام دنیا کی ہو جاتی ہے - حالانکہ اسکی ضرورت نہیں جغرافیہ کی تعلیم ہندوستان سے زیادہ ایشیا تک محدود ہونی چاہیئے اوپر کے درجوں میں ہندوستان تک کافی ہے اور مڈل کے درجوں میں زیادہ سے زیادہ ہندوستان اور ایشیا تک کی ضرورت ہے تمام دنیا کے جغرافیہ جاننے سے لڑکوں کو کچھ فائدہ نہیں یہ بات روشن ہے کہ اردو ہندی کی تعلیم

غریب ہندوستانی لڑکے ہی پاتے ہیں سو اُنکے تعلقات تمدنی یا معاشرتی اپنے ضلع یا صوبہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تمام دنیا کے ارضی حالات پیداوار۔ ندی۔ جھیل۔ پہاڑ کے ناموں سے غالباً زندگی بھر فائدہ نہیں اُٹھاتے پھر اگر اُنکے مناسب حال تعلیم دی جاوے تو زیادہ مفید ہو اور اُسکے بجائے اُن اوقات میں جو دریا۔ پہاڑ۔ جھیل۔ مشہور شہر۔ آب ہوا۔ رقبہ۔ آبنائے۔ خاکنائے۔ راس۔ بندرگاہ وغیرہ کے رٹنے میں صرف ہوتے ہیں کوئی مفید کام سکھایا جائے۔

کوئی شخص ایسا نہ ملیگا اور اگر ملیگا تو خال خال، کہ جسنے مڈل پاس کرنے کے بعد بھی کہیں کا جغرافیہ یاد رکھا ہو۔ ہم ایک دیہات کے رہنے والے "امریکہ" افریقہ" اسٹریلیا" میں کیوں پریشان پھریں وہاں کے ندی پہاڑ کو کیوں یاد کریں وہ ہمارے کس کام آسکتا ہے۔

اگر کوئی جغرافیہ داں ہونے کی حیثیت سے یہ علم سیکھنا چاہے تو اُسکے لئے علیحدہ اسکول ہونے کی ضرورت ہے جہاں جغرافیہ کی تعلیم خاص طور پر ہوتی ہو۔ ایسے اسکول میں اسقدر جغرافیہ کی تعلیم بالکل ناموزوں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسمیں لڑکے زیادہ ناکامیاب ہوتے ہیں۔ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ سب سے بہتر مضمون۔ مگر جس پیمانہ پر تعلیم ہوتی ہے درست نہیں۔ مارسڈن صاحب نے کتاب کیا لکھی ہے۔ ہندو مسلم کے نفاق اور آپس کے جھگڑے کے بیج بونے کا آلہ بنا کر بچوں کے ہاتھ میں دیدیا ہے ایک ہندو لڑکا مڈل پاس کرنے کے بعد اسیقدر یاد رکھتا ہے کہ علاؤالدین بدکار۔ محمد تغلق مجنوں اورنگ زیب ہندو کش اور متعصب تھا۔

کیا تواریخ سے ایسی تعلیم حاصل کیجاتی ہے کہ واقعات سے نتیجہ اخذ کرسکیں۔ کسی بڑے نتیجہ سے عبرت حاصل کریں۔ اور تاریخی تجربات سے زندگی میں فائدہ اُٹھائیں۔ ہرگز نہیں۔ میری دانست میں تواریخ رٹانے سے ایسے فوائد حاصل کرنے کا ملکہ پیدا کرانا بہتر تھا۔ اگر لڑکوں کو مورخ بنانا ہے تو خیر۔ اگر اخلاق سدھارنا یا مذکورہ بالا فوائد حاصل کرانے ہیں تو اخلاق سدھارنے والی تاریخیں پڑھائی جائیں۔ ایسے قصوں سے پر ہیر واجب ہے جس سے نفسانیت میں ترقی ہو۔ اسکے علاوہ اتنی مختصر تاریخ سے لڑکے مورخ بھی تو نہیں ہوسکتے۔ ہاں آپس کے نفاق کے لئے ضرور سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ مضمون ایسا ہے جسپر خاص طور پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے جسپر انشاء اللہ پھر کبھی لکھوں گا مضمون کی طوالت کی وجہ سے یہاں نظر انداز کرتا ہوں۔

جامیٹری - اگر فرضی لکیروں، مثلثوں - زاویۃ الاضلاعوں یا متوازی الاضلاعوں کے بنانے و برابر کرنے کا ذریعہ ہے تو تضیع اوقات ہے - اور اگر علت معلول سے بحث - ترتیب قائم کرنا، استدلال پیش کرنا، نتیجہ اخذ کرنے کا مادہ پیدا کرنا مقصود ہے تو بہت بہتر ہے کیا ایسا ہوتا ہے؟ واقعات اسکے شاہد نہیں - پھر فرضی لکیروں سے فائدہ - ہم اس کامیابی سے خوش نہیں کہ لڑکے مڈل پاس ہوجاتے ہیں - ہم تو جب جانیں کہ اس سبجکٹ میں کامیابی ہوئی کہ جب ہر معاملات میں استدلال و ترتیب و ثبوت کا دھیان رکھیں -

ابتدائی تعلیم کی ترقی میں تنزلی کے آثار

موجودہ تعلیم کے بارے میں بہت کچھ عرض کرچکا اب اسکے انجام کی ایک دھندلی سی تصویر بھی ملاحظہ فرمالیجئے - غالباً دسمبر کے نمبر میں ڈسٹرکٹ گزٹ اعظم گڈھ نے تعداد طلبہ میں بمقابلہ سال گذشتہ ۲۱ نمبر فیصدی کی کمی دکھلا کر افسوس ظاہر کیا تھا، میرے نزدیک یہ کمی تعداد تعجب انگیز نہیں بلکہ تعجب یہ ہے کہ صرف اسیقدر کمی کیوں ہوئی - حصول تعلیم میں بظاہر دو فائدے ہیں - پہلا فائدہ یہ ہے کہ لڑکے تعلیم پاکر معاش حاصل کرنے اور زندگی آرام سے بسر کرنے کے قابل ہوجائیں - دوسری غرض یہ ہوتی تھی کہ تعلیم ایک جوہر لطیف ہے اسکا حاصل کرنا انسان کا فرض ہے مگر ایسے لوگ یہاں کم ہیں - یہ اغراض عام تعلیم کے ہیں - اردو مڈل کی تعلیم تین گروہوں پر مشتمل ہے - اول وہ غریب گروہ جنکا پیشہ دفتری ملازمت ہے - دوسرے عام پیشہ ور طبقہ کے افراد مثلاً لوہار - بڑھئی - حجام - دھوبی وغیرہ وغیرہ تیسرے وہ لوگ جو تعلیم کو جوہر لطیف سمجھکر حاصل کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں - اب دیکھنا ہے کہ تینوں کے اغراض کہاں تک پورے ہوتے ہیں -

طبقہ اول کو لیجئے - پہلے مڈل پاس کرکے مختاری - وکالت - ڈپٹی کلکٹری تک پہونچنا ممکن تھا - اور یہی خیال ایسا تھا جو انکو مجبوراً ادھر متوجہ کرتا تھا - مگر اب یہ حالت ہے کہ مڈل پاس کو اچھی سائیسی بھی نہیں ملتی - پھر اس طبقے کے افراد کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے -

دوسرا طبقہ جس نے اپنے پیشہ پر اردو مڈل کو ترجیح دے رکھی تھی اور انکی امیدیں طبقہ اول کو دیکھکر مستلزم تھیں - لیکن اب وہ دیکھ رہے ہیں کہ مڈل پاس کرنے سے کئی گنا فائدہ انکے پیشہ میں ہے پھر وہ ادھر کیوں راغب ہونے لگے - اگر یہ تعلیم انکے پیشہ میں معاون ہوتی تو ضرور اپنے پیشہ کی ترقی

کے خیال سے تعلیم حاصل کرتے مگر نہ تو اسمیں زراعت کے اصول کی تعلیم ہے۔ نہ تجارت کے گر۔ لوہار۔ بڑھئی وغیرہ وغیرہ کے کام سکھائے جاتے ہیں۔ پھر یہ گروہ بھی ایسی تعلیم سے بیزار نہو تو کیا کرے۔

اب رہگیا تیسرا طبقہ۔ یہ طبقہ متوسط الحال اور اُمرار کا ہے جنکو ضروریات زندگی سے فراغت ہے وہ زیادہ تر اپنے لڑکوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر کسی باخدا کے دل میں آگیا اور طبیعت مذہبی تعلیم کی طرف مائل ہوگئی تو گھر پر معمولی تعلیم دیکر کسی عربی اسکول یا سنسکرت کے اسکول میں بھیجدیا اُنکو اس گاؤخر سے تعلق نہیں۔

اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ موجودہ تعلیم کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

منظور الحق کلیم اعظم گڈھی

کہاروں کا گیت

(مسز سروجنی نائیڈو)

آسانی اور نہایت آسانی سے ہم اُسکو لئے جارہے ہیں۔ وہ ہمارے نغموں کی فضا میں اس طرح جھوم رہی ہے جس طرح پھول نسیم سحر کے جھونکوں سے۔

وہ مثل اُس طائر کے ہے جو سطح آب سے ملا ہوا اڑ رہا ہو وہ اس مستی کی طرح ہے جو خواب راحت میں اکثر ہونٹوں پر کھیلا کرتی ہے۔

خوشی اور نہایت خوشی سے ہم گاتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہے ہیں۔

ہم اُسکو نہایت آہستگی سے لئے جارہے ہیں اور وہ شبنم کے قطرے کی طرح ہمارے نغموں کی جھرمٹ میں چمک رہی ہے، اور اس طرح ادھر اُدھر جھک رہی ہے جس طرح سورج کی کرن سمندر کے مدوجزر میں موجوں سے کھیلتی ہے۔

آسانی اور نہایت آسانی سے ہم اُسکو گیت گاتے ہوئے لئے جارہے ہیں۔ ہاں ہم اُسکو دھاگے میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح نہایت آسانی سے لئے جارہے ہیں۔

(ترجمہ) ... ناقب کانپوری

جول سیمون

خدا کی قدرت کاملہ کا یہ ایک عجیب کرشمہ ہے کہ وہ ممتاز ہستیاں جو ملک اور قوم کے لئے مایۂ ناز ہوتی ہیں اور اپنے علم و فضیلت کی وجہ سے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیتی ہیں اکثر و بیشتر نہایت ہی تاریک اور گمنام گوشوں سے نکلتی ہیں لیکن اُنکی خداداد عقل و ذہانت اُنکو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے اور قدرت کا فیاض دست کرم اُنکو گوشۂ گمنامی سے نکال کر شہرت دوام کے بامِ رفیع پر لا بٹھاتا ہے۔

اِنہیں خوش نصیبوں میں فرانس کے فائد اعظم سیمون کا نام بھی شامل ہے جو ایک نامور عالم و فاضل مصنف و مؤلف ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست سیاسی مدبر بھی تھا۔

بعض مستند اصحاب الرائے نے علم و فضل اور تدبر کے اعتبار سے اُسکو اسلافِ اسلام کے بعض مسلم الثبوت مشاہیر سے تشبیہ دی ہے۔ جنکے تبحر علمی اور سیاست دانی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ حضرات محض ذاتی جد و جہد اور ذوق شوق کی رہنمائی سے مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے اور سیمون ایک ایسی ترقی یافتہ قوم میں پیدا ہوا جسکے خمیر میں تعلیم و تربیت کا جزو غالب تھا۔ اور جو اہل علم و ہنر کی بطریق احسن حوصلہ افزائی کرتی تھی بلاشبہہ سیمون کا اسقدر اوج ترقی پر صعود بہت کچھ اُس اصلاح یافتہ طریقۂ تعلیم و تربیت کا ممنون تھا۔

وہ صوبۂ لوریان کے ایک معمولی گانوں میں ایک غریب کسان کے یہاں پیدا ہوا جو محض کاشتکاری پر بسر اوقات کیا کرتا تھا۔ کچھ بڑا ہوا تو ایک ابتدائی مدرسہ میں بٹھا دیا گیا۔

اُس زمانہ میں غربا کے بچے مدرسے میں بڑی بے سروسامانی سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جول سیمون بھی انہیں مصائب میں مبتلا تھا لیکن وہ اپنی اُولوالعزمی و استقلال اور طبعی ذوق و شوق کے باعث ان مشکلات سے ذرا متاثر نہیں ہوا بلکہ تمام ناگزیر مشکلات پر غالب آگیا۔

اُسنے فان اور لوریان کی تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کی اور بالآخر فارغ التحصیل ہو کر خود بھی مدتوں انہیں مدارس میں درس دیتا رہا۔

سب سے پہلے وہ تحصیل علم سے فارغ ہو کر ۱۸۴۲ء میں مدرسۂ رین میں معلم مقرر ہوا۔ اور سرکاری درسگاہوں کے عام دستور کے موافق ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں تبدیل ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ پیرس کے جامعۂ سعدیوں میں وہ فلسفہ و سائنس کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ ایک عرصہ تک اسی جامعہ میں مقیم رہا مگر جب تعلیم کا معاوضہ اُسکے اخراجات کے لئے ناکافی ہوا تو اُسے گذارہ کے لئے دوسرا ذریعہ بھی اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ اُسنے فرصت کے اوقات میں تصنیف و تالیف اور اخبار نویسی کا کام شروع کر دیا اور نو برس تک اسی طرح پر اپنی زندگی کے ایام گذارے۔ اس عرصہ میں وہ ایک زبردست صحیفہ نگار اور مستند انشا پرداز بن گیا۔

پہلے پہل اُسنے "برئین" اور "عالمین" میں لکھنا شروع کیا اور اسی طرح مختلف اخبارات و رسائل میں نامہ نگاری کرتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ دنوں "اسیکل" اور "الزبیس" کی اسسٹنٹ اڈیٹری اور ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک چیف اڈیٹری کا کام انجام دیتا رہا۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۱ء تک "شئون الفولو" اسی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اسکے علاوہ اور بھی متعدد رسائل و اخبارات مثلاً "الدیا"، "البیوت" وغیرہ بھی اُسی کی زیر ادارت شائع ہوتے رہے۔

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ حالات اور زمانہ اپنے موافق لوگوں کو پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ قول سیمون پر بالکل درست صادق آتا ہے۔

اگر حکومت فرانس میں انقلاب پیدا نہ ہوتا اور سلطنت کا استبداد اپنی حد سے نہ گذر گیا ہوتا تو اسمیں شک نہیں کہ سیمون محض ایک پروفیسر اور مصنف و مؤلف کی زندگی بسر کرتا۔ مگر وطن کی محبت اُسے میدان سیاست میں کھینچ لائی اور مجبوراً اُسے قوم و ملک کا رہنما بننا پڑا۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں جبکہ امپریلزم (شہنشاہیت) کا خاتمہ ہو گیا تو سوریوں کے میدان میں اُسنے ایک زبردست لیکچر دیا جو بجلی کی طرح تمام ملک میں پھیل گیا اور اُسکی مزید شہرت کا باعث ہوا۔ اُسنے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا۔

میں اسوقت آپ کے سامنے کوئی اخلاقی درس دینے کے لئے نہیں کھڑا ہوا ہوں کہ آپ سنیں

اور اُسے یاد کریں بلکہ میرا فرض منصبی مجھے اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ میں آپ کے لئے مثال بن جاؤں تاکہ آپ بھی اُس جذبے کو اپنے دل میں محسوس کرنے لگیں جو میرے دل میں موجود ہے۔ مغرب بھی خواہ ان فرانس کا اجتماع ہوگا اور حکومت نے اب تک جو کچھ کیا ہے اُسکی مخالفت یا تائید کیجائے گی۔ اگر تائید کی گئی تو میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ جو آواز ان مفسد آراء کے خلاف ہوگی وہ میری اور صرف میری آواز ہوگی۔"

اس تقریر کی وجہ سے وہ پروفیسری سے معزول کیا گیا اور عرصہ تک بے روزگار رہا۔ یہ زمانہ اُسنے نائمت میں تاریخی مباحث میں منہمک رہکر بسر کیا۔

انقلاب فرانس کے بعد سیمون بھی نظام حکومت میں شریک ہوگیا اور وہ وزیر معارف و تعلیم مقرر کیا گیا۔ سیمون اصلاح تعلیم کا زبردست حامی تھا اُسنے اپنے زمانۂ حکومت میں جبریہ ابتدائی تعلیم کی ایک تجویز پیش کی اور لوگوں کو اپنا موافق بنا لیا۔ پھر کچھ دنوں بعد وہ اس عہدہ سے مستعفی ہوگیا۔

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود وہ علمی مشاغل میں برابر دلچسپی لیتا رہتا تھا۔ چنانچہ پیرس کی ایک خالص علمی انجمن کا (جو فرانس کے ۴۰ علماء پر مشتمل تھی) ممبر منتخب ہوا۔

اُسی زمانہ میں پروسیا اور فرانس کے درمیان لڑائی چھڑنے والی تھی اُسنے بیچ میں پڑ کر صلح کرانے کی کوشش کی۔ مگر یہ اُسکی پہلی کوشش تھی جس میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

۱۸۶۳ء میں مجلس واضع قوانین کا رکن منتخب کیا گیا۔ اُسنے اپنے زور بیان اور قوت استدلال سے اُن لوگوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا جو اُسکے حد درجہ مخالف تھے۔ اُسنے اپنی قوم پر ثابت کر دیا کہ وہ قوم کی پستی میں گری ہوئی خواتین کو ذلت و فلاکت سے نکالنے میں اُن کا ممد و معاون ہے اور مسئلہ تعلیم و تعلم اور نظام حکومت میں اصلاح کا دل سے خواہاں ہے۔ وہ اکثر علمی، ادبی اور سیاسی انجمنوں کا صدر مقرر ہوتا رہا، بالآخر ۱۸۷۶ء میں وزیر اعظم منتخب ہوا۔

یہ وہ عظیم المرتبت شخص تھا جسکے ایک پہلو میں علم اور دوسرے پہلو میں عملی سرگرمی تھی، اُسمیں علم و تہذیب تدبر دانائی اور عزم و استقلال یہ ایسی صفات تھیں جنکی وجہ سے وہ باطل پرست دشمنوں سے کبھی مخوف نہ ہوتا تھا اور نہ بڑے سے بڑے مصائب و آلام اور حوادث اُسکو راہ راست سے

ہٹا سکتے تھے۔ وہ ایک مستقل مزاج انسان تھا اور جو کہتا تھا ہمیشہ اُسی پر قائم رہتا تھا۔ آپ دیگر اقوام میں اُسکی سی مثالیں پا سکتے ہیں مگر جس چیز نے اُسے سب سے زیادہ ممتاز کیا وہ اُسکا وسیع اخلاق اور جذبۂ قومی تھا۔

اُسنے صرف اپنی تحریر کے سہارے زندگی بسر کی اور باوجود مناصب جلیلہ پر فائز ہونے کے اُسکی گذراوقات کی ہمیشہ یہی صورت رہی۔ اگر وہ اخلاق اور خدمت قومی کے اُس بلند راستہ سے جسپر وہ ہمیشہ سے چل رہا تھا نیچے اُتر کر ذرا سی خود پرستی کی کوشش کرتا تو یقین جانیئے کہ جمہوریت فرانس کی صدارت اُسکے قدموں کے نیچے تھی اور جس طرح تحریر و تقریر میں اُس نے اپنا لوہا منوا لیا تھا اسی طرح یورپ بلکہ ساری دُنیا کے مسلم الثبوت اُلوالعزم بادشاہوں میں اُسکا شمار ہوتا۔

بلاشبہہ اُسنے ایک کامیاب اور بہترین زندگی گذاری۔ خصوصاً اُسکی زندگی کے آخری ایام قوم و ملک کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہوئے۔ آخر عمر تک صحیفہ نگاری ہی اُسکا ذریعۂ معاش رہا۔ حتیٰ کہ فرانس کے ایک مشہور اخبار نے اُسکا ایک آرٹکل چھاپا جو اُسنے مرض الموت میں لکھا تھا اور جسمیں وہ شایع ہوا ہے اُسکا لکھنے والا اس دنیائے فانی کو خیرباد کہہ چکا تھا،

نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ رانیست فردا اُمید

اُسکی مصنفات و مؤلفات اور مضامین کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ سب سے پہلے جن کتابوں کو اُسنے شایع کیا وہ یہ ہیں "الواجب" "الدین الطبیعی" "الحریۃ المدنیۃ" "الحریۃ السیاسیۃ" تین مؤخرالذکر کتابوں کا ایک ہی موضوع ہے جسکو مذکورۂ بالا تین عنوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور اُسکے ذریعہ عوام کو جمہوریت کی تعلیم دینے اور اُنکے قلوب میں آزادی و حریت کی محبت بھرنے کی کوشش کی ہے۔

اسکے علاوہ اُسنے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں "کتاب الفلسفۃ" "الطبقۃ العاملۃ" "المدرسۃ اصلاح التعلیم الثانوی" "الوطنی الصغیر" "موت سقراط" "الفلسفۃ الاسکندریۃ" "المرأۃ فی قرن العشرین" "التعلیم المجانی الاجباری" اُسکی تصانیف اور مضامین اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اُنکا لکھنے والا اپنے اندر ایک شریف دل رکھتا تھا اور ایسا دل

ظلم وستم سے متنفر تھا۔ جو لوگوں کو باہمی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی رغبت دلاتا تھا۔ درجو مایوس اور تنگ دست لوگوں کی اصلاح کے لئے بے چین تھا۔

اُسکی تصانیف و تالیفات سے ثابت ہوتا ہے کہ سیمون ایک معقول فراخ دل غیر متعصب مذہبی آدمی تھا۔ اُسکی مذہبیت میں عقل و حکمت کی تمزیج نے اُسکو صحیح معنوں میں مکمل انسان بنا دیا تھا۔

یہ اُن مخصوص ہستیوں میں سے ہے جسکی نظیر آسانی سے نہیں ملتی۔ خصوص اس زمانہ میں جبکہ یہ بات ناممکن سی ہو گئی ہے کہ کوئی شخص مذہب سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ دنیا سے بھی دلچسپی رکھے۔ عام رواج ہے کہ جو شخص مذہبی ہو گیا اُسے دنیاوی معاملات سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اور جسکا دماغ فلسفہ و حکمت سے روشن ہو گیا اُسکو خدا کی خدائی میں بھی شبہ ہونے لگا اور اپنے محدود دماغ کو کائنات کا مخزن اسرار سمجھنے لگا۔ لیکن سیمون کی ہستی عجیب و غریب ہستی تھی وہ فلسفہ اور علم الحقائق کا جتنا دلدادہ تھا اُس سے زیادہ مذہب اور ملت کا گرویدہ تھا۔ قابل ستائش ہے وہ ذات جسمیں سیمون کی سی ذہانت و فطانت موجود ہو مبارک ہے وہ قوم اور وہ سرزمین جسمیں سیمون کے سے سپوت پیدا ہوں۔ سیمون آزادی کو پسند کرتا تھا وہ پابندیوں سے ہمیشہ متنفر رہا۔ وہ ملک و قوم کو حریت و آزادی کی طرف بلاتا تھا۔ اُسکے قول و فعل میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ وہ انسانیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ تمام صفات جو ایک انسان کے لئے ضروری ہیں اُس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

قوم کی جانب سے اُسکی اِن خدمات جلیلہ کا اس صورت میں صلہ دیا گیا کہ فرانس کے دارالسلطنت پیرس میں جمہوریت کی زیر سرپرستی اُسکا ایک مجسمہ نصب کیا گیا اور (اُس کی نقاب کشائی کے موقعہ پر) فرانس کے بزرگترین افراد مجتمع ہوئے اُنھوں نے اُسکی زبردست علمی فضیلت، سیاسی تدبر اور ملکی و قومی خدمت کی بہترین الفاظ میں مدح و ستائش کی خصوصاً اُسکی خوش اخلاقی اور فضیلت علمی کا خاص طور سے مرثیہ پڑھا گیا۔

محمد حسین حسان پلی بھیت

دلچسپی

بہت سے آدمیوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا دلچسپی کی جگہ نہیں ہے۔ تعجب کی بات ہو کہ باوجود اس امر کے کہ ذرہ ذرہ میں لطف اور قدم قدم پر دلچسپیاں موجود ہیں۔ دنیا کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا غیر دلچسپ جگہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہی عقیدہ آدمیوں کو دنیا کی دلچسپیوں سے محروم رکھتا ہے دنیا کے لوگ مُردہ دل ہیں اور زندگی کی قدر نہیں جانتے بلکہ بہت سے تو لطف اور دلچسپی کی چیزوں سے گریز کرتے ہیں اور اپنے جسم اور روح کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے ہیں اور اسکو ذریعہ بہتری اور کلیا آسائش سمجھتے ہیں۔ اسمیں نہ دنیا کا قصور ہے نہ آدمیوں کا۔ بلکہ یہ نادانی اور غلط خیالی کا نتیجہ ہے اگر دنیا کے لوگ دنیا کو دلچسپی کی جگہ خیال کرنے لگیں اور اپنی توجہ کو بجائے دردناک منظر میں لگانے کے دلچسپی کی کھوج اور لذت کی غور فکر میں صرف کریں تو ہر شئے ہر فعل ہر منظر میں اُنکو لطف معلوم ہونے لگے۔ بات یہ ہے کہ دلچسپی اور لذت کا دارمدار کسی خاص چیز پر نہیں ہے بلکہ دلچسپی اور لذت کا مادہ ہر انسان کی طبیعت میں ہوتا ہے۔ اور وہ مادہ غور کرنے سے بڑھتا ہے۔ جب انسان کی طبیعت خوش ہوتی ہے ہر ایک چیز بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جب طبیعت میں پژمردگی ہوتی ہے اُسوقت دلکی مسرت آفرین چیزیں بھی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ اور جتنا کسی چیز کی عمدگی یا اُسکی بُرائی پر غور کیا جاتا ہے اُتنا ہی اُسکا اچھا یا برا اثر طبیعت پر پڑتا ہے۔ اسکی تصدیق ذاتی تجربوں اور عالموں کی رائے سے ہوتی ہے۔ بائیرن کا قول ہے کہ دنیا کی کوئی چیز لطف سے خالی نہیں۔ وہ کہتا ہے "ہر جگہ ہر چیز میں لطف ہے ویران جنگل اور طوفانی سمندر میں بھی" بیشک یہی ہے بلکہ میں تو کہونگا کہ درد اور دُکھ میں بھی لطف اور دلچسپی موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت لوگ درد اور دُکھ میں بھی خوش رہتے ہیں۔ لاکھوں آدمیوں نے سچائی اور ایمان کے موقعوں پر تکالیف کو آرام پر ترجیح دیا ہے۔ بعض آدمیوں کا خیال ہے کہ تارک الدنیا لوگ عالم اور تجربہ کار ہوتے ہیں اور یہ سمجھ کے ترک دنیا کرتے ہیں

کہ وہ دلچسپی کی جگہ نہیں۔ مگر یہ کہنا غلط ہے۔ چند آدمیوں کا کسی چیز کو ترک کر دینا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ چیز غیر دلچسپ ہے۔ بلکہ بعض آدمیوں کو ترک لذت ہی میں لذت ملتی ہے۔ پس یہ کہنا کہ دنیا سے گھبرا کر آدمی تارک الدنیا ہوتے ہیں غلط ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ بعض حالتوں میں دلچسپی کی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ خوشی کے وقت کوئی اور چیز دلچسپ ہوتی ہے تو رنج کی حالت میں کوئی اور چیز پسند ہوتی ہے۔ ایک چیز سے دل کا ہٹ جانا اور دوسری چیز سے اُنس پیدا ہو جانے کے یہ معنی ہیں کہ وہ چیز غیر دلچسپ ہے۔ اگر بالفرض یہ بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا دلچسپ جگہ نہیں۔ اگر دنیا میں دلچسپی نہ ہو تو ایک منٹ بھی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

انسان کی رغبت دنیاوی چیزوں سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ کسی اور شخص کا اُسمیں حصہ لینا گوارا نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ ہر چیز اُسی کی ہو رہے اور اس خیال سے کہ کوئی مخل نہ ہو وہ دوسروں کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی اُنکو ہلاک کر ڈالنے کی فکر کرتا ہے۔ اور اُسکی تشنگی ہوتی ہے کہ وہ اُس چیز سے تنہا متمتع ہو۔ انہیں خود غرضانہ خیالات اور غیر منصفانہ روش کی وجہ سے دنیا میں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور دلچسپی نظر نہیں آتی۔ ورنہ دنیا ایسی دلچسپ جگہ ہے کہ باوجود تکالیف کے بھی آدمی اُسکو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ جسوقت کوئی آدمی خلاف عقل اور خلاف انصاف کام کرتا ہے اور دوسروں کو (جو اُسی کی طرح حقدار ہیں) بعض باتوں سے محروم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دنیا اُسکے لئے دوزخ ہو جاتی ہے اور جب وہ اس فلسفہ کو سمجھ جاتا ہے کہ دنیا سب کے لئے ہے اور جتنے آدمی اُسکی دلچسپی میں شریک ہوتے ہیں اُتنی ہی اُسکی دلچسپیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے تو دنیا اُسکی نظر میں جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ صرف صوفی منش حضرات یا وہ لوگ جنکے خانگی حالات دنیا کو غیر دلچسپ بناتے رہتے ہیں اور وہ زیادہ غور و خوض کے عادی نہیں ہوتے تارک الدنیا ہو جاتے ہیں اور تنہائی میں لطف اور مزہ اُٹھاتے ہیں۔

حقیقتاً دنیا کا کوئی حصہ دلچسپی سے خالی نہیں اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ دنیا میں دلچسپی نہیں ہے تو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ارباب فہم اپنے کو مصائب کا خوگر بنا لیتے ہیں۔ آخر کار دُکھ۔ دُکھ نہیں رہتا بلکہ سکھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دنیا میں دلچسپی نہ ہوتی یا دلچسپی پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی تو انسان کوئی کام نہ کرتا نہ بڑے بڑے

شہر آباد ہوتے اور نہ اختراعات جدیدہ سے سامان نشاط میں کوئی افزائش کی کوشش کرتا۔ غرض انسان جو کچھ کرتا ہے اپنی دلچسپیوں کے لئے کرتا ہے۔ ورنہ بیفائدہ اپنی سعی بے سود سے اپنے نفس کو دکھ نہ پہونچاتا۔ قانون قدرت کا بھی اقتضا یہی ہے کہ انسان دنیا کی چیزوں سے مسرت حاصل کرے اور انھیں اپنے لئے دکھ نہ بنائے۔ اس سے اسوقت بحث نہیں کہ بازاروں اور شہروں کے بنانے اور ایجادوں کے کرنے سے دلچسپیاں بڑھ گئیں یا گھٹ گئیں کیونکہ یہ فعل کے نتیجہ اور صحیح سلامت روی اور غلط کوشی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں ارادہ اور منشا سے مطلب ہے اور وہ بتاتا ہے کہ انسان ہر فعل دلچسپی کی امید اور منشا سے کرتا ہے۔ اس خیال کا پیدا ہونا انسان کی فطرت میں داخل ہے گو اسکو علم نہو۔ اس بات کا ثبوت انسان کے فعلوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ ہر خطرہ پر بچاؤ کی کوشش کرتا ہے اور گو وہ دنیا سے بیزار ہو پھر بھی جہاں تک ہو سکتا ہے بہتر زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دنیا میں اتنی دلچسپیاں ہیں کہ ہم انکو شمار نہیں کر سکتے۔ سیر و تماشہ کی دلچسپیاں تو بچہ بھی محسوس کر لیتا ہے مگر علاوہ انکے اُن چیزوں میں بھی جو تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں۔ بعض آدمیوں نے دلچسپی حاصل کی ہے۔ مثلاً جنگ اور خطرہ کے موقعوں پر بہادر لوگوں کو بہت دلچسپی ہوتی ہے لیکن بزدل انکو وبال جان سمجھتا ہے۔ کوشش کیجائے تو جسمانی تکلیف اور عزیزوں کی موت میں بھی ایک دلچسپی کا پہلو نکل سکتا ہے۔

سینٹ کرنٹیم صاحب فرماتے ہیں کہ "دنیا دراصل تماشہ گاہ ہے۔ یہاں کل سامان سوانگ کا ہے۔ اور دنیا کا ہر ذرہ اُسکا ایکٹر ہے۔ جو حالت یا جو منظر ہمارے سامنے ہے وہ تھیٹر کا سین ہے" واقعی اگر انسان غور کرے تو دنیا تماشہ گاہ معلوم ہوگی اور اُسکے ہر منظر میں اُسے ایک تماشہ نظر آئیگا۔ خواہ وہ اُسکے عزیز سے عزیز کی موت کا کیوں نہ منظر ہو۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں دلچسپی کی کمی نہیں مگر دلچسپی محسوس کرنے کے لئے قوت غور کی ضرورت ہے جو شخص یہ قوت رکھتے ہیں انکے لئے دنیا نہایت دلچسپ جگہ ہے۔ جو نہیں رکھتے اُنکے لئے وبال جان ہے۔ جو اس قوت کو رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں دنیا دلچسپ جگہ ہے۔ جو نہیں رکھتے وہ اسکو بدنام کرتے ہیں۔ بڑے دماغ والے جنمیں قوت خیال بڑی حد تک ہوتی ہے دلچسپی میں محو

ہتے ہیں اور کھانے پینے کی لذتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ بعض عالم ایسے گذرے ہیں جو کہتے ہیں کہ
نابوں کے مطالعہ سے زیادہ کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔ فلاسفروں کی فلاسوفی کی دلچسپیاں تو
ام طور پر پسندیدہ ہیں۔ پولیٹکل آدمی کہتے ہیں کہ دخل سیاست میں جو لطف ہے وہ کسی چیز میں
یں۔ کئی آدمی ایسے گذرے ہیں جو دلچسپی کی وجہ سے خیال میں ایسے محو رہتے ہیں کہ اہم سے اہم
ناظر انکے سامنے سے گذر گئے اور انھیں خبر تک نہوئی۔ اور اگر خبر ہوئی تو انھوں نے اُدھر توجہ ہی
کی۔ ہندوستان کے یوگیوں کی بابت مشہور ہے کہ وہ مراقبہ کے سیروں کے سامنے دنیا اور
سکی ساری لذتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ہزارہا چیزیں ہر مذاق کے آدمی اور ہر حالت کے
ناسب موجود ہیں لیکن اگر کوئی خود ہی دلچسپی کی چیزوں کو برا سمجھے اور بہرہ ور نہو تو کیا کیا جائے
یلی چھتری (نام کتاب) میں بہرام کہتا ہے کہ اُسکا کوئی منٹ ایسا نہیں جو دلچسپی نہو۔ وہ کہتا ہے
کہ "لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا غیر دلچسپ جگہ ہے۔ یہ اُنکی مردہ دلی کا سبب ہے۔ اگر دنیا کے آدمی
اُسکی طرح مُردہ دل نہوں اور زندگی کی قدر کریں تو قدم قدم پر دلچسپیاں موجود ہیں" وہ اپنے
خطرہ اور تشویش کی حالت کی دلچسپی کو جو وہ اُسوقت محسوس کر رہا تھا۔ ..... ان لفظوں
میں بیان کرتا ہے "ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کسقدر لطف کے ساتھ وقت کٹا۔ تم نورصاحب
سے باتیں کرنے میں مشغول تھے اور میں کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا کتاب کے قیمتی ورق پھاڑ رہا تھا
پھر تم مسز جے رام سے باتیں کرنے لگے۔ میں سوچتا تھا کہ وہ تمھیں راز کی باتیں بتا دے گی یا نہیں
بتلا دیا تو میرا کیا حشر ہوگا۔ سب بنا بنایا کارخانہ برباد ہو جائیگا۔ مجھے اس نوکر کا جسے خط دے
رکھا تھا کسقدر انتظار تھا۔ ایک منٹ اور نہ آتا تو مسز جے رام تمھیں حال بتا دیتی۔ لیکن خیر ہوئی
خط وقت پر پہونچ گیا۔ پھر یہ خیال ہوا کہ مسعود سمجھ جائیگا کہ یہ میری کارستانی ہے مگر مسعود اسقدر
زود فہم کہاں تھا۔ اُسنے بڑی دیر میں مجھے پہچانا جب تم نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ گھوڑا چڑھایا
کیا باتوں میں کسقدر خوش تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنی باتیں ہو جانا کیا غیر دلچسپ زندگی
اسی کو کہتے ہیں؟ لوگ کام کرنا اور زندہ رہنا جانتے ہی نہیں" بظاہر یہ ایک فرضی افسانے کی
عبارت ہے لیکن حقیقتاً قابل قدر ہے۔ بیشک زندہ دل کے لئے ہر چیز دلچسپ ہے وہ ہر چیز کو
دلچسپ بنا سکتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہے۔ وہ دنیا کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

مردہ دل آدمی نہ دنیا کے کام کا نہ دنیا مردہ دل کے کام کی۔ دنیا مردہ دل کے لئے وبال ہے۔ اور مردہ دل دنیا کے لئے بار دوش ہے۔

بدقسمتی سے مردہ دل حضرات زندہ دلی کی خوبیوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ اکثر جب کوئی کسی مردہ دل شخص کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ معلوم وہ اپنی ابتر حالت ہونے میں کیا بہتری دیکھتا ہے۔ دانشمند آدمی کو چاہیئے کہ ہر وقت ہر حالت میں بہتری کا خیال رکھے۔ اگر اُسکو کوئی صدمہ یا رنج پہونچا ہو۔ یا کوئی تکلیف روحانی یا جسمانی لاحق ہو تو اُسکے رفع کرنے کی کوشش کرے۔ اور اپنے اُن خیالات کو ان باتوں کی یاد سے الگ کرے جو اُسکی تکلیفوں میں روحانی طریقہ سے اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ مصائب و حوادث میں انسان مردہ دل ہو جاتا ہے۔ اور اپنے پریشان کن خیالات میں مستغرق رہتا ہے بعض وقت جب کسی ایسی چیز کے دستیاب ہونے کی امید باقی نہیں رہتی جسکے لئے وہ کوشاں تھا تو انسان مردہ دل ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ مگر یہی غلطی ہے جو ہمارے تکلیف کی باعث ہے اور ہمکو دلچسپیوں سے محروم رکھتی ہے دنیا کوشش کی جگہ ہے یہاں ہمت ہار کر یا رنج منانے کے لئے نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ یہاں ہر مدعا کے لئے کوشش کرنا چاہیئے اور ہر حالت میں ترقی کے لئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ افسردگی یا مردہ دلی سے مصیبت راحت سے نہیں بدل سکتی۔ لیکن اگر خیال کو مسرور بنانے کی کوشش کیجائے تو مصیبت میں راحت کا پہلو پیدا ہو سکتا ہے، درد ہوگا مگر درد کا تکلیف دہ اثر زائل ہو جائیگا، بزم ماتم میں بھی طبیعت خوش رہیگی۔ مگر اسکے لئے اگر سب لوگ دلچسپی کا فلسفہ اچھی طرح ذہن نشین کریں تو پھر دنیا میں دلچسپی ہی دلچسپی نظر آئے۔ پھر اُنسے وہ غلطیاں بھی سرزد نہوں جنسے غیر دلچسپی اور درد اور تکلیف کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ اگر ہم دنیا کی حالت پر غور کریں سمجھیں اور مدعا کے حاصل کرنے کی کوشش کریں تو معلوم ہو جائے کہ دنیا کیسی دلچسپ جگہ ہے۔ یہاں کیسی عجیب اور پُر لطف چیزیں ہیں اور ہم کس طرح اپنی غلطیوں سے اُنکی دلچسپیوں سے محروم رہتے ہیں۔ واقعی اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو بہ آسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا بڑی دلچسپ جگہ ہے مگر ہمارے عقائد و افعال اُسے اکثر غیر دلچسپ ثابت کرتے رہتے ہیں۔

ہری رام۔ رسل گنج علیگڈھ

پہاڑ کی سیر

انگریز لوگ پہاڑ جاتے ہیں کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ جہاں تک انھیں ہر قسم کی آسائش میسّر آتی ہے یا اپنے لئے کوٹھی کرایہ پر لیتے ہیں جس پر روپیہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ پہاڑ کے پانی کو پورن نہیں سمجھتے۔ غذا اندازہ کی کھاتے ہیں۔ سیر و شکار میں وقت صرف کرتے ہیں ہر ایک پہاڑی اسٹیشنوں پر انکی برادری کے کلب بنے ہوئے ہیں جنمیں وہ داخل ہو کر لطف اٹھاتے ہیں اور نفع صحت حاصل کرتے ہیں اور تنومند ہو کر واپس آتے ہیں۔ ہمارے دیسی رئیس بھی اب پہاڑوں پر کوٹھیاں خرید کر یا کرایہ پر لیکر رہتے ہیں۔ بعض انمیں گھوڑے کی سواری تو درکنار پیدل بھی چلنے سے عاری ہیں بعض پیدل چلنا ہی خلاف شان سمجھتے ہیں۔ لباس کے بناؤ بناؤ ملاقاتوں کے چکر۔ پارٹیوں اور کھانوں کی دعوت میں مصروف رہتے ہیں۔ انکی مستورات کسی کمرہ میں پابزنجیر ہو جاتی ہیں۔ اس طرح رئیس اور رئیسہ دونوں کی صحت خراب ہونے لگتی ہے مستورات تو تھوڑے دن کے بعد مکان پر واپس آجاتی ہیں اور رئیس بھی چند روز ڈاکٹروں کے زیر مشق رہ کر روپیہ ضائع کر کے واپس آتے ہیں۔ گھر پہونچکر سخت درجہ کی خست کر کے خرچ کی میزان پوری کرتے ہیں کسی رئیس کو انگریزوں کو کھلا پلا کر گاہے گاہے کچھ ملجاتا ہے بعض کف افسوس ملتے رہتے ہیں۔ دوسرے تیسرے سال انکے ہاں دعوتیں کم ہو جاتی ہیں۔ اخبار اور ناول خوانی سے اوقات بسر ہونے لگتی ہے۔ دو چار سال کے بعد انکی طبیعت مختص ہو جاتی ہے۔

ایک اور فرقہ تعلیم یافتہ حضرات کا جو لگاتار دماغی محنت سے اپنی صحت کھو بیٹھتا ہے آخر وہ اسے مجبور ہو کر پہاڑی آب و ہوا کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان حضرات کے کئی اقسام ہیں

اوّل۔ وہ صاحب جو کتابوں میں پڑھ چکے ہیں کہ ریاضت جسمانی ہر شکایت کی دوا ہے تو انکے پاس زر نہیں کہ پہاڑ کے قیام کا صرف برداشت کر سکیں۔ یا دل نہیں کہ

آمادہ ہوں۔ ایسے حضرات بیک بینی و دوگوش بستر اور دو چار جوڑے کپڑے اور دو چار برتن ہمراہ رکھ کر ایک ملازم ساتھ لے پیدل پہاڑ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ ریل کا کرایہ تو طوعاً کرہاً دینا پڑتا ہے۔ منزل بہ منزل دیوانہ وار چلے جاتے ہیں۔ روکھا سوکھا جو ملگیا کھا لیا۔ کسی دوکان پر فروکشی کا انتظام ہو گیا تو ایک کھاٹ لیکر پسوؤں اور کھٹملوں کی ایذا رسانی اور تکان سفر کے شکار ہوتے ہیں۔ خلاف عادت اتنی ریاضت کرتے ہیں جنکا نفع مشتبہ ہے۔ بہرکیف وہ واپس آکر سمجھتے ہیں کہ وہ پہاڑی سفر سے کئی من حرارت غریزی لے آئے ہیں۔ مکان پر پہونچکر بعض تو بیمار پڑ جاتے ہیں اور بعض محتاط طبع حضرات اپنی صحت کا کافی اہتمام رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلی تسلی انکو یہ ہوتی ہے کہ ہم کوڑیوں کے مول سیر کو ہسار کر آئے اور کامل نفع صحت کا حاصل کر آئے اُن لوگوں پر جنھوں نے پہاڑ کے سفر کے لئے صرف کنبہ اُٹھایا قہقہہ لگاتے ہیں۔

دوئم۔ وہ اصحاب ہیں جو ہمیشہ یہ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگوں میں مہمان نوازی کی خصلت سردی اور خشکی اور قوموں سے بہت کم ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ خود اس خصلت کے عادی نہیں۔ مہمان بننے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ مثلاً اس سال پہاڑ کا شوق چرایا تو وہ پہاڑ پر چند دوستوں یا رشتہ داروں کو خط لکھیں گے کہ فلاں تاریخ کو ہم پہاڑ آویں گے امید ہے کہ آپ کے ہاں فروکشی کی گنجائش ہوگی۔ جواب تو تصور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی آیئے تشریف لایئے گنجائش نکال لیجاوے گی۔ حضرت معہ ملازم روانہ ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک دوست اور عزیز کے یہاں دو دو چار چار دن مہمان رہکر ممنون اور مشکور فرماتے ہیں۔ اگر اتفاق سے تجارت پیشہ ہیں تو وہاں سے کچھ اشیا خرید کر کے وطن لیجاتے ہیں اور ریل کا کرایہ نفع میں نکال لیتے ہیں۔ جب کوئی صاحب سوال کریں تو ایک مقرر جواب ہے۔ میاں آپ کی مرتبہ فلاں عزیز یا دوست کے درجن بھر خط آئے کہ ضرور بالضرور چند یوم اُنکے پاس پہاڑ پر آکر رہو۔ کیا کیا جائے دلداری کرنی ضروری ہے۔ اگر کوئی حضرت قانون پیشہ لیموں نچوڑ ہیں تو وہاں کے کسی نہ کسی طریق سے دو چار مقدمات پھانس لیتے ہیں "ہم خرما و ہم ثواب"

سوئم۔ وہ خسیس شوقین پہاڑ کے ہیں جو ادنیٰ سے ادنیٰ خرچ سے اعلیٰ سے اعلیٰ مفاد اُٹھانے ہوتے ہیں۔ ہمت پیدل چلنے کی نہیں۔ خدا نے کوئی دوست مہمان اُنکے حصہ میں نہیں دیا۔

کسی عزیز سے موافقت نہیں خویشوں کے دوست کم ہوا کرتے ہیں۔ ایسے حضرات بہ صرف قلیل ترین پہاڑ کے سفر کا انتفاع اٹھانا چاہتے ہیں۔

ایک صاحب کا ذکر ہے کہ وہ کسی ضلع میں وکیل تھے انھیں ایک انگریز کو جو پہاڑ سے ہٹا کٹا ہو کر واپس آیا تھا دیکھکر یہ خیال پیدا ہوا کہ پہاڑ عجیب جگہ ہوگی جہاں انسان دوبارہ جوان ہو جاتا ہے اب آپ نے تیاری شروع کی۔ پہلے گھر میں سے سب سے ہلکا ٹرنک تلاش کیا۔ اُسمیں دو قفل مزید لگوائے۔ پرانی لوئیاں تلاش کیں اُسکا بستر بنایا۔ اب اس فکر میں ہیں کہ انٹر کلاس میں جاویں یا سکنڈ کلاس میں۔ دوسری فکر یہ تھی کہ ملازم کی ضرورت پڑے گی یا نہیں۔ پہاڑ جانے کا ارادہ بھی مستقل نہ تھا۔ طبیعت ڈاواں ڈول تھی۔ پہلے سے انتظام نہ کیا تھا ورنہ اگر پہلے ہوٹل کا یومیہ دریافت ہو جاتا تو شاید سفر ہی موقوف ہو جاتا۔ چلنے سے پیشتر کودِ منصوری کی ہر ہمت ہر ہوٹل ہر دوکان ہر مقام کا جغرافیہ ہر شخص سے پوچھا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے کہا کہ میاں وہاں پہونچکر سب انتظام کر لینا۔ خط و کتابت میں کرایہ کا فیصلہ نہیں ہوا کرتا۔ یہ بچونگرا کو بہت پسند آئی۔ چنانچہ حضرت چلے۔ اور کوہِ منصوری پہونچے۔ اب حضرت حیران و پریشان سارے دن گھوما کئے۔ آخر آپ کو ایک جگہ مل گئی جسکو ہوٹل کہا جاتا تھا۔ دو روپیہ یومیہ میں جگہ ملی انمیں خوراک دو وقتہ شامل ہوئی اُنکی باچھیں کھل گئیں کہ اتنا تو وطن میں بھی خرچ ہو جاتا ہے۔ ایک کوٹھری ملی جسمیں ہوا کی مداخلت خلاف مصلحت تصور کی گئی تھی۔ کھاٹ ایسے کھٹملوں سے بھری ہوئی کہ اُسپر نیند آنا دشوار تھا ایک مختصر سا پائخانہ تھا جہاں بھنگن صرف ایک مرتبہ آتی تھی اور بارہ آدمی سے زیادہ اُسمیں جایا کرتے تھے۔ بہرحال آپ وہاں فروکش ہو گئے۔ کھانے کے وقت ایک شخص ایک تھالی میں آم کا آچار دو روٹیاں اور دال کے کٹورے لے آیا۔ ہوٹل والوں سے ڈاکٹر نے کہدیا تھا کہ گھی جگر کے فعل کے لئے مضر ہے اور مرچ مصالحہ بھی مضر صحت ہے۔ ہمارے مسافر بیچارے کفایت کے نارے اسی طمانیت خاطر میں مست ہیں کہ کفایت سے پہاڑ کی سیر ہو رہی ہے۔ ناک بند کر کے وہ بیت الخلا سے واپس آتے۔ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ملتا تھا۔ ہر اور دیجئے تو پانی گرم ہو سکتا ہے آپنے ہر دنیا منظور نہ کیا۔ غسل موقوف کر دیا۔ ایک دن وہاں کی کیفیت برداشت کی اور گرم کپڑا پہنکر سیر کو نکلے۔ اُنھوں نے سُنا تھا کہ پہاڑ میں ریاضت جسمانی خوب کرنا چاہیے۔ اب میاں چلتے

جاتے ہیں اور زور زور سے سانس لیتے ہیں کہ اس ذریعہ سے اوکسیجن زیادہ حاصل کریں۔ ایک انگریز یہ سب گذارہ دیکھ کر یہ کوئی دیوانہ جا رہا ہے مسکرا کر آگے چلا گیا۔ دو ایک ملاقاتی رستے میں ملے اُن کو اپنے قیام گاہ کا اُنھوں نے پتہ نہ دیا کہ مبادا وہ کسی دن وہاں آ نہ مریں۔ ایک دن گذر گیا۔ رات کو قدرے نیند آگئی۔ دوسرے دن تیسرے پہر پیٹ میں درد اُٹھا۔ چورن ٹرنک میں موجود تھا استعمال کیا کچھ نفع نہوا۔ ملازم ساتھ نہ تھا کہ کچھ خدمت کرتا۔ بیچارے کھاٹ پر تڑپ رہے ہیں۔ آخر "ہوٹل" کے مہتمم کو بلایا اُس نے کہا کہ جناب آپ کو درد قولنج کی شکایت ہے بہتر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بلا لیا جاوے۔ بعد تامل بسیار فرمایا کہ اچھا لیکن سب اسسٹنٹ سرجن کو بلانا جسکی فیس دو روپیہ ہوتی ہے۔ مہتمم نے کہا بہت خوب۔ لیکن اگر وہ موجود نہ ہوا تو اسسٹنٹ سرجن کو بلا لوں۔ اچھا جیسا مناسب ہو کیجئے۔ سب اسسٹنٹ سرجن تو ملا نہیں اسسٹنٹ سرجن صاحب آگئے اُنھوں نے بہت ڈرایا اور علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کی فیس پانچ روپیہ تھی۔ دوا بھیجے کے دس روپیہ دینے پڑے۔ دوا کی قیمت مزید برآں۔

تیسرے روز وکیل صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے وطن جانے کی اجازت طلب کی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اس نازک حالت میں تو آپ وطن نہیں جا سکتے۔ چار پانچ روز تک اور قیام کیجئے۔ غذا جو آپ کھاتے رہے وہ درست نہیں ہے۔ خاص پرہیزی غذا تیار کرا کر آپ کو بھجوا دیا کرونگا۔ قہر درویش بجان درویش۔ چار روپیہ یومیہ کا خرچ اور بڑھا۔ جب تین روز گذرے تو وکیل صاحب نے ارادہ مصمم کر لیا کہ اب یہاں سے واپس چل دیں۔ اب سوال یہ درپیش ہے کہ پہاڑی حصہ اُترائی کا پیدل طے ہو یا بولیا جاوے۔ یا رکشا پر جاویں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ رکشا مناسب ہے اُنھوں نے ایک نہ سنی۔ ایک قلی کے کاندھے پر اسباب رکھ پیدل چل پڑے۔ راستہ میں نہایت تکلیف ہوئی۔ پانی پیتے پیتے دم لیتے ہوئے راج پورہ پہونچے۔ وہاں سے ٹم ٹم پر سوار ہو کر دہرہ دون پہونچے۔ وہاں بخار آگیا۔ اور انٹر کلاس میں جس میں لیٹنے تک کی جگہ نہ تھی۔ ہائے ہائے کرتے ہوئے اپنے گھر پہونچے۔ بیوی حیران کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میاں تندرستی کے فائدہ کے لئے گئے تھے۔ اور وہاں سے اتنے نحیف اور کمزور ہو کر بخار میں مبتلا واپس آئے اُسنے پوچھا

سرکار یہ کیا معاملہ ہوا۔ آپ نے اور تو کچھ جواب نہ دیا صرف یہ کہا کہ پہاڑ صرف انگریزوں ہی کو موافق آتا ہے۔ دیسیوں کے لئے تو دوزخ ہے۔ حضرت نے حساب بنانا شروع کیا میزان ہوتے ہی غشی کی نوبت آنے لگی۔

یہ قصہ ایک تمثیل ہے جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستانیوں کو پہاڑ جانے کا شوق تو ہوتا ہے لیکن وہ اس امر سے ناواقف ہیں کہ پہاڑ پر کس طریق سے رہنا چاہیے وہاں نہ غریبوں کو نفع ہوتا ہے نہ امیروں کو۔ وہاں تو نفع اُس شخص کو ہو سکتا ہے جو روپیہ بیدریغ صرف کرے۔ جو مناسب درجہ کی ریاضت کرے۔ غذا وقت پر کھائے اور اندازہ سے تجاوز نکرے۔ مکان اچھا لیکر ساز و سامان کے ساتھ رہے۔ جو لوگ انگریزوں کی آدھی نقل کرتے ہیں اُنکو پہاڑ سے قطعی فائدہ نہیں ہوتا۔ دراصل پہاڑ کی ہوا رقیق اور پانی کمزور ہوتا ہے۔ درختوں اور سبزہ زاروں کی کثرت سے پہاڑ کی رات کچھ زیادہ صحت بخش نہیں۔ لیکن فرحت بخش نظارے سرور انگیز ہوائیں اور ریاضت کے لطیف مواقع پہاڑ کی سیر کو دلچسپ اور مفید بنا لیتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی جائز طریقہ استعمال سے واقف ہو

شمیم لاہور

نالۂ مجنوں

نہ پوچھو دشت میں کیوں نالۂ و فریاد کرتے ہیں
بڑی حسرت سے ہم اُجڑا ہوا گھر یاد کرتے ہیں

غضب کی تھی ستم کیشی کہ ترکِ آرزو پر بھی
جفاؤں کو تری ہم اُستمگر یاد کرتے ہیں

عمر بھر وقفِ رقیباں جام و پیمانہ رہا
دل مرا مجنوں مگر ساقی کا دیوانہ رہا

چُھا کرتے تھے جو دل میں وہ ارماں یاد آتے ہیں
وہ نشتر یاد آتے ہیں وہ پیکاں یاد آتے ہیں

نہ اب سر میں وہ سودا ہے نہ دل میں جوشِ وحشت ہے
وہ بے سامانیوں کے مجھکو ساماں یاد آتے ہیں

حسرت کش لیلیٰ تھا نہ جانداد محمل
ہم جانتے ہیں قیس کو دیوانہ دل تھا

بڑی عدالت

(۱)

خورجہ میں ایسا کون شخص ہے جو پنڈت گوپی ناتھ کو نہیں جانتا۔ آپ وہاں کی ہندو آبادی کے پروہت ہیں۔ ہندوؤں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو پنڈت جی کے جوتش کا قائل نہو۔ بہت سے خوش اعتقاد تو ایسے ہیں جو پنڈت جی کی باتوں کو پتھر کی لکیر مانتے ہیں۔ ہندو تو ہندو اکثر مسلمان بھی پنڈت جی سے شگون دریافت کرنے آجاتے ہیں۔ بچہ ہو یا بوڑھا ہر ایک سے آپ بلائمت اور بخندہ پیشانی پیش آتے ہیں۔ اِس خوش اخلاقی کی بدولت عزت و فراغت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بابو ہنومان پرشاد آپ کے ہمسایہ ہیں۔ اتفاق وقت کہیئے یا شامت اعمال کہ آج کل آپ سے اور ہنومان پرشاد سے اَن بن ہو گئی ہے۔ اول اول تو زبانی تو تو میں میں رہی مگر اب عدالت تک بھی نوبت پہونچ گئی۔

دنیا کے بہت سے اہم واقعات ذرا ذرا سی باتوں سے شروع ہوتے ہیں۔ دُور کیوں جائیے اِس جنگ عظیم ہی کو لیجئے۔ اگر سروبیہ کا شہزادہ قتل نہ ہوا ہوتا تو اِس عالمگیر اور تباہ کن جنگ کا کبھی آغاز نہ ہوتا۔ ایسے ہی پنڈت جی کی لڑائی کا بھی آغاز ہوا۔ سلونو کے روز بابو ہنومان پرشاد صاحب کے یہاں گانے بجانے کا جلسہ تھا۔ بدقسمتی سے پنڈت جی بھی مدعو تھے۔ بھنگ کا نشہ سر پر سوار تھا۔ بابو صاحب اور پنڈت جی دونوں اپنے کو بیجو باؤرا اور تان سین سمجھنے لگے۔ اول تو دونوں نے دل کھول کر گایا اور جب سُرور زیادہ ہوا تو بات بات پر تکرار ہونے لگی اور یہ بحث چھڑ گئی کہ بہاگ میں ماکونل بجتا ہے یا تیز۔ بحث کا چھڑنا تھا کہ حاضرین محفل میں دو حصے بندی ہو گئی۔ کوئی تو بابو صاحب کی رائے کی تائید کرتا تھا اور کوئی پنڈت جی کا ساتھ دیتا تھا۔ پنڈت جی بابو صاحب سے عمر میں بڑے تھے اُنھوں نے بزرگی کے زعم میں آکر کہا "آ غ تو۔ تو ہنومان ہی ہے نہ۔ بندر کیا جانے ادرک کا مزا۔ تم لوگ تو قلم قصائی ہو۔ گانا وانا کیا جانو۔ گانا جانیں برہمن

جو ویدوں کی رچاؤں تک کو لئے اور مُہ سے پڑھتے ہیں۔

یہ الفاظ سُنکر بابو صاحب کو طیش آگیا۔ اُسوقت تو بدمزگی کا خیال کرکے خاموش ہوگئے مگر اُنھوں نے اپنی بات کو اپنے دل میں رکھا اور بدلہ لینے کے لئے کسی عمدہ موقع اور محل کے متلاشی رہنے لگے۔ غصّہ کی آگ نے برسوں کی محبت اور عقیدت کو جلاکر راکھ کردیا۔

جوینده یابنده۔ بدلہ لینے کا ایک موقع اِن کو ہاتھ آگیا اور اُنھوں نے پنڈت جی پر نالش ٹھونک دی۔ معاملہ یہ تھا کہ بابو صاحب کے مکان سے ملا ہوا اور پنڈت جی کے مکان کے ملحق ایک قطعہ افتادہ آراضی تھی۔ وہ دراصل پنڈت جی کی ملکیت تھی۔ مگر نہ معلوم کیوں پنڈت جی اب تک اُسپر مکان نہ بنا سکے تھے۔ مگر چوتھے بیٹے کی بہو کے آجانے سے اُنکو مکان کو زیادہ وسیع کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ خیال کا آنا تھا کہ تعمیر کا کام شروع کردیا گیا۔ مگر ناچاقی اور دلی کدورت کی وجہ سے بابو صاحب نے تعمیر کو روک دیا۔ اُنکا اعتراض تھا کہ اِدھر سے زنانی ڈیوڑھی کا راستہ ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ آراضی بھی ہماری ملکیت ہے جب پنڈت جی نے باوجود تاکید شدید کے تعمیر کو نہ روکا تو بابو صاحب نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور تعمیر کو روک دینے کا حکم امتناعی کرادیا۔

آج منصفی میں غیر معمولی بھیڑ بھاڑ ہے۔ ہر شخص پنڈت جی کے مقدمہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ کیونکہ آج جھوٹ اور سچ میں لڑائی ہے۔ پنڈت جی اپنی سچائی کے زعم میں وکیلوں کی بھی نہیں سنتے۔ بابو جی کو اپنی دولت پر گھمنڈ اور اچھا سے اچھا وکیل کیا ہے۔ گواہ بھی ذاتی رسوخ کی وجہ سے آنریری مجسٹریٹ اور ذی حیثیت اصحاب ہیں۔ سابق منصف صاحب بھی بغرض ادائے شہادت طلب ہوئے ہیں۔

ہر ایک گواہ مدعی نے مدعی کے دعوی کی تائید کی۔ کیونکہ جب دعوتیں اور محفلیں ہوئی تھیں تو یہ سب اسی آراضی پر ہوکر زنانی ڈیوڑھی کی جانب سے چھت پر گئے تھے۔ صدر دروازہ تو سڑک کی جانب تھا مگر عام طور سے آمدورفت اسی طرف سے ہوتی تھی۔ ۱۲ سال قبل سے مدعی نے اپنا قبضہ ثابت کردیا۔

مدعا علیہ کے پاس کوئی ثبوت سوائے اُس بڈھے خوبیانائی کے نہیں تھا۔ جس سے آپ نے یہ زمین خریدی تھی۔ اُس کا بیان تھا کہ یہ آراضی میں نے پنڈت جی کے ہاتھ فروخت کی تھی مگر بوجہ بیعنامہ وغیرہ کی عدم موجودگی کے اُسکے بیان کی کوئی وقعت نہ ہوئی۔ ایک بات البتہ مدعا علیہ کے حق میں تھی وہ یہ کہ اُسکی زنانی ڈیوڑھی کا بھی راستہ اسی آراضی پر ہو کر تھا منصف صاحب نے موقع کا معائنہ کیا اور اُنھوں نے نصف نصف آراضی ملکیت فریقین قرار دی۔

(۳)

پنڈت جی جب فیصلہ سُنکر گھر پہونچے تو پنڈتائن نے پنڈت جی کا اُترا ہوا چہرہ اور خشک ہونٹ دیکھکر کہا "مکدمہ ہار گئے تو کیا ہوا پرماتما کے یہاں تو ہمارا نیاؤ ہوگا"

پنڈت جی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ پرماتما کے یہاں جب نیاؤ ہوگا تب ہوگا اب تو چھوٹے سے گھر میں گذر ہونا کٹھن ہے۔ آدھی زمین میں کیا ہوگا۔

پنڈتائن "تو منصف صاحب نے بھی ہماری نہ سُنی۔ میں تو اُنکی بہو کے لئے گنگا جی کا پرشاد لے گئی تھی اور اُنھوں نے ہماری مدد کرنے کو بھی کہا تھا"

پنڈت جی۔ اری چپ بھی رہ۔ تو باؤلی اِن باتوں کو کیا جانے۔ یہ کچہری دربار کے معاملے ہیں۔ پالنا پڑے سو داؤ۔ اور حاکم کے سے سونیاؤ۔ جیسا اُنکی سمجھ میں آیا کیا"

پنڈتائن "تو پچھو کے باپ (خوبیانائی) کی بھی نہ مانی۔ تم نے تو اُسی سے زمین لی تھی"

پنڈت جی۔ اری اُس بیچارے نے تو سب کچھ کہا۔ جب دن اچھے ہوتے ہیں تو سبھی باتیں اچھی ہوتی ہیں۔ پھر ہمارے پاس کاغج واغج تو کچھ تھا ہی نہیں۔ اور اُنکی طرف سے بڑے بڑے گواہ تھے۔ ہماری کون سُنتا۔

پنڈتائن (پلّہ پسار کر) جیسی بابو نے ہمارے ساتھ کی ہے پرماتما کرے اُسکے بیٹے...

پنڈتائن اتنا ہی کہنے پائی تھیں کہ پنڈت جی نے اُنکے منھ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "اری تو کیا بکتی ہے۔ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے۔ تجھے خبر نہیں کہ اسی گھر کا نمک کھا کر میں اتنا بڑا ہوا ہوں۔ اور سچ تو یوں ہے کہ بابو جی کے لالہ ہی نے یہ زمین لیکر دی تھی۔ اب اُنکے

بیٹے کی خوشی نہیں دیتے نہ سہی اگلی عدالت سے دیکھ لیں گے۔ کوسنے دوسنے سے کیا فائدہ"

(۴)

خوب کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ گھاسی رام کے چھپر میں بیٹھے ہوئے کئی شخص آگ تاپ رہے تھے۔ انہیں میں ہمارے پنڈت جی بھی تھے۔ ہر ایک شخص پنڈت جی سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا کیونکہ کل ہی یہ ہائی کورٹ سے مقدمہ ہار کر آئے تھے۔

گھاسی رام "پنڈت جی صبر کرو۔ تم نے ناحق رار بڑھائی۔ بڑوں سے اٹک کر چھوٹوں ہی کا نکسان ہوتا ہے۔ تم نے اتنے (اتنے) روپیہ کھرچ (خرچ) کئے پھر بھی کچھ پھایدہ (فائدہ) نہوا۔ جی سے بھی ہارے اور ہائی کورٹ سے بھی۔

ملوا تیلی "اجی سیٹھ جی تم نے بھی بھلی کہی آجکل کی عدالتیں بھی کوئی عدالتیں ہیں سچا روے اور جھوٹا ہنسے"

خدا بخش "ہاں بھئی ملوا۔ کہتے تو سچ ہو۔ ایسا ہوتا تو یہ وکیل مختار اتنے مالدار کیوں ہوتے۔ جسے دیکھو جیبیں بھرے کچہری سے چلا آتا ہے۔ ہمارا تمھارا خون پیکر ہی تو یہ موٹے ہوتے ہیں"

پنڈت جی "یہاں جو جاہیں سو کرلیں پر بھگوان کے یہاں نیاؤ ہوتا ہے۔ دیر سے ہو یا اویر سے۔ کرنی کا پھل اوشیہ ملتا ہے"

ملوا "ملتا کیا پتھر ہے تمھارا معاملہ کتنا سچا تھا سب جھوٹا ہو گیا"

پنڈت جی "بابو جی کو اپنے کئے کا پھل ملگیا"

سب نے یک زبان ہو کر پوچھا "وہ کیا ہمنے تو کچھ بھی نہیں سنا"

پنڈت جی نے غرور سے سر اوپر اٹھا کر اور ادھر ادھر دیکھکر مگر دھیمی آواز سے کہا "کسی سے کہنا نہیں بہوجی کا گربھ بات (استقاط حمل) ہو گیا۔ بڑی دھوم دھام سے ست ماسہ پوجا تھا۔ اب رہ گئے اپنا سا منھ لیکر"

ملوا "تو اس سے تمھیں کیا ملا"

پنڈت جی "ہمیں بھی کبھی ملجائیگا اب تو انھیں کرنی کا پھل ملا ہے"

(۵)

آج کل بابو صاحب کے یہاں غیر معمولی چہل پہل ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ آپ کے یہاں آج ایک جلسہ ہے۔ ظاہرالسنت کی خوشی منائی جاتی ہے۔ مگر در پردہ مقدمہ جیتنے کا جلسہ ہے۔ دور، نزدیک کے سب رشتہ دار مدعو کئے گئے ہیں۔ شہر کے بھی بہت سے سربرآوردہ اصحاب تشریف فرما ہیں۔ بابو صاحب کے بڑے بھائی بابو گردپرشاد صاحب بھی حسن اتفاق سے آئے ہوئے ہیں۔ یہ زیادہ تر کبھی کبھی یا ہردوار رہتے ہیں اور بالکل تارک الدنیا ہیں آپ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں ٹھیکہ دار تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو اس سڑک پر جو کاس گنج سے ایٹہ کو جاتی ہے دو طرفہ پیڑوں کے درخت نصب کرنے کا ٹھیکہ دیا گیا۔ ٹھیکہ لیتے تو لے لیا مگر ضمیر کی آواز نے رنجیدہ کر دیا۔ بیوی سے جب بغیر ہو کر رنجیدگی کا سبب دریافت کیا تو کہا عجب کشمکش میں جان ہے۔ کوئی باغ لگاتا ہے۔ کوئی مندر بنواتا ہے۔ میں پیڑ لگواؤنگا عاقبت میں نہ معلوم میرا کیا حشر ہوگا ہمارے یہاں کیا ہے۔

کرنی کرے تو کیوں ڈرے ادھم کرے کیوں بچھتائے۔

پیڑ بوئے ببول کے تو آم کہاں سے کھائے۔

بیوی نے ہنسکر کہا تو یہ کون بڑی بات ہے۔ تم شوق سے آم اور جامن کے پیڑ لگوا دو۔ بلا سے نقصان ہوگا تو ہو جانے دو۔

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اُس زمانہ کے حاکم بھی کچھ نیک نیت اور شریف ہوا کرتے تھے جب اُسکو اصل حال معلوم ہوا چیف انجنیر سے خاص منظوری منگوا کر مزید بل دینا چاہا مگر آپ نے اقرارنامہ سے زیادہ روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔

اِس جلسہ میں پنڈت جی بھی موجود تھے یہ آپ ہی کی خاطر چلے آئے تھے۔ ورنہ جب سے مقدمہ بازی شروع ہوئی تھی آنا جانا قطعاً بند ہو گیا تھا۔

تمام مجمع میں خوشی چھا رہی تھی۔ اگر کوئی رنجیدہ تھا تو پنڈت جی۔

بابو صاحب نے غرور سے جھومکر کہا کہئے پنڈت جی آپ کا اب کیا ارادہ ہے۔ ہائیکورٹ سے بھی ہار گئے"

پنڈت جی نے آنکھیں نیچی کرکے کہا "تو کیا ہوا۔ ابھی ایک عدالت اور باقی ہے"

بابو صاحب نے قہقہہ مار کر کہا "اور عدالت۔ ناممکن۔ میں نے ہائی کورٹ کے وکیلوں سے دریافت کر لیا ہے۔ یہ مقدمہ بوجہ کم مالیت ہونے کے پریوی کونسل تک نہیں جا سکتا"

اب کی مرتبہ پنڈت جی نے ہنسکر کہا "بابو صاحب سرکاری عدالتوں سے بھی بڑھکر ایک عدالت اور ہے اور وہ دھرم اور انصاف کی عدالت ہے"

اتنی بات سنکر بابو صاحب کا چہرہ اُتر گیا۔ خوشی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چمکتے ہوئے آفتاب کو ابر نے ڈھک لیا۔

بھائی صاحب نے کہا "ہنومان! کیا دیکھتا ہے۔ سرکاری قانون کی تو قدر و حقیقت معلوم ہو گئی۔ اب دھرم اور انصاف کی عدالت میں پنڈت جی نے چارہ جوئی کی ہے۔ جو بات سچی ہے اُسکے ماننے میں تجھے اب کیا اعتراض ہے"

بابو صاحب نے آنکھیں نیچی کرکے کہا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر"

بھائی صاحب نے کہا "اچھا تو معہ خرچہ اپیل منظور۔ مدعی رسپانڈنٹ اپیلانٹ مدعا علیہ کو ایک ہزار تاوان ادا کرے اور اپنے قصور کی معافی مانگے"

عدالت عالیہ کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور ایک ہزار کا توڑا پنڈت جی کے گھر پہونچ گیا۔ پنڈتائین نے گود پھیلا کر دعا دی۔ جے جے کار کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگیں۔ اسیوقت بابو صاحب کے فرزند ارجمند تولد ہونے کی خبر فرحت اثر سنکر بھائی صاحب نے کہا۔

"تندکے آنند بھئے جے کنہیا لال کی"

شیام لال

مقالات ٹالسٹائی

کیا بائیں ہاتھ سے چند پیسے دیدینے کا نام جبکہ داہنے ہاتھ سے ہزاروں روپے جمع کئے جاتے ہوں خیرات ہے؟ اس سے بہتر یہ ہے کہ ہم اچھے کام کرنا شروع کر دیں، بُرے کام ترک کر دینا چاہئے۔

مترجمہ عالی لکھنوی

دین مہر

(۱)

شاہ احمد حسین کی شادی جس شان سے ہوئی قصبہ والے ابتک اُسکا گیت گاتے ہیں معمولی لوگوں کی بات کیا بڑے بڑوں کی زبان پر ہے کہ اس شان کی بارات کم دیکھنے میں آئی ہے جہاں اور باتوں میں افراط تفریط سے کام لیا گیا تھا دین مہر میں بھی فیاضی دکھلائی گئی تھی۔ قاضی صاحب نے پانچ لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت زبان سے نکالا تھا کہ منظور کر لیا گیا۔

چوتھی چالے کی رسمیں بھی طرفین سے جس پیمانے پر ہوئیں وہ بھی یادگار ہیں۔

شاہ احمد کریم (احمد حسین کے والد) کی حیثیت دیکھتے ہوئے لوگ اس دریادلی پر مختلف الآرا تھے سطحی نگاہ رکھنے والوں کی زبان پر اگر واہ تھی تو نظر تعمق سے دیکھنے والے لب خاموش سے آہ کے مصوّر تھے۔

پارسال شاہ احمد کریم کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ کا اثر شاہ احمد حسین پر بسقدر ہوا ہو تھوڑا تھا۔ اس سلسلہ میں جو سب سے بڑھکر ناخوشگوار بات ہوئی وہ اُنکی تعلیم سے علٰحدگی تھی۔ کیونکہ انٹرنس کے امتحان کو صرف دو مہینہ باقی تھے۔

ابھی تک شاہ احمد حسین خانہ داری کے انتظامات سے بیخبر تھے یک بیک گھر کا سارا جنجال سر پر پڑ گیا۔ اگرچہ ناتجربہ کاری پریشانیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے تاہم انھوں نے استقلال کے ساتھ ہر ایک کام کو سنبھالنا شروع کیا۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ اُنکو مہاجنوں کے تقاضے تھے۔ جائداد کا سالانہ منافع صرف چار ہزار تھا۔ جسمیں اُنکے والد مرحوم بمشکل گذر اوقات کرتے تھے۔ شاہ احمد حسین کے لئے پرانی آن بان قائم رکھتے ہوئے قرضوں کی ادائیگی جسکی تعداد دس لاکھ تھی ناممکن تھی مجبوراً انھیں اپنی موروثی فیاضی سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ اور ملازموں کی تعداد، سواری کے اخراجات۔ دسترخوان کی

وسعت اور انعام و اکرام میں حیرت انگیز کمی کرنی پڑی گو یہ کفایت شعاری کارزیں اصول تھا۔ مگر بے ترتیب برتا گیا۔

(۲)

شاہ احمد حسین کی بی بی زیادہ تر میکے میں رہا کرتی تھیں۔ سسر کے انتقال کی خبر سنکر سسرال آئیں۔ مگر وہی پرانی شان سے آگے پیچھے بیس بیس خادمہ۔ کوئی پاندان لئے ہے کوئی خاصدان۔ کوئی اگالدان۔ کوئی پائینچہ سنبھالے ہے تو کوئی دوپٹہ۔ یہ اد امکن ہے کہ احمد حسین کو کبھی اچھی معلوم ہوتی رہی ہو۔ مگر اب نہایت تکلیف دہ تھی۔ وہ بھی اپنی بی بی سے خوش نہ تھے کیونکہ وہ ایک بدشکل مغرور اور جاہل عورت تھی۔ میکے کی حالت گو بہت اچھی نہ تھی مگر پھر بھی سربرآوردہ لوگوں میں شمار تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مقدمہ بازی میں انکا خاندان یگانۂ روزگار تھا۔ جہاں کسی سے چشمک ہوئی ایک مقدمہ بنا کے داخل عدالت کر دیا۔ یہ ایسا ہتھیار تھا کہ چھوٹے بڑے سب کانپتے تھے۔

احمد حسین نے چاہا کہ اپنی بی بی کی لونڈیوں میں بھی کمی کر دے۔ مگر اسمیں خانہ جنگی کے آثار نظر آئے۔ اسنے اپنی بیوہ بھاوج اور ماں کی خادمہ کو نکال دیا۔ نیز باورچی خانہ کے پانچ ماماؤں کو بھی الگ کر دیا اپنی بھاوج اور ماں سے (جو تمام نشیب و فراز کو سمجھتی تھیں) یہ کہدیا کہ آپ لوگ انھیں ماماؤں سے کام لیجئے جو پائینچہ اٹھائے پھرتی ہیں۔ تجویز تو مناسب تھی۔ مگر جاہل بی بی کی جہالت کی وجہ سے الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔

ایک ہفتہ بھی یہ انتظام ٹھکانے سے نہ چل سکا۔ بی بی الگ چراغ پا۔ لونڈیاں الگ بے دل۔ ماں بہن نے الگ شکایتیں شروع کیں۔

ایک روز اسکی بہن جبکہ وہ کھانا کھاتا تھا۔ یوں کہنے لگی۔

بہن۔ بھیّا! آج بھابھی نے "شنتو" (ملازمہ کا نام) سے کام لینے پر ہم لوگوں کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وہ کہتی ہیں کہ یہ میرے میکہ کی لونڈیاں ہیں ان سے کوئی کام لینے والا کون ہوتا ہے تم لوگوں پر پیغمبری وقت اترا ہے اترے میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اگر میری لونڈیوں سے کچھ کام لیا گیا تو خیر نہیں ہوگی۔

احمد حسین (بہن کی طرف دیکھ کر) تم کہو تو انکو انکے میکے پہونچا دوں۔
"میکے ہی میں رہتے رہتے تو دماغ بگڑ گیا"
"تو پھر کیا کیا جاوے"
"انکو سمجھانے کی کوشش کیجیے ممکن ہے کہ آپ کے کہنے کا اثر پڑے"
"میں کہونگا تو ضرور۔ مگر انکی اصلاح میری دانست میں ناممکن ہے"
بہن کھلا کر چل گئی۔ اور قیلولہ کے لئے احمد حسین سونے کے کمرے میں چلے گئے۔ بی بی بھی غصہ سے بھری ہوئی پاس بیٹھ گئی۔ یہ رنگ دیکھتے ہی احمد حسین سمجھ گیا کہ آج رنگ بگڑا ہوا ہے خدا خیر کرے۔ دل ہی دل میں اُسے راضی کرنے اور اُسکی ناخوشگوار باتوں کو تحمل سے سُننے کا اہتمام کرنے لگے۔ مگر جو لفظ پہلے بہل بی بی کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا
"مجھے میکے پہونچا دیجیے مجھ سے یہاں نہیں رہا جائیگا"
احمد حسین۔ خیریت تو ہے کیا تکلیف ہوئی۔
بی بی۔ مجھ سے ایسی تکلیف برداشت نہیں ہوسکتی۔ آپ نے کل لونڈیوں کو نکال دیا۔ میری باتوں سے سیدھے کام لئے جاتے ہیں۔ آپ نے تو بی بخالت کو راہ دیا ہے کہ سبکی انتہا نہیں۔ یہ کتنی بیغیرتی ہے کہ میرے میکے کی لونڈیاں چولہا پھونکیں۔
احمد حسین۔ یہ تو کوئی بُری بات نہیں مجھے دیکھو اپنا کام خود کر لیا کرتا ہوں۔ پیغمبروں اور ولیوں کی بیبیاں (جو ہم لوگوں کی سردار ہیں۔ جنکے نقش قدم پر چلنا فلاح دارین ہے) کل کام اپنے ہاتھوں سے کیا کرتی تھیں۔ ہم لوگوں میں کون سے سُرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔ گھر کی حالت دیکھتی ہو قرضہ سے تمام جائداد زیر زوال ہے۔ کیا اخراجات میں کمی کرنا اور قرضہ ادا کرنے کی صورت پیدا کرنا ایک عقلمند کا فرض نہیں ہے۔ احمد حسین اسی سلسلہ میں اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر بی بی نے بات کاٹکر کہا۔
"میں یہ سب دُکھڑا سُننا نہیں چاہتی۔ میں تو سمجھتی ہی ہوں کہ والدین نے مجھے بھاڑ میں جھونک دیا۔ میں ہرگز یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ آپ مجھے کل ہی روانہ کر دیجیے۔ خدا کے فضل و کرم سے میں یہاں سے وہاں اچھی رہوں گی۔
احمد حسین۔ جانے نہ جانے کے متعلق میں سوچ کر جواب دونگا۔ مگر خیال تو کرو میکے میں کب تک رہوگی۔

بی بی۔ اگر ماں باپ لائق ہیں تو ہمیشہ کے لئے۔ اور اگر نالائق ہیں تو میں ایسی سسرال کی تکلیف سے میکے کی بھیک پسند کرتی ہوں۔

احمد حسین۔ تم تو غصہ میں بھری ہو۔ میں کیا کہوں جو تم مناسب سمجھو کرو۔ مگر یاد رکھنا تمہاری وجہ سے میں تباہ ہوتا ہوں۔ یہ اچھا نہیں۔

بی بی۔ (اُٹھ کر) لیجئے میری وجہ سے تباہی ہے تو میں جاتی ہوں۔

(۳)

احمد حسین آدمی ہی تھا۔ بی بی کی اس نامعقول حرکت اور بے وجہ خفگی سے اُسکا دل غصہ سے کانپ اُٹھا۔ مگر کیا کرتا۔ کبھی دل میں آتا کہ اسکو اسکے میکے روانہ کردوں۔ پھر یہ خیال ہوتا کہ سسرال والے ایک ہی شہر میں ہیں۔ بی بی نالائق ہے۔ یہ تین میں نہ تیرہ جوڑے گی۔ ملازمین کی تعداد بڑھانا نہیں چاہتا۔ اسکا خیال تھا کہ رفتہ رفتہ بی بی کے اخراجات میں کمی کرلیگا مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ کبھی کبھی اُسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق دیدوں۔ مگر مہر کی رقم بھی کثیر ہی سسرال والے کب چین سے بیٹھنے دیں گے۔ انھیں خیالات میں غلطاں پیچاں باہر نکل آیا۔

اسکو اسپر بھی افسوس ہے کہ پانچ لاکھ مہر میں نے قبول کیوں کرلیا۔ پھر دل ہی میں جواب ملتا ہے کہ والد مرحوم کے ایما سے منظور کیا تھا۔ اُنکو یہ باتیں کب معلوم تھیں۔ افسوس شریف مسلمانوں میں یہ کتنا بڑا رواج پڑگیا ہے کہ مہر اتنا زیادہ بڑھا دیتے ہیں جسکی ادائگی کسی صورت سے ممکن نہیں ہوتی۔ افسوس وہ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ یہ طریقہ زن وشو کے تعلقات کے لئے کسقدر مضر ہے۔ بی بی بدمزاج ہوئی تو شوہر کو اپنا زرخرید غلام سمجھتی ہے۔ اور شوہر بی بی کو ایسا عذاب سمجھتا ہے جس سے جیتے جی چھٹکارا ممکن نہیں۔ کلو خلاصی کی صرف ایک صورت طلاق ہے۔ مگر مہر کا خیال ایک خوفناک اژدہے کی طرح ہر وقت اُسکا محافظ ہے۔ مرد نے دوسری شادی کرلی تو اور بھی آفت برپا ہوئی۔ کڑوا کریلا نیم چڑھا۔ بی بی کی بدمزاجی اور بڑھ گئی۔ جوتیوں میں دال بٹنے لگی تھکا فضیحتا کی نوبت پہونچی۔ ذرا بات اور بڑھی تو دین مہر کا قصہ پیش ہوگیا۔

لیکن اگر شوہر کی ذاتی حیثیت دیکھکر اور مہر کی ادائگی مدنظر رکھکر مہر مقرر کیا جائے تو یہ ناخوشگوار واقعات ظہور میں نہ آئیں۔

احمد حسین انھیں خیالات میں غلطاں پیچاں تھا کہ ایک چپراسی کے آنے سے سارے خیالات جو بادل کی طرح اُمنڈے چلے آتے تھے چپراسی کی شفق گوں پگڑی سے ٹکر کھا کھا کر پھٹ گئے اور مطلع صاف ہوگیا۔

چپراسی۔ حضور ایک سمن ہے۔

احمد حسین۔ کس کا۔

چپراسی۔ لکھرام ساہو کا۔ (کہتا ہوا سمن احمد حسین کے ہاتھ میں دیدیتا ہے)

احمد حسین نے دیکھا ساڑھے پانچ ہزار کا دعویٰ ہے سر پکڑ لیا۔ چپراسی کو ایک روپیہ دیکر کہا کہ اسکو عدم تعمیل واپس کردو۔ چپراسی نے بھی اپنی مٹھی گرم کی اور چلتا ہوا۔

۴

آج سویرے ہی سویرے احمد حسین اپنے کارندوں کے ساتھ کچھ حساب کتاب دیکھ رہے ہیں کچھ باتیں ہوتی جاتی ہیں مگر اسی حساب کتاب کے متعلق مواضعات کی آمدنی اور رقبے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک کارندہ نے کہا حضور رام پور سے چھوٹا کوئی موضع نہیں ہے۔ اسکی آمدنی سالانہ ۱۱ ہزار ہے۔ اگر اسی کو لکھرام ساہ لے لیں تو مناسب ہے۔ احمد حسین نے کہا سوا اِسکے چارہ کار کیا ہے۔ مگر ابھی تک آئے نہیں۔ میں نے بُلا بھیجا تھا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ لکھرام ساہ معہ اپنے منیب کے ہاتھی پر سوار دروازہ پر آگئے۔ احمد حسین نے اُٹھ کر اُنکو فرش پر اپنے ساتھ بٹھال لیا اور صاحب سلامت کے بعد یوں گفتگو شروع ہوئی۔

احمد حسین۔ منیب جی دیکھئے کسقدر رقم واجب الادا ہے۔

منیب۔ چار ہزار زر اصل اور ڈیڑھ ہزار سود کی رقم ہے۔

احمد حسین۔ کہئے ساہ جی اسمیں کسقدر رعایت ہوسکتی ہے۔

لکھرام ساہو۔ اسمیں کیا رعایت کرائے ہو۔ تمھارے والد مرحوم نے جسوقت تمھاری شادی میں قرضہ لیا اُسی وقت سود کی رقم اتنی کم کرادی جتنی میں نے کسی کے ساتھ نہیں کی تھی۔

احمد حسین۔ آپ کی مہربانی بھی میری حالت اسوقت جیسی ہو رہی ہے میں کیا عرض کروں۔ بس اب آپ سے کیا چھپا ہے۔ اگر آپ لوگوں نے نہیں سنبھالا تو میں تباہ ہو جاؤنگا۔

لکھرام ساہ - تو پھر تمہیں کہو کیا چھوڑ دوں -
احمد حسین - مجھ سے کیا کہلاتے ہو - میں تو کہونگا کہ سود کی رقم چھوڑ دیجئے -
لکھرام ساہ - لڑکے کہیں ایسا بھی ہوا ہے - ایسی بات کہو کہ میں مان بھی لوں -
احمد حسین - اچھا پانچ سو روپیہ چھوڑ دیجئے اسمیں تو آپ کو غالباً عذر نہوگا -
لکھرام ساہ - عذر کو تو نہ کہو مگر تمھاری خوشی مجھے منظور ہے -
احمد حسین - میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے کوئی موضع بیع کرنا چاہتا ہوں آپ رامپور لکھوا بھیجئے -
لکھرام ساہ نے چند باتیں دریافت کرکے رضامندی ظاہر کی اور رجسٹری کے لئے ایک تاریخ تعین ہوگئی اور خوش خوش لکھرام ساہ واپس گئے -

رجسٹری کے لئے ایک ہفتہ کا دن ملا - احمد حسین نے کل ماجرا اندر آکر والدہ سے کہا انھوں نے بھی منظور کرلیا - کھانے کے بعد احمد حسین باہر آئے - عصر کی نماز پڑھکر ٹہل رہے تھے کہ دیکھا میاں احمد سعید صاحب گھوڑے پر سوار اور چالیس کہار معہ محافہ پالکی دروازہ پر موجود - احمد حسین بھوچکا سا ہوگیا - انکی تشریف آوری کی وجہ اسکی سمجھ میں نہ آئی - صاحب سلامت کے بعد احمد سعید نے رخصتی کی بات چیت شروع کی - احمد حسین سمجھ گیا کہ ہو نہو یہ بی بی کی نازل کی ہوئی بلا ہے ضرور اسنے یہ تحریک کی ہے - پھر کیا کیا جاوے ؟ اگر روکتا ہوں تو یہ مانیگا نہیں اسلئے زیادہ طوالت سے یہی مناسب ہے کہ رخصت کردیا جاوے - چنانچہ تھوڑے سے انکار کے بعد رخصت کرنا منظور کرلیا اور سویرے ہی رخصت بھی کردیا -

احمد حسین نے رجسٹری سے فراغت پاکر کل مہاجنوں کو بلاکر اُنسے معاملہ صاف کرلینا مناسب سمجھا اور ایک مہینہ کے اندر اندر کل قرض کا جھنجھٹ کچھ رہن کچھ بیع کی صورت میں صاف کردیا -

بی بی نے میکے پہونچکر اپنی جا و بیجا تکالیف کی داستانیں شروع کیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے شوہر کے متعلق کہا کہ اُنکی آوارگی کی وجہ سے تمام جائدادیں بکتی جارہی ہیں -

احمد حسین کے سسر اور سالوں کو جب یہ خبر پہونچی تو دریافت کرایا کہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے انکی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ درحقیقت جائداد رہن اور بیع ہو رہی ہے - لڑکی کی تکلیف سُنکر ایک غم اور غصہ کا خوش پیدا ہوا اور ۵ لاکھ دین مہر کا دعوی عدالت میں دائر کردیا -

احمد حسین خوش تھا کہ اب کسی طرح گذر اوقات ہو جائیگی۔ مگر دوسرے ہی ہفتہ پھر چیراسی کو دیکھکر ان ہی غل مچ گئی دیکھا تو ۵ لاکھ کا دعویٰ۔ اب اسکے رنج کی انتہا نہ تھی۔ سمن ہاتھ میں لیا اور تحظ کرکے واپس کردیا۔ مارے رنج و غم کے کمرے میں آکر گر پڑا۔ ابھی وہی غم تازہ تھے جو مہاجنوں کی نازیزاری درجائداد کے نکلنے سے دلپر لگے تھے۔ یہ سمن بروئے اجل بنکر ایسا آیا کہ کوئی صورت بچنے کی نظر پڑی۔ سب کی خوشامد وہ برداشت کرسکتا تھا مگر بی بی کی خوشامد سسرال کے آگے سرنگونی قابل برداشت تھی اسکا دل درد سے بھر آیا ہوش وحواس نے ساتھ چھوڑا۔ میز پر پڑے ہوئے کاغذ پر اسنے یہ جملہ لکھا "دین مہر یا خدا کا قہر" اور رائفل کا منہ سینے پر رکھکر گھوڑا گرادیا اور اسطرح پھڑکتے ہوئے دل کو ہمیشہ کے لئے ساکن کردیا۔

بندوق کی آواز نے دعویٰ مہر کی جوابدہی کی۔ گھر کی تمام عورتیں محلہ کے تمام آدمی دوڑکر رے میں پہونچ گئے مگر یہاں کیا تھا۔ ایک تڑپتا ہوا لاش اور پہلو سے لگی ہوئی کارتوسی بندوق۔

منظور الحق تلمیم اعظم گڈھی

جذباتِ اثر

جو تمہاری آرزو کرنے لگے — آپ اپنی جستجو کرنے لگے
بول بالا ساقیٔ گلفام کا — پھول مجھ سے گفتگو کرنے لگے
جامۂ تقویٰ میں تھے کچھ داغ مے — شیخ صاحب شست و شو کرنے لگے
جوشِ گریہ میں کمی منظور تھی — شامل اشکوں میں لہو کرنے لگے
اُسکی قدرت اُسکی حکمت کے نثار — بت سُنا ہو گفتگو کرنے لگے
جسکے ذمہ تھا فریضہ عشق کا — خون سے اپنے وضو کرنے لگے
میری مستی رستخیز انداز تھی — الاماں جام و سبو کرنے لگے

اِسقدر اُنکی پرستش کی اثرؔ
بت ہماری آرزو کرنے لگے

اثر لکھنوی

تنقید کتب

ارمغان کلام

سرزمین اعظم گڈھ کی مردم خیزی میں کسکو کلام ہوسکتا ہے۔ اگلے وقتوں میں اعظم گڈھ (اور مضافات اعظم گڈھ) علماء و فضلاء کا مرکز رہ چکا ہے، اور اب بھی وہاں ایسی باوقار اور ذیشان ہستیاں موجود ہیں جنپر دنیائے علم و ادب بجا طور سے فخر کرسکتی ہے۔

ترقی زبان کے لحاظ سے بھی اس سرزمین کا درجہ کچھ کم نہیں، دارالمصنفین اعظم گڈھ میں مستقل طور پر تصنیف و تالیف کا کام ہو رہا ہے۔ ترقی اردو کی انجمنیں بھی قائم ہیں پچھلے سال میں بزم ادب اعظم گڈھ نے، داغ جگر، شائع کرکے اپنی سعی عمل کا ثبوت دیا تھا، اب انجمن بزم ادب جے راج پور نے اپنا کارنامہ ارمغان کلام کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ارمغان کلام مجموعہ ہے جناب کلام کے کلام کا۔ اسکی تقطیع وغیرہ بالکل داغ جگر کیطرح ہے۔ شروع میں ایک مختصر سا دیباچہ ہے، جسکی بنیاد تاریخ پر اور انجام، مبارکباد اور امید پر ہے قوم کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ بزم ادب کا پرجوش خیر مقدم کرے، اسکے بعد گذارش کے عنوان سے حضرت نسیم نے جناب کلام کے کلام اور بزم ادب جے راج پور کے اس کارنامے پر خوشی کا اظہار کیا ہے، آپ فرماتے ہیں، کہ اسکا مقصد صرف لائٹ لٹریچر کی نشو و نما ہے لیکن جب ہم بسم اللہ کے بعد حضرت کلام کے کلام کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تو الف سے لیکر یے تک ہمیں اکثر و بیشتر فرسودہ اور پامال خیالات ہی نظر آتے ہیں، نسیم صاحب فرماتے ہیں، شروع شروع میں کچھ غزلیں اور قصائد ضرور پھیکے نظر آئینگے کیونکہ وہ بالکل آغاز شاعری کے نقوش ہیں لیکن جوں جوں وہ منزل طے کرتے جائینگے گلشیر زار نظر آئیگا،

لیکن ہمیں اپنی کوتاہ نظری پر افسوس ہے کہ جس گلشیر زار کی امید دلائی گئی تھی اسکی سیر سے ہماری تماشا پسند آنکھیں محروم رہگئیں۔

ہم مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے ہم آہنگ ہیں کہ حضرت کلام کا کلام طفلی دیکھکر ہم کو اُنسے بہت کچھ اُمید ہے۔ انشاء اللہ وہ آیندہ آسمانِ شاعری پر آفتاب بنکر چمکینگے، لیکن افسوس ہے کہ ارمغانِ کلام کو ہم بزم ادب کا زرّیں کارنامہ نہیں کہہ سکتے۔ درحقیقت جناب کلام کا دیوان طفلانہ نغمہ سنجیوں کا مجموعہ ہے اور اس حیثیت سے یادگارِ طفلی بھی ہے۔ اسکا فائدہ موصوف کی ذات سے وابستہ ہے، مگر وہ کسی حیثیت سے بھی دنیاءِ ادب کے لئے مفید نہیں ہوسکتا۔ ارمغانِ کلام میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جنھیں لائٹ لٹریچر کہہ سکتے ہیں لیکن اُنکی تعداد کم ہے، مثلاً۔

رہ نہ جائے کہیں عاشق کی تمنا دل میں — شرم کا پاس کریں وہ مگر اتنا نہ کریں

اب نہیں دلیں کسی کے آرزوئے حسن و عشق — سب کو عبرت ہوگئی میری مصیبت دیکھکر

اِسے بھی تابِ سخن تھی نہ رو برو اُنکے — پیام بر بھی نہ کچھ کہہ سکا سلام کے بعد

گرے بیہوش ہوکر ہر قدم پر صورتِ مہ نو — تری محفل میں ہم آئے کہ بزمِ طور میں آئے

شکر صد شکر کہ ممنونِ مسیحا نہ ہوا — تیرا بیمار بُرا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا

اِس قسم کے اور اشعار بھی ہیں، جو کسی نہ کسی لحاظ سے قابلِ داد ہیں، مگر بزم ادب کا فرض تھا کہ اُن اشعار کو انتخاب سے خارج کردیتی جنکا شمار کسی طرح بھی لائٹ لٹریچر میں نہیں ہوسکتا، اور جو مذاقِ سلیم کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ مثلاً

اُس جانِ جاں کو گھر پہ بلایا کسی طرح — نکلی ہماری دل کی تمنا کسی طرح
بوس و کنار میں نہ رہیں کچھ رکاوٹیں — شرم و حیا کو گھر سے نکالا کسی طرح

مدت کے بعد مجھکو ہوئی ہے یہ شب نصیب — بوسوں کا کر نہ اے بتِ پُرفن شمار آج

چودھواں لگتے نہی وہ آئینہ رو حسن میں اِک مہ تمام ہوا

اِسکو یوں لکھ سکتے تھے۔ چودھویں سال میں وہ آئینہ رو۔

کیا اِس قسم کے اشعار کو بزمِ ادب کی تہذیب گوارا کر سکتی ہے جنکا سُننا بھی سماعت کے لئے نغمۂ ناگوار سے کم نہیں، معشوق کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے وہ حضرت نظیر اکبر آبادی کے کلیات میں ہوتی تو مضائقہ نہ تھا، مگر بزمِ ادب کے اس کارنامہ میں اسکا پیوند بے جوڑ ہے۔

معشوق کا یہ کہنا، فرخندہ پے خجستہ قدم خوش عنان ہوں میں" خدا جانے کب کی بات ہے اور پھر یہ فرمانا "میری ہنسی گراتی ہے سینوں پہ بجلیاں"

دلوں پر بجلیاں گرتی ہیں یا سینوں پر۔

اِسکے علاوہ زبان و محاورہ کی غلطیاں بھی اکثر نظر آتی ہیں۔ مثلاً

کسی کا آگرہ میری بالیں پہ صبح سے شام تک مچلنا حسد سے جل جل کے رات بھر وہ رقیب کا دل کباب ہونا

معلوم نہیں اس موقع پر مچلنا، کہاں کا محاورہ ہے۔

بعض بعض ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جنھیں شاید توارد کہہ سکتے ہوں، مثلاً

نقشِ قدم کے سجدے کا اتنا تھا اشتیاق میں جب گیا گلی میں تری سر کے بل گیا

حضرت مومن فرماتے ہیں،

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

حضرت کلام نے ایک باریک سا پردہ چھوڑ رکھا ہے، مگر ہیں حقیقت میں دونوں ایک ہی چیز

لاغر تھا اسقدر کہ نہ آیا نظر اُسے ناکام ڈھونڈھکر مجھے پیکِ اجل گیا

حضرت داغ فرماتے ہیں۔

موت بھی سو بار آئی اور الٹی پھر گئی شکل پہچانی نہیں جاتی ترے بیمار کی

اسی غزل کا یہ شعر بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

آخر رہا نہ اُٹھتے ہی جوبن کے پھر کوئی آنچل سرک گیا تو دوپٹہ بھی ڈھل گیا

جوبن پر نظر نہ کیجئے، دوپٹہ کا ڈھل جانا ملاحظہ کیجئے، اور پھر آنچل اور دوپٹہ کے فرق پر غور کیجئے۔

بہرحال ہم ارمغانِ کلام کی اشاعت پر کارکنانِ بزمِ ادب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آیندہ بھی اُنکی کوششیں دنیائے ادب میں مشکور رہیگی۔
حجم ۲۰۰ صفحہ، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت دیدہ زیب، قیمت دس آنہ (۱۰ر)
شائقین ادب اس پتہ پر درخواست خریداری ارسال فرمائیں۔ اخلاق احمد صاحب نسیم جاج ہائی اسکول اعظم گڈھ

کلامِ محروم

منشی تلوک چند صاحب محروم دنیائے ادب کی اُن نمایاں ہستیوں میں ہیں، جو اپنے کمالات کی وجہ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں، اکثر ادبی رسالوں میں آپ کی قومی، تاریخی، ملکی، نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں، مناظرِ قدرت کی عکاسی، اور جذباتِ فطرت کی مصوری میں آپ کو یدطولیٰ حاصل ہے۔ آپ کی تاریخی، قومی، ملکی نظموں کا مجموعہ کلامِ محروم کے نام سے شایع ہوا ہے، جسمیں آپ کی وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو اب تک ہندوستان کے ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوچکی ہیں۔

آپ کے بیان میں دلکشی اور دل کشی میں ایک خاص اثر ہے۔ قومیت کا اثر آپ کے قلب پر اس درجہ غالب ہے کہ اکثر اشعار اسی رنگ میں ڈوب کر نکلتے ہیں، عاشقانہ غزلوں میں بھی بعض بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے قومی رنگ جھلکتا ہے، اکثر نظمیں ایسی ہیں جو قطعی غیر فانی ہیں۔ اور آپ کی شاعری کے لئے بھی سرمایۂ ناز ہیں،

"شعاعِ امید" کے عنوان سے جو اشعار "کلامِ محروم" حصۂ دوم میں درج ہیں وہ اس خوبی سے نظم ہوئے ہیں کہ چشمِ بصیرت میں شعاعِ امید کی چمک پیدا ہوجاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

جلوۂ صبحِ یقینی ہے شبِ تار کے بعد — دورِ اقبال ہے ہر قوم کو ادبار کے بعد
قافلے والے اس امید پہ ہیں گرمِ سفر — منزلِ عیش ہی قطعِ رہِ پرخار کے بعد
قابلِ رحم تو ہو جائے دلِ عمدیدہ — نگہِ لطف بھی ہوگی ستمِ یار کے بعد

تیسرا شعر خاص طور پر قابلِ داد ہے۔ حضرتِ محروم اپنے اشعار میں مضامین کی ندرت کیساتھ بندش کی چستی کا بھی بہت کچھ خیال رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپ کی نظمیں اکثر و بیشتر پُراثر ہوتی ہیں۔

اگرچہ آپ دہلی اور لکھنؤ دونوں مقاموں سے بہت دُور ہیں، لیکن زبان اسقدر شستہ ہے کہ بعض وقت یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ جناب محروم پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں آپ کے شعروں میں ایسے محاورے اور بندشیں بھی نظر آجاتی ہیں جو خصوصیات پنجاب میں شامل ہیں۔ مثلاً کلام محروم حصۂ دوم کے صفحہ ۴، پر یہ مصرعہ نظر آتا ہے۔

تا غیر آہ سینے سے تجھکو آزمانا

میں نے آزمانا ہے، یہ خاص پنجاب کا محاورہ ہے، تعجب ہے کہ جناب محروم بھی ایسی غلطی سے بچ نہ سکے۔ اسی حصۂ کے صفحہ ۵، پر بدنصیب گائے کے عنوان سے جو نظم ہے وہ مجموعی حیثیت سے بہتر نظم ہے، مگر بعض الفاظ کچھ ایسے غیر مانوس طریقہ پر استعمال کئے گئے ہیں جنھیں دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ نظم کا پہلا بند یہ ہے۔

دنیا میں رہ کے مینے صدمے جو میں اُٹھائے — میں تجھکو گر سناؤں تو سُنکے سہم جائے
دریائے شیر کل تک جس گھر میں ہیں بہائے — اب خوں بہیگا میرا اُس گھر میں ہائے ہائے
ہوگا ثواب اعظم گر تو مجھے بچائے
او جانیوالے میں ہوں اک بدنصیب گائے

"ہائے اور "گائے" کو اشباعی حالت میں کھینچ کے پڑھنا ہرگز جائز نہیں، نہ معلوم محروم صاحب نے اسے کیوں جائز سمجھ لیا ہے، دوسرے بند میں مکرر فرماتے ہیں۔

میں بدنصیب گائے اِس گھر میں جب سے آئی
سختی پہ تازہ سختی ہر روز اک اُٹھائی

اسمیں بھی گائے، اشباعی حالت میں موجود ہے۔

بعض بعض تلمیحیں بجائے خود کچھ ایسی مضحکہ انگیز ہوتی ہیں، اور کبھی کبھی موقع و محل کے لحاظ سے ایسی مضحک بنجاتی ہیں کہ پڑھنے والوں کو بیساختہ ہنسی آتی ہے، شعرائے باکمال اِس قسم کی تلمیحات و تشبیہات سے گریز کرتے ہیں۔ کلام محروم حصۂ ۳ صفحہ ۸۵ پر یہ شعر درج ہے۔

چونک بھی اب خواب ہستی سے کہ ہے وقت رحیل
بیخبر سوتا ہے کیوں انساں ہے یا خرگوش ہے

غور فرمایئے اس شعر میں اگرچہ خرگوش کی تلمیح موقع کے لحاظ سے بہت خوب ہے۔ مگر مذاقِ سلیم کو اتنا گدگداتی ہے کہ ہنسی نہیں رُکتی۔

باایں ہمہ کلام محرّوم کا مطالعہ بہرصورت مفید اور سبق آموز ہے۔ عمدہ اور دلکش نظمیں، پاکیزہ غزلیں قابلِ دید ہیں۔ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت حصہ اول ۴ہ، حصہ دوم ۳ہ تیسرے حصہ کی قیمت ٹائیٹل پر تحریر نہیں۔ ملنے کا پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز پبلشرز تاجران کتب لاہور ہاری گیٹ

بجلی کے کرشمے

اس کارآمد کتاب کے مؤلف محمد معشوق علی خانصاحب بی۔ اے علیگ ہیں۔ اور یہ نظامی پریس بدایوں میں چھپکر انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (حیدرآباد دکن) سے شائع ہوئی ہے اسمیں برقی قوت کے متعلق گزشتہ وموجودہ تجربات نہایت شرح وبسط سے جمع کئے گئے ہیں، اور ہر تجربہ کے متعلق باقاعدہ تصویر دی گئی ہے، تاکہ شائقین خود تجربہ کرسکیں۔

عبارت سلیس، عام فہم، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ قیمت فی جلد مجلد ۱ہ۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد۔ حیدرآباد دکن۔

چار چاند

یہ ۴۸ صفحے کا ایک مختصر سا رسالہ ہے، جو چھوٹی تقطیع پر انڈین بک ڈپو اندرکوٹ شہر میرٹھ سے شائع ہوا ہے، حامد اللہ صاحب افسر بی اے۔ نے اس چھوٹی سی کتاب میں بچوں کے لئے چار دلکش اور سبق آموز کہانیاں لکھی ہیں۔ جنھیں پڑھکر بچے علاوہ خوش ہونے کے عمدہ عمدہ نصیحتیں بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

عبارت سادہ اور مختصر، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت نظر فریب، قیمت ۵ر مذکورہ بالا پتہ سے طلب فرمایئے۔

اعظمی

مشاہیر نظم اردو

یہ نظم ناظم ہردی کی مشہور ابیات مندرجۂ ذیل کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے۔ اتنا اضافہ میں نے اور کیا ہے کہ مشاہیر سلف کے علاوہ مختلف اصناف شاعری کے بخیال عصر سخن طرازوں اور دور موجودہ کے نامور شعراء کے تخلص بھی نظم کر دیئے ہیں۔ اس مختصر سی نظم میں کم و بیش ایک سو بارہ تخلص نظم کئے گئے ہیں۔ تقدیم و تاخیر سے مراد کسی کو ترجیح و تفوق دینے سے ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اسے قیود نظم پر محمول فرمایا جائے۔ نہ نسبتہً کسی نامور شاعر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اگر کوئی تخلص سہواً رہ گیا ہو تو مطلع کئے جانے پر شامل نظم کر دیا جائیگا۔ برق

ابیات فارسی

شنیدم کہ در روزگار کہن — شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو ادرنگ از عنصری شد تہی — بہ فردوسی آمد کلاہ مہی
چو فردوسی آورد سر در کفن — بہ خاقانی آمد بساط سخن
جو خاقانی از دار فانی گذشت — نظامی بملک سخن شاہ گشت
نظامی چو جام اجل در کشید — سر چتر دانش بہ سعدی رسید
جو ادرنگ سعدی فرو شد ز کار — سخن گشت بر فرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بجامی رسید — ز جامی سخن بر نظامی رسید
ز جامی بعرفی و طالب رسید — ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

آخری شعر کا اضافہ مرزا غالب نے اپنے قلم سے فرمایا ہے۔

ناظم ہردی کے ابتدائی سات شعر ہیں۔

نظم اردو

ولی سے ہوئی ابتدائے سخن — کہ مشہور ہے وہ خدائے سخن
ولی نے جو لی راہِ باغِ جناں — ہوا میر و سودا کا سکہ رواں
پھر انشا و جرأت ہوئے نامور — رہا انکے تاجِ سخن زیبِ سر
بندھی ناسخ - آتش کی پھر وہ ہوا — کہ دونوں کا عالم میں شہرہ ہوا
زمانے نے لی ایک کروٹ جو اور — ہوا غالب و ذوق و مومن کا دور
جا بعد ازاں رنگِ داغ و امیر — یہ دونوں ہوئے مہر و ماہ منیر

پسِ داغ چمکا نہ رنگِ سخن
ہوا برق ایسا نہ یکتائے فن

سخندان کامل نسیم و حسن — فنِ مثنوی میں تھے یکتائے فن

ہوئے مرثیہ گوئی میں بے نظیر — ضمیر و خلیق و انیس و دبیر
نفیس اور مونس کا چمکا کلام — رشید اور جاوید نے پایا نام

ڈراما نویسی میں مشہور عام — ہوا حشر و بیتاب و احسن کا نام

تغزل کے اب رنگ میں بے عدیل — ہیں شاعر - ریاض اور بیخود جلیل
زبانوں پہ ہے باغ و سائل کا نام — صفی - نوح - شیدا و مائل کا نام
شفق - بزم و منظر ہیں نازک خیال — جگر - عنوث و ثاقب ہیں شیریں مقال
عزیز احسن و یاس ہیں ترزباں — قمر شمس و رونق ہیں شیوا بیاں
سخنور ہیں اطہر - دلیر و رفیق — نسیم و تشرف - شاد - ندرت شفیق

زلالی و بیباک مفتوں - ابر
عطا - ہادی و کیف و سیماب و صبر
شہیر - آرزو - حسرت و نظم و جوش
مبیں برتر و شوق و آزاد و ہوش
دبیر افسر و مہر و تاباں فگار
صمیم - اصغر و محو و وحشت - بہار
وجاہت - اثر - محشر و شوخ و ناز
یہ قید تعارف سے ہیں بے نیاز

تصوف میں مہر اور ساحر ہیں فرد
رہ معرفت کے ہیں یہ ہم نورد

جو ہے آجکل برمحل شاعری
جسے کہتے ہیں نیچرل شاعری
بنا اسکی ڈالی تھی آزاد نے
جلا دی تھی حالی سے استاد نے
سرور اور اکبر نے دی داد نظم
یہ تھے رنگ میں اپنے استادِ نظم
اب اقبال و چکبست ہیں نامدار
نظر اور محروم ہیں سحر کار
فدا و فا فرخ و تاج ور
رواں - سحر - ارمان ہیں نامور
فلک بیدل و کیفی خوش کلام
نیاز اور سالک ہیں مشہور عام

اب اِنسے ہے تازہ دماغِ سخن
یہ ہیں برق گلچین باغِ سخن

حسن فطرت

بادشہ کو بھی میسر اپنے قلعہ میں نہیں
جیسی عافیت کہ حاصل مجھکو اپنے گھر میں ہے
اُسکی نظریں ہیں تصنع اور نمایش میں مخفیں
سادگی کا لطف لیکن سیر ہر منظر میں ہے

اُسکے پائیں باغ میں ایسا نہیں رنگِ بہار
جو مجھے قدرت نے دے رکھا ہی سبزہ زار میں
ہے خرامِ ناز بھی اُسکو روش پر ناگوار
میں مگر رہتا ہوں سیرِ وادی و کوہسار میں

ارشد تھانوی

شاعر کا دل

نہ کیوں شاعر کا دل ہم مرتبہ ہو ماہ تاباں کا
بہا کرتا ہے چشمہ اسکے اندر آب حیواں کا

یہ حل کرتا ہے پیچیدہ مسائل رازِ ہستی کے
یہ ہی عقدہ کشا معشوق کے گیسوئے پیچاں کا

یہ شاعر کا ہے دل یا ساغرِ گیتی نما کوئی
نظر آتا ہے نقشہ جسمیں کل دنیائے امکاں کا

تماشہ دیکھا رہتا ہے بازیگاہ عالم میں
ہوا کرتا ہے ظاہر نور اسکے چشم پنہاں کا

عروسِ فکر سے اٹکھیلیاں دن رات کرتا ہے
پھرا کرتا ہے منظر اسکی آنکھوں میں شبستاں کا

دلِ شاعر کا ہے اک قطرۂ خوں شعرِ پُر معنی
یہ اک چھوٹا سا مجموعہ ہے جذباتِ پریشاں کا

دلِ شاعر نہیں یاقوت کی کانِ معلّٰی ہے
ملا ہر شعر کو ہے مرتبہ لعلِ بدخشاں کا

نہ دل شاعر کا چھونا ہے یہ شیشہ ٹوٹ جائیگا
بنا نقشہ بگڑ جائیگا اس سلطاں کے ایواں کا

نظام عالم امکاں ہے سارا اسکے ہاتھوں میں
یہی شاعر کا دل ناظم ہے اس دنیائے گرداں کا

یہ ہفت اقلیم کی گھر بیٹھے بیٹھے سیر کرتا ہے
نمونہ ہے یہی شاعر جہاں میں نوع انساں کا

یہ دل اک مسکن آزادی و عیش دوامی ہے
مئے وحدت سے ہے لبریز یہ اک جام عرفاں کا

نہیں کر سکتا اندازہ کوئی اس دل کی طاقت کا
پلٹ دیتا ہے اک جنبش میں کل تختہ یوراں کا

دلِ شاعر کی دنیا ہی جدا ہے سارے عالم سے
گذر اسمیں نہ حیواں کا نہ انساں کا نہ سلطاں کا

کبھی دنیائے دل اسکی دورنگی ہو نہیں سکتی
چڑھا رہتا ہے اسپر رنگ خالی عشق یزداں کا

یہی دل نور افزا ہے تجلی گاہ عالم کا
کہ ذرہ ذرہ دنیا میں اسی کے فیض سے چمکا

اسی شاعر کے پارہ ہائے دل گردوچ تاباں ہیں
اسی کے معجز کونین میں ہر سو نمایاں ہیں
اسی دل سے ہے وابستہ تغیر سارے عالم کا
اسی دل کے فرشتے عرش اعظم پر ثنا خواں ہیں
پڑے لاکھوں مسیحا ہیں اسی کے گوشۂ دل میں
اسی کی روکشی پر ہر نفس آمادہ سلطاں ہیں
اسی دل کی بدولت مذہبوں میں جان باقی ہے
اسی کے تار رگ سے منسلک اجزائے ایماں ہیں

غرض اس دل کی ہستی ایک عبرت خیز ہستی ہے
ہمیشہ اسکی دنیا مائل وحدت پرستی ہے

سنور مجھکو اپنے دل پہ دائم ناز رہتا ہے
کہ یہ ساز نفس پر زمزمہ پرداز رہتا ہے
گذرتے ہیں مرے ایام اک مستی کے عالم میں
مرا دل چپکے چپکے مائل اعجاز رہتا ہے
پیام عیش دیتا ہے تسلی مجھکو عسرت میں
برابر رنج و راحت کا مجھے انداز رہتا ہے
سفر میں اپنے دل کو میں عدم سے ساتھ لایا ہوں
یہی مشکل کشا و ہمدم و ہمراز رہتا ہے
سماع کوس رحلت سے کبھی غافل نہیں رہتا
سدا بہر سفر یہ گوش برآواز رہتا ہے

نہیں حالانکہ میں شاعر مگر یہ دل بتا دیگا
مجھے یہ شعر کا اک عاشق کامل بنا دیگا

منوّر لکھنوی

غزل

وصل میں پچھلے خیالوں پہ ہنسی آتی ہے
انھیں مجھ پر مجھے نالوں پہ ہنسی آتی ہے
اب قیامت کے وہ انداز نہیں کوسوں تک
حشر کے دن تری چالوں پہ ہنسی آتی ہے
میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ ہنسے کیوں مجھ پر
اور انھیں میرے سوالوں پہ ہنسی آتی ہے
کیا کہا لاکھ ہنساؤ نہ ہنسینگے ہرگز
وہ کھلے ہونٹ وہ نالوں پہ ہنسی آتی ہے
زندگانی کی جو ہو جاتی ہیں کچھ امیدیں
موت کو میرے سنبھالوں پہ ہنسی آتی ہے
کل مصیبت کے اندھیروں میں گرے تھے آنسو
آج قسمت کے اجالوں پہ ہنسی آتی ہے
اک نظر دیکھتے ہی آپ کہیں ہوش کہیں
آپ کے دیکھنے والوں پہ ہنسی آتی ہے
میری بھٹی ہوئی تقدیر میں یہ تھے ساغر
مجھے ان ٹوٹے پیالوں پہ ہنسی آتی ہے

ساغر نظامی

بہار

(از محمد مبین نازش بدایونی)

نورِ شفق کی ضو سے ہیں افلاک گلگوں پیرہن
موجِ شفق کی رَو سے ہے فرشِ زمیں رشکِ چمن

گوہر ہے آبِ حُسن کا بزمِ عناصر کی چمک
جوہر ہے تابِ حُسن کا اشیائے عالم کی پہن

ذوقِ حقیقت ہے عیاں اندازِ گل ہی خود نما
لیتا ہے دلمیں چٹکیاں بلبل کا مستانہ سخن

خود ہے شجر خود ہے ثمر خود ہے وہ غنچہ خود ہی بُو
خود ہے وہ گلچیں خود صبا خود ہی سمن خود ہی چمن

لالہ ہے اپنے ہاتھ میں یاقوت کا ساغر لیئے
گلہائے سوسن کی زباں ہی غیرتِ نہرِ لبن

نرگس کی عشوہ سازیاں پردہ کشائے حُور ہیں
شبنم کے آئینہ میں ہی روئے جناں پُرفگن

وادی کی ہے دلکش فضا ٹیلے زمرد سے فزوں
موجوں پہ عالم وجد کا چشمے ہیں کوثر کا دہن

صحرائے حیرت ناک میں یوں گونجتی ہی بادِ خوش
ہوں شانِ قدرت دیکھکر جیسے فرشتے نغمہ زن

ہے لمبی لمبی گھاس پر قطراتِ شبنم کی جھلک
یا گلرخانِ شوخ کے دامن میں ہیں دُرِ عدن

سُرخی شفق کی دوڑ کر لیتی ہے بوسے پھول کے
غنچے ہیں قیل و قال میں صرفِ تبسم ہی دہن

ہے آبشاروں کی صدا اک نغمۂ الہامِ نو
ہیں آسماں پر رقص کُن سیّارگانِ صنوفگن

حُوروں کے گیسو چھوڑ کر آئے ہیں جھونکے خلد کے
فردوس کی ارواح ہیں یا عندلیبانِ چمن

آتی ہے رہ رہ کر صدا سجدہ کناں ہوں ڈالیاں
اللہ اکبر کے لیئے ہو وقف غنچوں کا دہن

بلبل کے رنگیں بال و پر بنجائیں چیتر زرفشاں
ہے تا جدارِ نامیہ گلزار میں جلوہ فگن

اِس پُرفضا آواز سے اُٹھتی ہی دل میں گدگدی
نیرنگِ ہستی کا سبق پڑھتے ہیں اشجارِ چمن

جو پھول ہیں زیبِ نظر آنکھوں کو دھوکا ہیں وہی
عبرت جتاتی ہی ہمیں دنیا ہے اِک باغِ کہن

گلگشت کر ایسی جگہ جسکو ازل سے ہو بقا
پھولوں لے رنگِ شوخ سے گلچیں کا دامن ہو چمن

لطفِ سخن

حضرت مولانا آزاد سبحانی صاحب مدظلہ العالی

دود انگیزیٔ دل گیسوئے شبرنگ سے ہے
تنگیٔ جان فسردہ دہنِ تنگ سے ہے

شورِ ہر جان میں پاشیدہ تری فکل کا ہے
فتنہ ہر دور کا بالیدہ ترے ڈھنگ سے ہے

شمع تاباں کی تجلی ہے رخِ روشن سے
گلِ رنگیں کی لہک عارضِ گلرنگ سے ہے

اک صدا ہے تری ہر ہمزنِ جمعیتِ دل
سارا ہنگامۂ جاں ایک لبِ چنگ سے ہے

ہر دمِ برق سے ہے جلوہ ترا چشمک زن
شعلہ زن ذکر ترا ہر شررِ سنگ سے ہے

جو بھی پیدا ہے تری صورتِ پنہاں کا ہے عکس
جو بھی ہے رنگ تری ہستیٔ بیرنگ سے ہے

کیا عجب ہے جو اشارے میں ہو ذرہ خورشید
اس طلسمات کی ہستی بس اک آہنگ سے ہے

آہ اک کھینچ کے مرجاؤں مداوا ہے یہی
اسقدر جان خفا قالبِ دل تنگ سے ہے

اب فقط قصۂ ناکامیٔ دل کہنا ہے
اب کمر کھولنا باقی سفرِ لنگ سے ہے

خاک اب تخت ہے اور موئے پریشاں ہے تاج
کام دیہیم سے باقی ہے نہ اورنگ سے ہے

کیوں نہ نیرنگیٔ باطن ہو نمایاں تجھ میں
نسبت آزاد تجھے خواجۂ بیرنگ سے ہے

جناب جگر مرادآبادی

روح اس قالبِ خاکی میں جو مسحور نہو
اُس جگہ ہو کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہو

خود ضیا بار جو اک جلوۂ مستور نہو
آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہو

خاک ہے سوزِ غمِ عشق کی تاثیر کلیم
دل کا ہر ذرہ اگر برقِ سرِ طور نہو

اس تقیّد پہ تو عالم ہے یہ آزادی کا
کیا قیامت کرے انسان جو مجبور نہو

ایک کی بھی نہ چلی جذبۂ دل کے آگے
چاہتے سب تھے کہ رسوائی منصور نہو
ہر نفس اسکو محبت میں ہے پیغامِ حیات
آدمی اپنی حقیقت سے اگر دور نہو
عین ایماں ہے اناالحق کا ترا نہ لیکن
ہے یہی کفر اگر دیدۂ منصور نہو

کوچۂ عشق سے باہر وہ نکل جائے جگر
جیتے جی خاک میں ملنا جسے منظور نہو

جناب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی

روگ ہیں جان کو دُنیا بھر کے
ہم تو پچتائے محبت کر کے
جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
ملگجے پھول ترے بستر کے
آدمی اپنی حقیقت کو نہ بھول
ٹھوکریں کھاتے ہیں کاسے سر کے
سادگی حسن کا تیرے زیور
حسن قربان ترے تیور کے
پہلے چپ لگ گئی پھر موت آئی
جان لی عشق نے رسوا کر کے
وہی تکلیف سوا دیتے ہیں
زخم گہرے جو نہ تھے خنجر کے
دیکھتے بھی نہیں دنیا کیا ہے
جب گدا ہو گئے تیرے در کے
تم ابھی کچھ تھے ابھی ہو کچھ اور
دیکھ لینے دو ذرا جی بھر کے
زخم میں دل کے بھی اجزا حل ہیں
چارہ گر دیکھ نہ پھایا سر کے
عقل بیدار معطل ہیں حواس
بھٹکو پایا تو مگر مر مر کے
آبلوں کا بھی تو اندیشہ ہے
آہ کر آنکھوں میں آنسو بھر کے

بھولنا ہی نہیں یہ قول اثر
ہم تو پچتائے محبت کر کے

جناب محمود الہ آبادی

بقاءِ زندگی ہے دردکاوں میں ٹھہر جانا
فناءِ زندگی ہے جذبۂ الفت کا مر جانا

نگاہِ نازِ جاناں تیری اس رفتار کے صدقے
کہ آنکھوں سے اُترنا دل میں اور دل میں ٹھہر جانا

فقط اک امر ہے عنصرِ اضداد کا ملنا
پھر اپنے وقت پر اک دوسرے کا خود بکھر جانا

لحظہ شق ہوئی جاں آ رہی ہے نعشِ بیجاں میں
ٹھہر جانا ذرا او جانے والے پھر ٹھہر جانا

یں کیا ہوں کس لئے بھیجا گیا اس دہر ہستی میں
نہ اب تک خود کو پہچانا نہ کچھ رازِ سفر جانا

بونِ عشق کا عمرِ رواں کو یہ اشارہ ہے
کہ یاس اور غم کی منزل سے بھی خوش ہو کر گذر جانا

ہی ذراتِ اول ہیں کہ جنکا بحرِ ہستی میں
کہیں پر ڈوبنا انکا کہیں پر خود اُبھر جانا

اک افسانۂ غم تھا مریضِ ہجر کے دل کا
کہ آتے ہی تمہارے اسکی نبضوں کا اُبھر جانا

سیہ پوش اسلئے ہر نظم ہے محمود دنیا میں
کہ اُن سب کے لئے اک حشر ہے اکبر کا مر جانا

حضرت خواجہ عشرت لکھنوی

ترزر رہتے ہیں رنگِ بزمِ عالم دیکھکر
پانوں رکھتے ہیں زمینِ شعر میں ہم دیکھکر

ے شباتیٔ چمن کچھ ایسی حسرت خیز ہے
جب کلی ہنستی ہے رو دیتی ہے شبنم دیکھکر

ارت اچھی ہو تو اچھے اچھے ہوتے ہیں فدا
قید میں آئے فرشتے حسنِ آدم دیکھکر

ب ادائیں دلکشی کی ہیں تری تصویر میں
دم فنا ہوتا ہے خاموشی کا عالم دیکھکر

پار ہونا عشق کے دریا سے عشرت ہے محال
ڈوبنے لگتا ہے دل یہ بحرِ اعظم دیکھکر

جناب صدرالدین صاحب سرشار کسمنڈوی

ہ نظر ہے سلسلہ جنبانِ آرزو
سو بار ڈھا چکی ہے جو ایوانِ آرزو

ارے جنوں نوازیٔ حسنِ نظر فریب
ہے دل کا ہاتھ اور گریبانِ آرزو

ے سے تیرے کتنے خزانے نکل چکے
تجھکو بھی کچھ خیال ہے او جانِ آرزو

سے نکل رہا ہے دھواں بات بات میں
اللہ رے سوزِ سوختہ سامانِ آرزو

یہ کیکے دل کا تیرے قصہ کیا تمام
لے کھولتا ہوں میں درِ زندانِ آرزو

کیا جانے سلوک کیا زخمِ دل نے کیا
نکلا لہو میں ڈوب کے پیکانِ آرزو

لے کام اعتدال سے اے شورشِ دروں
تاراج ہو نہ جائے گلستانِ آرزو

پھر دے رہا ہے حسن صلائے جنوں نواز
پھر جمع ہو رہے ہیں پریشانِ آرزو

کس حسن سے فریب دیا ہے امید نے
پھر شادماں ہیں سوختہ سامانِ آرزو

یوں بیحجاب ہو نہ جمالِ نظر فریب
بیہوش ہو نہ جائیں مریضانِ آرزو

ہر حرف دے رہا ہے نویدِ وصالِ دوست
کس درجہ دل فریب ہے عنوانِ آرزو

اِک آہ بھر کے کھول دیں آنکھیں مریض نے
تیری نگاہِ ناز تھی یا جانِ آرزو

اے انقلابِ دہر بتائے کوئی مجھے
پاتے ہیں کب نجات اسیرانِ آرزو

تو نے بھی اپنے در سے ستمگر اُٹھا دیا
اب کس طرف کو جائیں گدایانِ آرزو

سرشار اُس نگاہ سے پھر ربط و ضبط ہے
پھر جمع کر رہا ہوں میں پیکانِ آرزو

جناب مولوی حافظ محمد اشرف علی صاحب حافظ کانپوری

میں اُنکے حسنِ جفا دوست کا شکار رہا
نظر ملی تھی کہ اک تیر دل کے پار رہا

جو قلب سوزِ محبت سے داغدار رہا
نفس نفس مجھے آئینۂ بہار رہا

گدازِ غم کی سرور آفرینیاں دیکھو
کہ خونِ دل بھی محبت میں خوشگوار رہا

فریبِ حسنِ تکلم نہ پوچھ اے ہمدم
جب اُسنے وعدہ کیا مجھکو اعتبار رہا

گئی نہ دل سے مرے حسرتِ قدمبوسی
ہوا جو خاک تو خاکِ رہِ نگار رہا

خدنگِ ناز کی کیسی لگی ہے دُہری چوٹ
جو تیر دل پہ پڑا تھا جگر کے پار رہا

رہیگا فرقتِ ساقی میں خاک نشۂ زیست
سرورِ شوق سے اندازۂ خمار رہا

شہیدِ برقِ تبسم ضرور تھا حافظ
کہ دل کی خاک کا ہر ذرّہ بیقرار رہا

زمانہ

جلد ۴ مئی سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۵

ملکانہ راجپوت مسلمانونکی شدھی

شمالی ہندوستان مین ملکانہ راجپوتون کی شدھی کا مسئلہ اپنے نتایج کے اعتبار سے جتنا اہم ہورہا ہے اُتنا شاید اور کوئی مسئلہ نہوگا۔ بالخصوص اسلئے کہ جہان تک اخبارون سے ظاہر ہوتا ہے ہندو جماعت اس تحریک کو جاری رکھنے اور قوی تر بنانے کے لئے متفق ہوگئی ہے۔ شاید ہندوستان کی تاریخ مین پہلی بار آریہ سماج اور سناتن دھرم مصلحین اور راسخین مین اتفاق اور اتحاد نظر آرہا ہے۔ کوئی شک نہین کہ ہمارے مسلم برادران وطن اس اتفاق کو شبہ آمیز نظرون سے دیکھ رہے ہین اور اس اجتماع کو اپنے قومی وجود کے لئے خوفناک سمجھتے ہین۔ ابتک تبلیغ کے میدان مین مسلمان یکہ تاز تھے۔ کوئی انکا رقیب نہ تھا۔ لیکن یہ صورت حال بہت سُرعت سے تبدیل ہوتی جارہی ہے اور مسلمانون کو یہ اندیشہ ہونے لگا ہے کہ کہین یہ تحریک ہمارے قومی زوال کا پیش خیمہ تو نہین ہے۔ آریہ سماج سے انھین زیادہ خوف نہین تھا جب تک شدھی کی تحریک آریہ سماج تک محدود تھی وہ اُسکی زیادہ پروا نہ کرتے تھے۔ لیکن ہندوؤن کی مجموعی طاقت کو اسکی امداد اور اشاعت پر آمادہ دیکھکر مسلمانون مین سخت بدگمانی پیدا ہوگئی ہے۔ اب بھی کچھ غیر متعصب مسلمان کانگریس کے کامون مین شریک ہوتے ہین اور اس مغائرت کے فتنہ کو فرو کرنے کی کوشش مین منہمک ہین۔ مگر انھین جمہور اسلام اپنے مذہبی دائرہ سے خارج

سمجھتا ہے - ایسے آدمیوں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے جو سوراجیہ کی تحریک ہی سے بدظن ہو گئے ہین اور سوراجیہ کو ہندو راجیہ کا مترادف کہنے لگے ہین -

ہم یہ مانتے ہین کہ ہر ایک قوم کو اپنے مذہبی صداقتون کی اشاعت کا کامل استحقاق اس عام حق سے کسی ذی فہم انسان کو انکار نہین ہو سکتا - مگر اسکے ساتھ ہی ہمکو یہ بھی معلوم کہ تبدیل مذہب کی ہر ایک مثال بیشمار آدمیون کو اس سے کہین زیادہ روحانی صدمہ پہونچاتی جہانتک اونکو روحانی سکون عطا کرتی ہے ایک ہندو مسلمان ہوتا ہے تو لاکھون ہندوؤن دلون مین تعصب کا جوش پیدا ہو جاتا ہے، یہان تک کہ وہ اس مرتد کو جان سے مار ڈالنے تدبیرین سوچنے لگتے ہین - مذہبی توہین کا سب سے مہلک پہلو یہی ہے کہ کوئی آدمی اس منحرف ہو جائے - یہ گویا اُس مذہب کے خامی کا اعلان ہے - اور ایسے شخص کی نہانی جو ہمیشہ اسکا مطیع رہا ہے - ایک ہندو بدھوا کسی مسلمان کے نکاح مین آجاتی ہے تو ہندوؤن کو اس - جتنا صدمہ ہوتا ہے اُسکا اظہار نہین کیا جا سکتا - ہندوستان کے لوگ مذہب پر دروا قع ہ ہین - یہان مذہب نے "قومیت، ذات، حسب ونسب" سب پر سکہ جما لیا ہے - اور اس زما مسلمان ہندوؤن سے کوسون آگے ہین - اسلئے ہم اندازہ کر سکتے ہین کہ کسی مسلمان کے ہند ہو جانے سے انھین کتنا صدمہ ہوگا - ایسی حالت مین کیا یہ مناسب نہین ہے کہ تبلیغی تحریکین بند کر دی جائین - اور چند افراد کے روحانی اطمینان کے لئے ایک قوم کے دل کو ایذا نہ پہونچا جائے - مذہب ایسے سچے معنون مین خالق اور معبود کا معاملہ ہے - ہر ایک شخص کو اختیار ہ وہ جس طریق سے چاہے معبود کی پرستش کرے - مگر اسکی کیا ضرورت ہے کہ اس خفیف سے و سارے ملک مین تشہیر کیجائے - خواہ مخواہ جلوس نکالے جائین - جشن منایا جائے - اِس سی مذہب کی وقعت زیادہ نہین ہوتی، کم ہوتی ہے - ہم گلہ نہین کرتے، مگر جن ہمکو یہ کہنے مجبور کرتا ہے - ہندوؤن مین اس تحریک کی بنا مسلمانون نے ڈالی - وہی اسکے ذمہ دار ہین ہین کے مذہبی جوش نے ہندوؤن کو اجتماع اور انضباط پر آمادہ کیا - جن صوبون مین مسلمانو آبادی زیادہ ہے وہان ہندوؤن کو آسائش اور اطمینان میسّر نہین - انکی لڑکیان، انکی بیو میشہ اسلامی دست بُرد کا شکار ہوتی رہتی ہین اور مسلمان سرغنایانِ قوم سکوت کی زرین

توڑنا مناسب نہین سمجھتے۔ ہم ہندوؤن کو اس تحریک کے اجرا کے لئے متہم نہین کرتے لیکن چونکہ ہندو قوم زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ باخبر، قومیت کی زیادہ دلدادہ ہے۔ اسوجہ سے یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ بالآخر اسنے بھی تبلیغ کا وہی رویّہ اختیار کیا جس پر اُسے خود اعتراض تھا۔ چاہے بانگ دہل سے اعلان کیا جائے کہ ہندو قوم نے شدھی کی تحریک محض اپنا شیرازہ باندھنے کے لئے جاری کی ہے۔ اور اُسے کسی فرقہ یا مذہب کو نقصان پہونچانا منظور نہین ہے۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہین رہ سکتے کہ یہ صریح Retaliation کی پالیسی ہے۔ اور اسی موقعہ پر جبکہ ہمنے کو سیاسی معاملات مین ممنوع سمجھ رکھا ہے، مذہبی معاملات مین اسپر کاربند ہونا ناقابل عفو ہے۔

یہ مادیات کا دور ہے۔ مادّی اغراض و مقاصد جسکا مجموعی نام سیاسیات رکھا گیا ہے زندگی کے کل شعبون پر حاوی ہین۔ مذہب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہین۔ ہم آج کل مذہب کی تلقین اور تبلیغ روحانی صداقتون کی بنا پر نہین کرتے۔ اسمین سیاسی اور ملکی فوائد مضمر اور مخفی ہوتے ہین زمانۂ قدیم مین مذہب کل دنیاوی امور پر حکمران تھا۔ اب سیاسی حکومت اور چیرہ دستی کا زمانہ ہے ہندوستان مین عیسائیت کی منادی اسلئے ہو رہی ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کو ایسی جماعت کی امداد کا یقین ہو جائے جو ہم ملت ہونے کے باعث اسکے دامن سے وابستہ رہنا اپنے وجود کے لئے لازمی سمجھے۔ ہندو بھی اسی سیلاب کی زد مین آگئے ہین۔ اسلامی حکومت کا زمانہ مذہبی تعصبات کا زمانہ تھا۔ اسوقت تبلیغ اسلام کا منشا سیاسی نہین بلکہ محض مذہبی تھا۔ اور غالبًا موجودہ زمانہ مین بھی یہ تحریک سیاسی وجود پر مبنی نہین ہے۔ مگر ہندوؤن کی شدھی کی تحریک خالصًا اور کلیتہً سیاسی اُمور پر مبنی ہے۔ ذات کی تفریق کو مٹانا، اُصولون کو ہم آغوش کرنا، اور اسی قسم کی دیگر تمدنی تحریکین سیاسی فوائد کو مدنظر رکھکر جاری کی گئی ہین۔ ہمارا حُب وطن۔ حُب ملت ہے۔ ہم کسی امر کو ملکی نقطۂ نظر سے نہین، بلکہ مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہین۔ ہم زبان سے چاہے کچھ بھی کہین، مگر دل سے ہم پہلے ہندو اور بعد کو ہندوستانی ہین۔ اسمین شک نہین کہ دیگر مہذب ملکون مین بھی حب وطن نے حب ملت کو کلیتہً محو نہین کیا ہے۔ مگر وہان مذہب کی حیثیت ثانوی ہے۔ اِنکی نگاہین وسیع ہین۔ وہ کسی معاملہ کو ملکی اعتبار سے جانچنے کے عادی ہین۔ فرانس، جرمنی یا امریکہ مین اگر ہندو یا مسلمان تعداد مین زیادہ ہونے لگین تو وہان کھرام نہین مچیگا۔ امریکہ مین آج ہندوؤن کی تعداد اتنی زیادہ

ہوجائے کہ وہاں ہر ایک تعلیم گاہ مین ہندی کی تعلیم کو جبری قرار دینے کا مسئلہ دارالقوانین مین منظور ہوجائے تو یقیناً امریکہ والے اسے اپنے ملک کے لئے تباہی کا شگون نہ خیال کرین گے۔ وہان تفریق کی بنیاد رنگ ہے۔ مذہب نہین۔ ہم یہ نہین کہتے کہ انکے تفریق کی بنیاد ہماری بنیاد مخاصمت سے کم مضر ہے۔ وہان بھی آئے دن سب وشتم کی نوبت آتی رہتی ہے۔ مگر انکی تقدیر اپنے ہاتھ مین ہے۔ اس مسئلہ پر انکی زندگی یا موت مبنی نہین ہے۔ جہان اور متنازعہ امور ہین مثلاً مزدورون اور سرمایہ دارون کا مسئلہ، وہان ایک یہ بھی ہے۔ مگر ہندوستان کی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ ہندو اور مسلمان دونون ہی سیاسی، تمدنی، مالی، مسائل مین مذہبی تفویق کے حامی ہین اور حقیر فوائد کے لئے متہم بالشان قومی اغراض کو قربان کردینے مین پس وپیش نہین کرتے۔

آئے اب دیکھین کہ اس شدھی سے ہندوؤن نے کیا فائدہ سوچ رکھا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ہندوؤن کی تعداد زیادہ ہوجائیگی اور اسی مناسبت سے مسلمانون کی تعداد کم ہوگی مگر کیا قومی معاملات مین تعداد ہی سب کچھ ہے۔ تجربہ تو یہ بتلاتا ہے کہ فی زمانہ تعداد کی کوئی وقعت نہین۔ جرمنی کے ۶ کروڑ باشندے روے زمین کے باشندون کو دعوت جنگ دے سکتے ہین۔ ۶ کروڑ کا انگلستان ۳۲ کروڑ کے ہندوستان پر کامیابی کے ساتھ حکمرانی کرسکتا ہے۔ تو تعداد کی اتنی اہمیت کیون ہے؟ سکھون کی تعداد کبھی ۱۶ یا ۱۷ لاکھ سے زائد نہ تھی لیکن انھون نے پنجاب اور سرحدی صوبون پر حکومت کی اور اگر انگریزون نے انکے قدم نہ روک دیئے ہوتے تو غالباً وہ اپنی سلطنت کے حدود کو اور بھی زیادہ وسیع کرسکتے۔ غوری یا غزنی دس بیس کروڑ کی جماعت لیکر ہندوستان پر حملہ آور نہین ہوئے تھے۔ یونان نے کسی زمانہ مین عالمگیر سلطنت قائم کی۔ اٹالی بھی ایک زمانہ مین سارے یوروپ پر حاوی تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدد ی فوقیت سیاسی فوقیت کی موجب نہین بلکہ باہمی انضباط اور اتفاق ہی وہ چیز ہے جو قوم کو قوی اور بااثر بنادیتی ہے۔

ہندو آج ۲۴ کروڑ ہین اگر بہت سرگرمی سے کام لیا گیا تو غالباً دو چار سال مین ۲۴ لاکھ کروڑ ہوجائین گے۔ اس سے زیادہ کسی طرح نہین ہوسکتے۔ سارے ملک کو ہم مذہب بنانے کا خیال جنون سے زیادہ وقعت نہین رکھتا۔ تو جب ۲۴ کروڑ ہندوؤن نے اپنے کو سیاسی غلامی

سے آزاد کرنے کے ناقابل پایا تو ۱½ کروڑ ہندوؤں کے اضافہ سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ شاید زیادہ سے زیادہ اسکا اثر یہ ہوگا کہ ایک یا دو ممبر کونسل مین زیادہ ہوجائین۔ تو اتنے حقیر نتیجہ کے لئے اسقدر شور و شغب کی کیون ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ کیا اس تحریک کے حامیون کو اتنا بھی نظر نہین آتا کہ اس سے باہمی مغائرت بڑھتی جاتی ہے اور ہم روز بروز سوراجیہ کے منزل مقصود سے دور ہوتے جاتے ہین۔ وہی امرت سر ہے جہان تین سال قبل ہندوؤن اور مسلمانون نے خونی یگانگت کا ایسا اونچا معیار پیش کیا تھا جسکی نظیر ہندوستان کی تاریخ مین مشکل سے ملسکتی ہے اُسی امرتسر مین آج دونون فرقون مین خونریزی کا بازار گرم ہے! اسکے لئے ہم ایک بڑی حد تک اسی شدھی کی تحریک کو مورد الزام سمجھتے ہین غنیمت ہے کہ ابھی تک کانگرس کے حامی مسلمانون نے تحمل اور ضبط سے کام لیا ہے۔ مگر اب اسکی علامتین نظر آرہی ہین، جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تازہ تقریر سے ثابت ہوتا ہے (خدا کرے وہ رپورٹ نادرست ہو) کہ اب اُن لوگون کا تحمل بھی انتہائی حد تک پہونچ گیا ہے اور یہی کیفیت رہی تو وہ دن دور نہین ہے جب ہمکو انکی مخالفت کا علانیہ سامنا کرنا پڑیگا۔ یہ خیر بھی جب اُس قدسی صفات 'فنا فی القوم' پاک نفس بزرگ کو میسر ہوگی جو اسوقت برواد اجیل مین اپنے قوم کا کفارہ ادا کر رہا ہے تو معلوم نہین کہ اُسکے سریع الحس دل پر کیا گذریگی۔ ہندو مسلم اتحاد اسکے قومی تعمیر کی بنیاد تھی۔ اُسے اس نے اپنے خونِ جگر سے قائم کیا تھا۔ وہ اسی مضبوط بنیاد پر اپنی عالیشان عمارت کھڑی کرنی چاہتا تھا۔ اس سے قبل زمانۂ حال سے مدبرون مین کسی نے اس بنیاد کو مستحکم اور پائدار بنانے کی ضرورت نہین سمجھی، یا اُنمین اسکی صلاحیت ہی نہ تھی۔ مگر افسوس ہے کہ آج ہمارے چند مذہبی فدائیون کی مجنونانہ سرگرمی اس بنیاد کو متزلزل کئے دیتی ہے۔ ہمکو ہندوؤن کے تدبر پر اعتماد تھا۔ ہمکو اندیشہ تھا کہ ہندو قوم کی جانب سے اس اتحاد کو کوئی اندیشہ نہین ہے۔ اگر اندیشہ تھا تو مسلمانون کی جانب سے کہ کہین وہ ارباب اختیار کی تحریص و ترتیب کا شکار ہوجائین۔ مگر ہوا کیا؟ ہندوؤن نے پہلے اس بنیاد پر بھاؤڑا چلایا اور یہ حضرات دلیلین کیسی پیش کرتے ہین! کوئی کہتا ہے ہندو اپنے تئین مضبوط بنا رہے ہین اور مسلمانون کو خوش ہونا چاہیے کہ انکے برادرانِ وطن مین مقابلہ اور مجادلہ کی قوت پیدا ہو رہی ہے۔ اس عقل پر آنسو بہانے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ ایک بھائی کو دوسرے بھائی کا گلا گھونٹنا

مقابلہ کا سبق سکھایا جا رہا ہے - اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمین ہندوستانیون سے زیادہ بہ صفت موصوف اور کوئی قوم نظر نہ آئیگی - کیونکہ یہان ہر ایک گھر ایک اکھاڑہ ہے - اور وہان بھائی بھائی، باپ بیٹے، مقابلہ اور مجادلہ کی مشق کر رہے ہین - ہم سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا!

دنیا مین سب سے خوفناک کام مذہبی تعصبات کو برانگیختہ کرنا ہے - یہان تک کہ سلطنتین بھی اس دائرہ مین قدم رکھنے کی جرأت نہین کرتین - مگر ہندوؤن کی دلیر قوم اسوقت شجاعت کے جوش مین کسی رکاوٹ کی پروا نہین کرتی - کوئی مارشل لا اور سخت سے سخت جبری قوانین اتنے مہلک نہین ہو سکتے جتنے برانگیختہ تعصبات اس سے مستورات کو باہر نکلنا مشکل ہو جائیگا - امرتسر مین ایک ہندو لڑکی کی بے حرمتی نے کتنی جانین ہلاک کین - ایسے حادثے روز ہی وقوع مین آتے رہینگے - اور اس طرح روز ہی خون خرابہ ہوتا رہیگا - اگر اس باہمی جنگ و جدل سے کوئی تیسری پارٹی فائدہ نہ اٹھانیوالی ہوتی اور ہندو اور مسلمانون ہی کے شکست اور فتح پر مسئلہ کا دارومدار ہوتا تو ایک فریق دوسرے پر غالب آکر اپنے تئین مبارکبادی کا مستحق سمجھ سکتا تھا - لیکن جب ہم دیکھ رہے ہین کہ اس قسم کے اختلافات ہماری غلامی کی زنجیرون کو اور مضبوط کئے دیتے ہین تو قرین قیاس نہین معلوم ہوتا کہ کیونکر کوئی فہمیدہ شخص ان حالات کو مطمئن نظرون سے دیکھ سکتا ہے - ہمارے باہمی اتفاق نے دشمنون کے پتے پانی کر دیئے تھے - اتنا اہم ہوتے ہوئے بھی یہ ہماری قومی قلعبندی کا فائز کرنیوالا پہلو تھا - حریف اسی مقام پر اپنی مرکزی طاقت کا اثر ڈالنا چاہتا تھا - اور ہماری نا مآل اندیشی اور کوتاہ نظری کے باعث اسکی کوششین کامیاب ہوگئین -

ہم شدھی کے حامیون سے پوچھتے ہین کیا ہندوؤن کو مستحکم بنانیکا یہی ایک وسیلہ ہے اُنکو کیون نہین اپنانے جنکے اپنانے سے ہندو قوم کو اصلی قوت حاصل ہوگی - کرورون اچھوت عیسائیون کے دامن مین پناہ لینے چلے جاتے ہین - انھین کیون نہین گلے سے لگاتے ؟ اگر آپ قوم کے سچے ہی خیر خواہ ہین تو ان اچھوتون کو اُٹھائین، ان پامالون کے زخم پر مرہم رکھین - اُنمین تعلیم اور تہذیب کی روشنی پہونچائین - اعلیٰ اور ادنیٰ کی قیدون کو مٹائین - چھوت چھات کے بے معنی اور مہمل قیدون سے قوم کو پاک کیجئے - کیا ہماری راسخ الاعتقاد مذہبی جماعتین ڈومڑون اور چماروں سے برادرانہ مساوات کرنے کے لئے تیار ہین ؟ اگر نہین ہین تو انکی شیرازہ بندی

کا دعویٰ باطل ہے۔ آپ یا تو حکام کی ریشہ دوانیون کے شکار ہوگئے ہین یا مذہبی تنگ نظری نے آپ کی بصارت کو غائب کردیا ہے۔ آپ کو واضح ہو کہ مسلمانون سے دشمنی کرکے، اپنے پہلو مین کانٹے بو کے، آپ اپنی قوم کو مضبوط نہین کر رہے ہین۔ آپ مسلمانون کو جبراً قہراً حکمران قوم کی مدد لینے کے لئے مجبور کر رہے ہین۔ آپ اپنی تلوار مقابل کے ہاتھ مین دے رہے ہین۔ آپ کا خدا ہی حافظ ہے۔ پھر بھی کیا خبر ہے کہ جن مسلمانون یا برائے نام مسلمانون کو پاک کرنے کے لئے آپ ساری قوم کو تباہی کی طرف لئے جا رہے ہین وہ ہمیشہ ہندو دامن سے وابستہ رہین گے؟ کم ازکم سابقہ تجربات تو اس استقلال کی شہادت نہین دیتے۔ اور سماج نے جتنے معرکے کی شدھیان کین، مرموقعون پر دھوکا کھایا۔ دھرم پال دھرم بیر وغیرہم، سب کے سب آج پھر مسلمان ہین۔ توکون یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ ملکانے راجپوت اس نئی نہاری کا لطف اُٹھانے کے بعد اپنے گھر کی طرف رُخ نہ کرین گے۔ ہمکو شک ہے کہ اس جوش وخروش کے بعد جب ان نو ہندوون کو ہندو سوسایٹی سے کماحقہ واقفیت ہوگی، وہ دیکھین گے کہ ہمکو شدھی سے کوئی خاص فائدہ نہین حاصل ہوا، ہمارے ساتھ اب بھی وہی چھوت چھات جاری ہے، ہماری اولادون کی شادیون مین اب اور بھی زیادہ رکاوٹین پیدا ہوگئی ہین تو متنفر ہوکر پھر اسلام کا دروازہ کھٹکھٹائین گے۔ مسلم سربرآوردگان قوم کی پالیسی کی جتنی مدح وستائش کیجائے وہ کم ہے۔ وہ معترف ہین کہ ہندوؤن کو اپنی مذہبی تبلیغ کا کامل استحقاق ہے۔ لیکن جب یہ تبلیغ انفرادی حیثیت سے گذر کر مجموعی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جب اخبارون مین اسکے زور اور ترقی کی خوش آیند خبرین شائع ہوتی ہین، جب اس خوشی مین سبھائین ہوتی ہین، مبارکباد دی جاتی ہے چندے ہوتے ہین، والنٹیر جمع کئے جاتے ہین، ایک باقاعدہ شدھی کیمپ کھولدیا جاتا ہے۔ تو صورت حال تبدیل ہوجاتی ہے۔ اور اُنکا یہ قول بالکل صحیح ہے،

زمیندارون اور کاشتکارون مین جابجا بدمزگیان ہوتی رہتی ہین۔ انکا شمار ملک کے معمولی واقعات مین کیا جاتا ہے۔ اُسکی طرف کسی کی توجہ بھی نہین ہوتی۔ لیکن اگر یہی بدمزگیان زیادہ اجتماعی صورت اختیار کرلین، کسانون کے جتھے قائم ہوجائین، اُدھر زمیندارون کی ٹولیان بنجائین اور آپس مین باقاعدہ جنگ چھڑ جائے تو سارے ملک مین وادیلا مچ جائیگا۔

بڑے شد و مد کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ملکانہ تو دراصل ہندو ہین - انھین مسلمان سمجھنا ہی غلطی ہے - وہ ہندو نام رکھتے ہین ہندوؤن کے دیوتاؤن کی پوجا کرتے ہین، شادیون مین پروہتون کو بلاتے ہین - صرف مردے دفن کرتے ہین اور ختنہ کراتے ہین - اسلئے انھین پھر ہندو دائرے مین لیکر ہم مسلمانون پر کوئی زیادتی نہین کر رہے ہین - مگر سوال تو یہ ہے کہ اب تک ملکانون کا شمار مردم شماری کے کاغذات مین کس ذیل مین ہوتا تھا - ہندوؤن مین یا مسلمانون مین ؟ جب یہ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان شمار کئے جاتے ہین تو انھین تبدیل مذہب پر آمادہ کرنا یقیناً مسلمانون کی اعدادی قوت کو ضرر پہونچانا ہے - ہندوؤن مین کتنے ہی ایسے فرقے ہین جو اسلامی رسم و رواج کی پابندی کرتے ہین - پانچون پیرون کی پرستش کرتے ہین، سید غازی کے مزار پر سجدے کرتے ہین، تعزیون کو شربت چڑھاتے ہین، محرم مین سبز کپڑے پہنکر نکلتے ہین - اگر اسی دلیل پر آج وہ سب کے سب مسلمان ہو جائین تو کیا ہندو یہ خیال کرکے اپنے کو تسکین دے لین گے کہ وہ تو برائے نام ہندو تھے - ہندوؤن مین ایسے فرقے موجود ہین جو گاؤکشی کرتے ہین، مسلمانون کے گھر کے جھوٹے ٹکڑے کھاتے ہین، مگر آج انکے مسلمان ہونے کی خبر پاکر ہندو جامے سے باہر ہو جائین گے - اسی لئے نہ کہ اس سے انکی تعدادی قوت معرض خطر مین آتی ہے - یہ بھی ایک حجت پیش کیجاتی ہے کہ ملکانے خود بخود دست بستہ التجا کر رہے ہین کہ ہمین ہندو برادری مین داخل کیجئے - ہم اب مسلمان رہنا نہین چاہتے - مانا - مگر کیا اب تک ملکانے سوتے تھے، یا آج کسی معجزے سے انکی مذہبی ارادت ہندوؤن کی طرف منتقل ہو گئی ہے - کوئی تحریک بلا خارجی تحریک اور اشتعال کے عالمگیر نہین ہوا کرتی - نمک ہی کے اضافہ محصول کو لے لیجئے - سیاسی اور باخبر حلقون مین اس پر جسقدر چون وچرا ہو رہی ہے اسکا عشر عشیر بھی غریب دیہاتیون مین نہین ہے جن پر اس اضافے کا بار پڑیگا - عوام مین اشتعال پیدا کرنے سے ہوتا ہے - یہ شدھی کی تحریک بھی اسی قسم کی ہے - شدھی کے حامیون نے مہینون اور برسون سے انھین تیار کی ہوگی، ڈھیلے توڑے ہونگے، کنکر چنے ہونگے، پانی سے سیراب کرکے ڈھیلون کو نرم کیا ہوگا، تب جاکے اب تخم ریزی کا موقعہ آیا ہے - اس قسم کی دلیلین پیش کرنا اپنے کو تو دہ تضحیک بنانا ہے -

سمجھ مین نہین آتا کہ یہ تحریک اس خاص موقعہ پر کیون جاری کی گئی - مسلمانون کے دلمین

یہ شک پیدا ہونا فطری ہے کہ انہیں ملاکر انھیں دوست بنا کر تو یہ نیلی گھونسلہ نہیں لگایا جا رہا ہے جبتک اُنسے چشمک تھی رقیبانہ مخالفت کا ہنگامہ گرم تھا تب تک ہندوؤں کو یہ تحریک جاری کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ اب جب اُنسے برادرانہ اتحاد قائم ہونا شروع ہوا تو ہندوؤں کو انکی جانب سے کوئی اندیشہ نہیں رہا؟ یہ سوال ہر ایک مسلمان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے اور اسے منطقی انتہا تک لیجانے سے اُسے گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ سب دلجوئیاں اور تلطف آمیزیاں یہ اتحاد اور ارتباط ہمیں صفحۂ ہند سے مٹانے کا پیش خیمہ تو نہیں ہے۔ اس گمان کا ازالہ کیونکر کیا جائے۔ دلیلوں سے الگا ازالہ نہیں ہوتا۔ جب حامیانِ شدھی ڈنکے کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ ہم اس تحریک سے ہرگز دست بردار نہوں گے چاہے اس کے نتائج کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہوں، ہم تقدیر کی سی ثبات کے ساتھ، خموشی سے، سوانحات کی مطلق پرواہ نکرکے، اس تحریک کو جاری رکھیں گے۔ تو ایسی حالت میں اس گمان کا ازالہ ہونا تو دور رہا وہ اور واثق ہوتا جاتا ہے۔ یہ ثبات اور عزم کسی زیادہ کارآمد تحریک کے لئے موزوں تھا!

شدھی کے حامیوں سے تو اب ہمیں زیادہ معقول پسندی کی اُمید نہیں۔ انھیں مذہبی جنون نے از کار رفتہ کر رکھا رہے۔ مگر ہم ہندو قوم سے پوچھتے ہیں اب ایسی حالت میں شدھی تحریک کے متعلق آپ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اسکے حامیوں کی دامے، درمے، سخنے، امداد و یکسر ہمیشہ کے لئے ہندو مسلم اتحاد یا دوسرے لفظوں میں سوراجیہ اور قومی حکومت سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں، یا اپنی زبانی اور عملی ہمدردی کو اس تحریک سے الگ کرکے اس اتحاد کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اتنے ہی دنوں میں بہت کچھ نقصان ہو چکا ہے۔ ضبط اور تحمل کی رسیاں تن گئی ہیں، گھر میں بڑی سینڈ پڑ گئی ہے، لیکن اگر آپ اب بھی چونکے تو اس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے، ضبط و تحمل کی رسیاں پھر ڈھیلی ہو سکتی ہیں، اور چور سینڈ کے دروازے سے بھاگ سکتا ہے۔ یہی موقعہ آپ کے جاگنے کا ہے۔ یہی موقعہ آپکو آنیوالی تباہی سے بچنے کا ہے، ایک جھپکی اور لے لی، سہل انگاری سے گھاٹ پر پڑے رہے تو پھر جاگنا بے سود ہوگا کیونکہ اسوقت تک آپ کا سب کچھ غائب ہو چکا ہوگا۔ ہندوؤں کی مذہبی رواداری مشہور ہے۔ مذہبی مزاحمت انکے یہاں ممنوع ہے۔ یہ موقع ہے کہ ہم اس رواداری کا اظہار کریں۔ اور پھر پچھتانا اور ہاتھ ملنا بے سود ہوگا۔

پریم چند

میرابائی

(۱)

میرابائی[1] جودھپور کے راٹھور خاندان سے تھی اور اودے پور کے سیسودیا خاندان میں مہارانا سانگا جی کے ولی عہد بھوج راج کے ساتھ بیاہی تھی۔ یہ رتن سنگھ کی اکلوتی بیٹی تھی اور کرکی میں تقریباً ۱۴۹۸ء میں پیدا ہوئی تھی۔ بچپن ہی کے زمانہ میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ جب یہ حال دودا جی کو معلوم ہوا تو اپنے پاس بلا لیا اور بڑے لاڈ پیار سے پرورش کی۔ جب اسکی عمر تقریباً ۱۶ سال کی ہوئی تو رتن سنگھ نے ۱۵۱۶ء میں رانا سانگا کے لڑکے بھوج راج سے شادی کر دی اور یہ اپنی سسرال چتوڑ چلی گئی تھی۔

ٹاڈ راجستان میں میرابائی کو راجا کنبھا کی بیوی لکھا ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ رانا کنبھا تو میرابائی کے شوہر کے دادا تھے۔ اور میرابائی کی وفات سے ۲۵-۳۰ برس پہلے مر چکے تھے۔ پنڈت گوری شنکر صاحب کا یہ خیال ہے کہ چتوڑ کے قلعے پر کنبھ شام جی کا مندر رانا کنبھا کا بنوایا ہوا ہے۔ اسکے پاس ایک اور مندر ہے جسکی تعمیر میرابائی سے منسوب ہے۔ ان دونوں کے پاس پاس ہونے سے شائد ٹاڈ صاحب نے دھوکا کھایا ہو۔

میرابائی کی شادی رتن سنگھ نے بھوجراج سے اس امید پر کی تھی کہ آگے چلکر میرابائی ملک سلطنت بنیگی مگر افسوس قسمت میں اور ہی کچھ لکھا تھا۔ میرابائی عین عالم جوانی میں دنیا کے سارے آرام و آسائش سے دست بردار ہو گئی۔ یعنی اُسکے شوہر نے ہمیشہ کے لئے اُسکا ساتھ ٹھنڈا کر دیا۔ راجپوتانہ کے تاریخ کی تاریکی کچھ ایسی ہے کہ باوجود تلاش بسیار کنور بھوجراج کی وفات کی صحیح تاریخ نہیں ملتی، مگر گمان غالب ہے کہ ۱۵۱۶ء اور ۱۵۲۶ء کے اندر اندر یہ سانحہ پیش آیا ہے۔

میرابائی کو شوہر کے انتقال کا سخت صدمہ ہوا۔ مگر بہت جلد حقیقت میں نگاہوں کے سامنے سے

---

[1] اس مضمون میں منشی دیبی پرشاد صاحب کی تحقیقات اور کرنل ٹاڈ راجستان، میرابائی کا جیون چرتر، بھگت مال وغیرہ وغیرہ سے مدد لی گئی ہے

پردہ ہٹ گیا۔ دنیا کی فانی لذتوں کا انجام معلوم ہوگیا، اور ابدی خوشی اور راحت کی جستجو کرنے لگی۔

لڑکیوں کو عموماً گڑیوں کا زیادہ شوق ہوا کرتا ہے بچپن میں اسے بھی بہت شوق تھا۔ یہ گردھر لال (سری کرشن جی) کی چھوٹی مورت کو کپڑے گہنے پہنا کر اُنسے کھیلا کرتی تھی۔ یہ کھیل رفتہ رفتہ شوق و عشق کے درجہ پر پہونچ گیا۔ شادی کے بعد یہ میکے سے جہاں اور بہت سے سامان لائی۔ سری کرشن جی کی مورت بھی لائی۔ بچپن کا کھیل عقیدت سے بدل گیا۔ اور یہ سچے دل سے سری کرشن کی پرستش کرنے لگی، انجام کار پرستش میں عشق کی جھلک نمودار ہوئی۔ شوہر کے مرنے کے بعد ساری دنیا سے دل بیزار ہوگیا تھا۔ محبت ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر سری کرشن جی کی بھگتی میں لگ گئی اور میرابائی اسی کو اپنی نجات کا سبب سمجھنے لگی۔

طبیعت شاعرانہ پائی تھی اور ساتھ ہی ساتھ گانے کا بھی شوق تھا۔ پوجا کرتے کرتے عالم استغراق میں مورت کے گرد رقص عاشقانہ کرنے لگتی اور دنیا کی سُدھ بُدھ باقی نہ رہتی۔

میرابائی کا بیوہ ہونا خاندان کی تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ رانا سانگا نے ۱۵۲۶ء میں بابر پر چڑھائی کرکے شکست کھائی۔ جس میں میرابائی کے باپ اور راؤ جی جودھ پور کے راؤ کی طرف سے مدد میں آئے تھے کام آئے۔ ۱۵۲۷ء میں خود رانا سانگا بمقام ایرچ ضلع بندیل کھنڈ بیمار ہوکر راہی عدم ہوا۔ مرنے کے بعد تین لڑکوں رتن سنگھ، اودے سنگھ۔ اور بکرماجیت (جو میرابائی کے شوہر بھوج راج کے بھائی تھے) میں سے دو دعویدار سلطنت رتن سنگھ اور بکرماجیت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رتن سنگھ چتوڑ میں باپ کی گدی پر (۱۵۲۷ء میں) بیٹھ گیا۔ اور بکرماجیت رنتھنبور کے ضلع کا مالک ہوگیا۔

اس جھمیلے میں رانا رتن سنگھ اور بوندی کے داؤ سورج مل سے (جو بکرماجیت کے ماموں تھے) بگاڑ ہوگیا اور ایک نے دوسرے کو ۱۵۳۱ء میں بوندی کی سرحد پر جہاں رانا رتن سنگھ شکار کے بہانے سے سورج مل پر چڑھائی کرکے گئے تھے مار ڈالا۔ اس حادثہ کے بعد تمام سردار رنتھنبور گئے اور وہاں سے بکرماجیت کو لاکر گدی پر بٹھایا۔

(۲)

کرشن جی کی سچی بھگتی اور روحانی ترقی نے میرابائی کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا اب وہ پہلی سی میرابائی نہیں رہی۔ وہ راجہ کے محل میں ہے مگر دل فقیرانہ ہے۔ وہ دن دن بھر مندر میں

بیٹھی گاتی اور عالم بیخودی میں رقص کرتی رہتی ہے۔ وہ ایک بیخود اور دیوانہ ہے جسکو نہ پرائی آن بان کی پروا نہ دنیا کی ہنسی کا خوف۔ مشک اور عشق چھپتے نہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اُسکی شہرت ہوگئی۔ دور دور سے سادھو سنت اُسکے درشن کو آنے لگے۔ میرابائی اُنکی خاطر کرتی۔ اُنکے ساتھ بھجن گاتی اور عرفان کے مزے لوٹتی۔ سادھو سنتوں کی سنگت اُسکی روحانی خوشی کا سبب تھی مگر چشم ظاہر بیں اُسکو بُرا اور کلنگ کا ٹیکہ سمجھتی تھی۔

رانا جی کو بھی سادھو سنتوں کی بھیڑ بھاڑ اور میرابائی کی آؤ بھگت بُری معلوم ہوتی تھی۔ اس بات کی کوشش کی گئی کہ وہ اس حرکت سے باز آئے مگر کامیابی نہ ہوسکی۔ پھر سختیاں شروع کی گئیں مگر اسپر بھی کچھ نہ ہوا۔

جب رانا جی نے دیکھا کہ سمجھانے بجھانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا تو اپنے مصاحبوں کی صلاح سے اُس پھول سے زیادہ نازک اور جان سے زیادہ قیمتی ہستی کے مٹانے کی تجاویز سوچنے لگے۔ پہلے تو پھولوں کی ڈالیوں میں سانپ بچھو چھپا کر بھیجے مگر جب اس سے بھی مطلب نہ حاصل ہوا تو ایک پیالہ زہر ہلاہل کا تیار کرکے بھیجا کہ یہ "چرنامرت" ہے۔ پی لو۔ چرنامرت کا نام سُنکر میرابائی زہر کے پیالے کو امرت کی طرح پی گئی۔

اب مختلف روائتیں ہیں کوئی کہتا ہے کہ زہر نے کام تمام کردیا اور کوئی کہتا ہے کہ اُسکا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اور وہ میڑتے میں اپنے چچا بیرم دیوجی کے پاس چلی آئی۔ میرابائی میڑتے میں رہتی بھی۔ بیرم دیوجی اور اُنکے کنور جے مل جی اُسکی بڑی خاطر کرتے تھے۔

وہ جس محل میں کرشن جی کی مورت کی پوجا کرتی تھی وہ چترر بھج جی کے مندر میں شامل ہے اور گردھر لال جی کی وہ مورت بھی اسی مندر میں موجود ہے۔

میرابائی کے پاس سادھو سنتوں کے آنے جانے کی دیکھ بھال میڑتے میں بھی ویسی ہی ہوتی رہی جیسی چتور میں ہوتی تھی۔ اور یہ میرابائی کو سخت ناگوار تھا۔ جب وہاں کی تکلیفیں بھی حد سے زیادہ گذر گئیں تو میرابائی درشن کے بہانے سے دوارکا چلی آئی اور پھر وہاں سے واپس نہ ہوئی۔

واپس بلانے کے لئے بہت سی تدبیریں کی گئیں مگر بے سود۔ آخر تھوڑے سے برہمن بھیجے گئے جنھوں نے جاکر کہا کہ اگر آپ نہیں چلیں گی تو ہم لوگ بھی فاقہ کرکے مرجائیں گے۔ اُنکا جواب ان لفظوں میں

"میرا کے پربھو گردھر ناگر بل بچھڑن مت کیجو جی"

اور کرشن جی کی مورتی میں سما گئی۔ اس واقعہ کو ۱۵۶۳ء کا بتلاتے ہیں۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ میرابائی کی وفات دوارکا میں ہوئی۔ غرض ایک عاشق صادق کا جو انجام ہونا چاہیے وہی ہوا۔ اب ہم مختصراً نمونہ کلام پیش کرکے ناظرین سے رخصت ہوتے ہیں۔

—•×۳×•—

جس طرح میرابائی کا مفصل اور صحیح صحیح حال ملنا ناممکن ہو رہا ہے۔ اسی طرح اسکا کلام بھی سادھو سنتوں کے کلام میں ایسا گڑبڑ ہو گیا ہے کہ اسکا الگ کرنا دشوار ہے۔ بہت سی بھجنیں ایسی ہیں جو دوسرے سادھو سنتوں کی کہی ہیں جس میں انھوں نے میرابائی کا تخلص ڈالدیا ہے۔ مگر پھر بھی اہل ذوق دونوں میں کافی امتیاز کر سکتے ہیں۔ میرابائی کی بھجنیں سری کرشن جی کے عشق میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور انمیں ایک خاص جذب و کشش موجود ہے۔ مثلاً

وہاں نہ بھاوے، نیند نہ آوے، برہ ستاوے موہے
گھائل سی گھومت پھروں مرا درد نہ جانے کوئے

یعنی فراق دوست میں مجھکو سامان عیش سے نفرت ہو گئی ہے، نہ غذا مرغوب ہے، نہ نیند آتی ہے۔ کسی کو میرے درد کی خبر نہیں اور حال یہ ہے کہ مجھے درد عشق نے بسمل بنا دیا ہے جیتی پھرتی ہوں مگر اس طرح جیسے کوئی چوٹ کھایا ہوا شکار مضطرب الحال ہو۔

یہ ہیں عاشقانہ جذبات اور اظہار بیتابی عشق، جسپر ہندی شاعری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرابائی کا عشق کیسا عشق تھا، اسکے دل میں درد، درد میں اضطراب، اور اضطراب میں وہ لذت تھی جو عشق صادق کے لئے مخصوص ہے۔

خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے عشق کی چھ علامتیں لکھی ہیں، انمیں سے تین نشانیاں یہ ہیں، کم خوردن و کم گفتن، و خفتن حرام، اس معیار پر میرابائی کے جذبات کو پرکھو تو معلوم ہوگا کہ اسکی روحانی بیتابیاں عشق کے کس درجہ پر تھیں۔

قیس عامری نے ایک شعر میں اپنی دلی بیتابیوں اور رسوائیوں کا نہایت دردناک طریقہ سے اظہار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ "ملامت کرنیوالیاں مجھے ملامت کرتی ہیں در آں حالیکہ دردت بھ

سوتی ہیں اور مجھے نیند نہیں آتی۔

حقیقتاً نیند نہ آنا عاشقی کی شان ہے، جن آنکھوں میں خیالِ دوست ہو اُسمیں نیند کی گنجایش کہاں۔ کسی ہندی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ جن نینن میں پیا بست ہوں دوجا کون سمائے۔ میرابائی کا یہ دوہا بھی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

جو میں جانتی اے سکھی کہ پیت کیے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پھیرتی کہ پیت کرو مت کوئے

کیا عشق کی ناکامیوں اور مجبوریوں کی اس سے بہتر تصویر کھینچی جا سکتی ہے وہ کہتی ہے کہ اے سکھی اگر مجھے انجامِ محبت کی خبر ہوتی اور یہ معلوم ہوتا کہ اُسمیں دُکھ ہوتے ہیں تو میں ملک میں منادی کرا دیتی کہ کوئی محبت نہ کرے۔

شانِ عاشقی کو تو ملاحظہ فرمائیے، دوسروں کو ہدایت ہوتی ہے کہ عشق نہ کرنا، مجھے دیکھو کہ کس طرح دُکھ پہ دُکھ سہہ رہی ہوں، ہائے کون جانتا ہے کہ ان دُکھوں میں کتنی راحتیں نہاں ہیں ایک فارسی شاعر بھی اسی مفہوم کو نہایت کامیابی سے ادا کر گیا ہے۔

اگر دانستم از روزِ ازل داغِ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغِ آشنائی را

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ بھی نہایت لطیف پیرایہ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

مگر سچ تو یہ ہے کہ میرابائی کے دوہے میں جو لطافت ہے وہ ان فارسی کے شعروں میں نہیں، خواہ اسکا یہ سبب ہو کہ ہندی زبان ہی نفسِ جذبات کے اظہار کے لئے خصوصیت سے موزوں ہے، یا یہ کہ ہندی شاعری میں عموماً صنفِ نازک کی طرف سے عشق اور جذباتِ عشق کا اظہار کیا جاتا ہے، چونکہ عورت کا دل عشق و محبت کا خزانہ ہے، اسلئے اُسکے جذبات عاشقانہ بھی دلکش ہوتے ہیں۔ اُردو زبان میں بھی اس قسم کے شعر ملتے ہیں مگر کسی قدیم شاعر کا یہ شعر مشہور ہے۔

نہ تھا معلوم اُلفت میں کہ غم کھانا بھی ہوتا ہے ۔۔۔ تڑپنا، تلملانا، دل کا گھبرانا بھی ہوتا ہے

اِس شعر میں صرف تصویر کا ایک رُخ نظر آتا ہے) ایک جذبہ ہے مگر نامکمل، ایک درد ہے، مگر بے اثر۔ اسمیں صرف اپنی بیتابیوں کا اظہار ہے۔ برخلاف اسکے ہندی دوہے میں اپنے مصائب کو پیش کرکے دوسروں کو سبق دیا گیا ہے۔

اِسی مضمون کو ہمارے دوست جناب اثر لکھنوی نے کچھ ایسے دلکش انداز میں بیان کیا ہے، کہ میرابائی کے دوہے کا لطف آجاتا ہے، زبان کی صفائی، بندش کی چستی قابلِ داد ہے۔

روگ ہیں جان کو دنیا بھر کے ہم تو بچتائے محبّت کر کے

میرابائی کا کلام فراق کی بیچینیوں، وصال کی تمناؤں، عاقبت کے خوف، نفس کی سرکشی، کرشن جی کی تعریف کا بے نظیر مرقع ہے۔ سادہ اور دلکش لفظوں میں جذبات دلی اور واردات قلبی کا اظہار جس خوبی سے کیا گیا ہے یہ اُنھیں کے کلام کا حصّہ ہے۔

ہم ذیل میں اُسکے کلام کا تھوڑا سا انتخاب ناظرین زمانہ کی تفریح طبع کے لئے پیش کرتے ہیں۔

۱

رام نام رس پیجے منوا — رام نام رس پیجے
تج کو سنگ ست سنگ بیٹھ نت — ہری چرچا سن لیجے
کام کرودھ[1] مد[2] لوبھ[3] موہ[4] کو — چت سے بہائی دیجے
میرا کے پربھو گردھر ناگر — تاہی کے رنگ بھیجے

۲

گھڑی اک ناہیں آدرے — تم درسن بن موہے
تم ہو میرے پران جی — کاسوں جیوں ہوئے
دُکھان[5] نہ بھاوے نیند نہ آوے — برہ[6] ستاوے موہے
گھائل سی گھومت پھروں — میرا درد نہ جانے کوئے
دیوس تو کھائے گنوائے رے — رین گنوائے روئے
پران گنوائے جھورتان[7] رے — نین گنوائے روئے

---

[1] غصہ [2] گھمنڈ [3] لالچ [4] محبت [5] چھوڑ دینا [6] بھلانا [7] جدائی [8] دن [9] گزرنا

جو میں ایسا جانتی رے — پیت کئے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پھیرتی رے — پریت کرو مت کوئے
پنتھ نہاروں ڈگر بہوروں — اَوَدھی مارگ جوئے
میرا کے پربھو کب رے ملوگے — تم ملیسان سکھ ہوئے

۳

پیا اتنی بنتی سُن موری — کوئی کہو رے جائے
اورن سنگ رس بتیاں کرت ہو — ہم سے رہت چیت چور
تم بن مورا اور نہ کوئی — میں سر ناگت توَر
آون کہہ گئے ابہوں نہ آئے — دیوس رہے اب تھوڑ
میرا کے پربھو کب رے ملوگے — عرج کروں کر جوڑ

۴

میرا بیڑا لگا دے پار — پربھو جی عرج کروں چھوں
یا بھو میں بہت دُکھ پایو — سُنئے شوک نوار
اشٹ کرم کی طلب لگی ہے — دور کرو دُکھ پار
یو سنسار سب بہو جات ہے — لکھ چوراسی دھار
میرا کے پربھو گردھر ناگر — آوا گون نوار

۵

مہارُوں جنم مرن کو ساتھی — تھاں نے ناہیں بسروں پل رائی
تم دیکھیاں بن کل نہ پڑت ہے — جانت میری چھاتی
اونچے چڑھ چڑھ پنتھ نہاروں — روئے روئے انکھیاں رائی
یو سنسار سکل جگ جھوٹا — جھوٹا کل رشتا ناتی
دوؤ کر جوڑیاں عرج کرت ہوں — سُن لیجو میری باتی

گجراتی مدد پناہ مدد کرنی ہمیں مدد رنیا مدد شبہ مدد آٹھ مدد ضروریات رکھنا۔ پنیا سونا۔ جاگنا۔ اوادھ دیا گیا۔ جنم سے بچا پیدا ہونا۔ مرنا مدد ہمارا

یو من میرا بڑو حرامی جیوں مدماتیو ہاتھی
ست گرو دشٹ دھرن یو سراوپر انکس دے سمجھاتی
میرا کے پربھو گردھر ناگر ہری چرنا چت راتی
پل پل تیرا روپ تیہاروں نرکھ نرکھ سکھ پاتی

(۶)

سوامی سب سنسار کے ہو سانچے شدی بھگوان
استھاور جنگم پاوک پانی دھرتی بیچ سمان
سودا ما کے دارد دکھ کھو یو بارے کے پہچان
دو مٹھی تنڈول کے چاہے دینی درب مہان
بھارت میں ارجن کے آگے آپ بھئے رتھوان
اُن نے اپنے کل کو دیکھا چھوٹ گئے تیر کمان
نا کوئی مارے نا کوئی مرتا تیرا یہ اگیان
چیتن جیو تو اجر امر ہے یہ گیتا کو گان
مجھ پر تو پربھو کرپا کیجے بندی اپنی جان

میرا گردھر سرن تمہاری
لگے چرن میں دھیان

لہ ہاتھ ۲ لگائی ۳ غیرتی روح ۴ ذی روح ۵ آتش ۶ چاول ۷ ضعیف نہیں ہونے والا ۸ غیر فانی

منظور الحق کلیم اعظمگڈھی

عقل کے اجزا

ہم مان لیتے ہیں کہ ہر انسان علی قدر مراتب عقل رکھتا ہے۔ یا یہ کہ کوئی انسان ودیعت عقل سے خالی نہیں۔ عقل کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسا جوہر ہے جو ادراک حقائق میں لگا رہتا ہے اور اسمیں بھی بحث ہے کہ عقل جوہر ہے یا عرض۔ بعض کہتے ہیں کہ عقل جوہر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عقل عرض ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ عقل مادی ہے یا مادی اجزا کے امتزاج اور تحلیل سے وجود پذیر ہوتی ہے تو ماننا پڑیگا کہ عقل عرض ہے۔ اور اگر مادیت یا مادیت کے اجزا سے وہ کوئی واسطہ نہیں رکھتی تو یہ کہنا پڑیگا کہ وہ ایک جوہر ہے اور ایسا جوہر جو حادث ہے۔

جوہر قائم بالذات ہے اور عرض قائم بالغیر، جیسے کپڑا اور رنگ، کپڑا جوہر ہے اور رنگ عرض۔ کپڑے اور رنگ میں تمیز بسہولت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم عقل کی بحث میں ایسی تمیز چاہیں تو نہیں ہو سکتی۔ یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ جب جسم عنصری نہیں رہتا تو عقل بھی نہیں رہتی۔ یا جب جسم عنصری اور حواس باطنی ماؤف ہوتے ہیں تو عقل بھی ماؤف ہو جاتی ہے، کیا یہ حالات ہمیں اس مرحلہ پر نہیں پہنچا سکتے کہ عقل ایک زائد قوت کا نام ہے۔

اگر ہم گلاب کو دور ہی سے دیکھیں اور سونگھیں نہیں تو ہم خوشبو اور بدبو کا احساس نہیں کر سکتے۔ رنگت تو ہمارے احساس میں آ سکتی ہے قطع وضع کا تو ہم احساس اور ادراک کر سکتے ہیں۔ لیکن خوشبو یا بدبو کا احساس نہیں کر سکتے۔ اگرچہ خوشبو یا بدبو پھول کی پنکھڑیوں اور رگ و ریشہ میں بھی سمائی ہوتی ہے مگر سوائے قوت شامہ کے اسکا احساس مشکل ہے۔ کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسی طرح عقل بھی سارے جسم اور ساری قوتوں اور جذبات میں بسی ہوئی ہے۔ اور جبتک عملی رنگ میں اسکا اظہار ہو یا اُس سے ہم کام نہ لیں تب تک ہم اُس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اگر انسانی مادیت ہی کا عقل ہی ظہور ہے اور کوئی جداگانہ قوت نہیں ہے تو سمائی مادیت کے

ابق ہی اسکا احساس اور ادراک بھی ہوگا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسکا پیمانہ اور اسکی رفتار کچھ ایسی
ع ہوئی ہے کہ ہم ٹھیک طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادیت سے اُسکا کہاں تک واسطہ اور کیسی
بستگی ہے۔

حافظہ اور ادراک بھی دو قوتیں ہیں اُنکی ہستی بھی ایسی ہی درخشاں اور ثابت ہے جیسی
ل کی۔ لیکن اب تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ حافظہ اور ادراک کیا ہے۔ اور ان دونوں کا
ی مقام اور مستقر انسانی جسم میں کہاں ہے۔ اسی طرح ارادہ بھی ایک بڑی طاقت ہے جو عقل
ی غالب ہے۔ اُسکی نسبت بھی ابتک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ کس مقام اور کس مستقر سے ظہور پذیر
نا اور اپنے زبردست تصرفات اور تاثیرات سے عقل اور جذبات کو متاثر اور مرعوب کرتا ہے
سفروں کی بڑی بڑی اور مضبوط کوششیں اور روشن تر مقولات بھی ان مشکلات پر روشنی
ں ڈال سکے۔ ہمارے پاس ایسی مدتوں کی تحقیق اور تدقیق کے واسطے خود ہمارے وہی افعال
تصرفات و تاثرات ہیں جو شب و روز ان قوتوں کے تحت میں ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔
ہم اُنکا نام حافظہ۔ ادراک عقل اور ارادہ رکھتے ہیں۔

اِن سب قوتوں کی رفتار جب کبھی متوازی یا متوالی ہوتی ہے تو بعض وقت ایک مشکل
ے ساتھ ہمیں یہ پتہ بھی لگتا ہے کہ انکا آپسمیں کیا اور کیسا واسطہ ہے اور ایک کا فرد دوسرے پر
کچھ پڑتا ہے اور ان کے افعال ایک ہی وقت میں شروع ہوتے ہیں یا انمیں کچھ وقفہ بھی ہوتا
ہے یا سب کام ایک ہی قوت کرتی ہے۔ اور ایک ہی قوت کی مختلف صورتوں اور متوالی
عمال کا نام ہی مختلف قوتوں کے اختلاف اور مختلف اسماء کی وجہ ہے۔ اِن سب قوتوں کے
عمال اور تاثیرات یا تصرفات ایک ہی قسم کی کیفیات ہوتی ہیں۔ بعض وقت اُن میں اِس
و سے تمیز کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ انکا باہمی افعالی اور تصرفاتی پہلو سے کیا کچھ تعلق اور واسطہ
ہے۔ بیشک چند قرائن سے ہم یہ تمیز تو کرسکتے ہیں یا ایسی تمیز کرنے کے مدعی تو ہوتے ہیں لیکن
بعض اوقات ایسے قرائن ہمیں کسی یقینی مرحلہ پر پہونچانے کے واسطے کافی نہیں ہوتے ہم بعض اوقات
ہی قوت اور ایک خصوصیت کے ساتھ عقل سے کام لیتے ہیں۔ لیکن وہی عقل کبھی ہمیں
رفتہ دوسری طرف لیجانے کی کوشش میں بھی لگ جاتی ہے اور ارادہ [illegible]

بھی ایسا مزاحم ہوتا ہے کہ عقل اپنی جگہ چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے وہ قوتِ ادراک جسپر ہمیں بہت کچھ فخر ہے خاموشی سے عقل کی بے بسی اور ارادہ کی سینہ سوزی دیکھ کر بھی قدم نہیں اُٹھاتی یہ کوائف اور یہ حالات سوچنے والے کے واسطے بہت کچھ حیرت کا موجب ہوتے ہیں اور تعجب یہ ہے کہ اگر ان سب سپاہ کی پشت پناہ تخیّل نہو تو انمیں سے کوئی قوت بھی پیش قدمی نہیں کر سکتی تخیل کی چھاؤنی میں ہی انھیں جگہ اور پناہ ملتی ہے اور اُسی میگزین سے انھیں ہر ایک قسم کا ابتدائی سامان بھی بہم پہونچایا جاتا ہے۔

جب یہ قوتیں تخیل کی رہنمائی لیکر میدانِ عمل میں آتی ہیں تو تہیۂ اسباب کی مشکلات سے ایک اور مقابلہ ہوتا ہے۔ بعض وقت اسباب کا تہیّہ یہاں تک دشوار اور مشکل ہو جاتا ہے کہ اس ساری سپاہ کو ناچار مایوس ہو کر یا ہزیمت اُٹھا کر تخیل کے حضور میں حاضر ہو کر اپنی مجبوریوں کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ اس مرحلہ پر پہونچ کر عقل کو اپنی رسائی اپنی قوّت ادراک کو اپنی ذہانت اور ارادہ کو اپنے عزم اور اپنی استقامت کا زور اور نرخ معلوم ہو جاتا ہے۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہر شئے بغیر کسی ارادہ کے خود بخود ہی ضرورت کے وقت وجود میں آجاتی ہے۔ اگر ان قولوں کے شاندار کیمپ میں جا کر دیکھا جائے تو پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ یہاں ارادے اور ضرورت کے ہونے پر بھی بعض اوقات اشیاء مطلوبہ کا تہیّہ نہیں ہو سکتا عقل اور ارادہ متفق ہو کر جو مہم اختیار کرتے اور جس غرض سے یورش کرتے ہیں۔ بعض وقت تہیّہ اسباب پر بھی اُنکی تکمیل نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے نزدیک جب مادّہ خود وقت اور ضرورت پر ایسا تہیّہ اور ایسا سامان کر دیتا ہے اور مادّہ کو ساتھ ہی بے شعور اور بے عقل بھی تسلیم کرتے ہیں تو جب خود عقل اور ارادہ ہی قاصر رہتا ہے تو یہ بے عقل عنصر کیونکر یہ مہم سر کر سکتا ہے بعض کا قول ہے کہ حیات اور عقل مادّہ کے متحرک اجزا اور اُسکے عناصر ممتزجہ کے تاثرات اور تصرفات کا نام ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر عقل کی ہزیمت مشکوک ہے۔ کیونکہ جب مادّہ کے محرکات کا ہی یہ اثر ہے تو اُسکی کامیابی کو کون روک سکتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسپر بھی عقل محدود ہے۔ بیرونی حملہ تو جدا رہا ارادہ کے مقابلہ میں بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ یہ تعجب ہے کہ مادّہ خود بے شعور اور بے عقل ہو اور اُسکی تحریکات سے حیات اور عقل ایسی زندہ اور

عقل ہستیاں پیدا ہوسکیں

عقل ارادہ کے مقابلہ میں ہی شکست نہیں کھاتی بلکہ اکثر اوقات ذوق کے مقابلہ میں بھی کم ٹھہر سکتی ہے گو ذوق بھی ایک قسم کا ارادہ ہی ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اُسکی رفتار اور اُسکے عزم ارادہ سے بھی زیادہ تر بلند اور پختہ ہوتا ہے۔ جسقدر تیزی سے ذوق کی رفتار ہوتی ہے عقل بھی اُسکی ریس کرتی اور اُسی کے نقش قدم پر چلتی ہے۔

وہ باتیں اور وہ تعبیرات مان کر بھی جو عقل کے متعلق کیجاتی ہیں ہمیں یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ وہ باوجود اس وجاہت اور عظمت اور اس شان کے بھی محدود ہے اور اُسکی رفتار تیز ہو کر بھی متہم پڑجاتی ہے۔ وہ باوجود صدہا دعاوی کے بھی بعض اوقات شکست کھاجاتی ہے وہ تیز بھی ہے اور سُبک رفتار بھی مگر اُسکی دوڑ محدود ہے اور اُسکی رسائی بعض وقت کُند بھی پڑجاتی ہے۔

بعض کے خیال میں عقل کے اجزا نہیں ہیں اور بعض کے خیال میں دو اجزا ہیں

(الف) فطری جو وجود کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔

(ب) کسبی جو کسب سے حاصل ہوتی ہے۔

ہم اس سے تو انکار نہیں کرسکتے کہ بچہ کی عقل ترقی کرتے کرتے بڑھتی اور بہت کچھ نشوونما بھی پاتی ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہر بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی عقل بھی ساتھ ہی لاتا ہے بچوں کی زندگی اور افعالِ زندگی اسقدر مبہم اور بے سروپا نہیں ہوتے کہ اُن سے اس بات کا فیصلہ نہ ہوسکے کہ عقل اُنکے ساتھ ہی آتی ہے یا کسب سے ملتی ہے۔ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نشوونما پاکر بچوں کے تجربوں اور مشاہدات میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک جداگانہ عقل بھی حاصل کرتے ہیں۔ بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو اُنکے بدن میں خون بھی ہوتا ہے۔ یا یہ کہ مواد خون بچے ساتھ ہی لاتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے خون بھی بڑھتا جاتا ہے یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ مختلف اغذیہ سے خلط خون میں ترقی بھی ہوتی ہے اور کمی بھی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ خون پیدائش کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

خون تو ایک خلطی عنصر ہے۔ عقل کو چاہے جو سمجھو اور چاہے عرض۔ وہ خون کیطرح

اغذیہ اور اکل و شرب کے تابع نہیں ہوتی۔ ہاں مشاہدات اور تجربوں کی اغذیہ سے ترقی پاتی ہے۔ بجاے اسکے کہ ہم یہ کہتے کہ ایک کسبی عقل بھی ہے۔ اگر یوں کہتے کہ عقل مشاہدات ما بعدی اور تجارب آیندہ سے ترقی کرتی اور نشو و نما پاتی ہے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ اگر آتش ہر جسم میں پائی جاتی ہے اور کرۂ ناری کام میں لانے سے ترقی پذیر ہوتا ہے تو ہمیں اس بات کے کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ عقل پیدائشی اور فطری ہو کر انسانی بلوغ اور انسانی تجارب اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ ہی ترقی پذیر ہوتی ہے گو انسانی جسم کی طرح ہر تیسرے یا ہر ساتویں سال اُسکی کایا پلٹ ہوتی رہے۔ لیکن ترقی اُسی مواد میں ہوتی ہے جو شروع سے انسان کو ودیعت کیا گیا ہے اور جو محض فطری ہی ہو سکتا ہے۔ اکتساب یا کسب سے عقل ترقی پذیر تو ہوتی ہے یا یوں کہہ لو کہ وہ ترقی تو پاتی ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی عقل کسبی بھی ہوتی ہے۔ ہاں یوں کہہ لو کہ کسب سے عقل میں ترقی ہوتی ہے اور اکتساب سے اُسمیں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اُسی مواد میں ترقی اور کشادگی ہوتی ہے جو فطرتاً ودیعت شدہ ہے۔

کسبی جُز اس جہت سے تو کسبی کہا جائیگا کہ بذریعہ اکتساب بعض امور میں عقل مدرک اور ماہر ہوتی ہے نہ اس جہت سے کہ وہ عقل ہی فطری عقل سے منفرد اور جداگانہ ہے اور دونوں عقلوں میں توافق اور تطابق نہیں ہے۔ بصارت وہی ہے جو آنکھوں میں ہوتی ہے لیکن دونوں آنکھیں مختلف مناظر اور منتشر مظاہر سے جو کچھ دیکھتی اور اخذ کرتی ہیں انمیں گونہ اختلاف ہوتا ہے۔ ہر شعاع اور ہر نور خارجی اُسی بصارت فطری میں منتقل اور مرتسم ہوتا ہے جو پہلے سے حاصل اور ودیعت شدہ ہے۔ یہی کیفیت نور عقل کی بھی ہے قوت احساس بچوں میں کچھ اور رنگ رکھتی ہے اور طفولیت سے گزر کر کچھ اور کیفیت، ترقی پذیر بھی ہوتی ہے اور تنزلزل پذیر بھی، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خاصۂ فطری کچھ اور ہوتا ہے اور خاصۂ کسبی کچھ اور۔

چونکہ عقل درجہ بدرجہ ودیعت ہوتی ہے اس واسطے درجہ وار ہی اُس سے کام بھی لیا جا سکتا ہے بچوں میں بھی درجہ وار عقل ہوتی ہے اگرچہ بہت سے بچے عقل میں یکسانیت

بھی رکھتے ہیں مگر پھر بھی تفاوت ہوتا ہے۔ بچوں کی زندگی بعض وقت جوانوں اور بوڑھوں کی زندگی سے بھی زیادہ تر سبق آموز ہوتی ہے۔ بچوں کے بعض افعال اور بعض حرکات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اُنسے پتا لگتا ہے کہ قدرت نے کس وسعت اور کس خوبی سے بچوں کو بھی زیورِ عقل سے آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیکھو بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اپنی مختلف حرکات اور افعال سے خواہ وہ اختیاری ہوں خواہ اضطراری، کیا۔ کیوں اور کس طرح کی فلاسفی کے متفنن اور متحقق ہوتے ہیں۔ ایک بچہ جب رات کو لیمپ اور چراغ اور صحن خانہ میں ماہتاب کی سہانی چاندنی اور چاند کو اور دن کو آفتاب کی روشنی دیکھکر منھ میں ننھی سی اُنگلی ڈال کر خوبصورت آنکھوں سے دیکھتا اور بار بار اپنے رنگ میں اشارے کرتا ہے تو ہر دیکھنے والا بشرطیکہ غور سے کام لے، بھانپ جاتا یا بھانپ سکتا ہے کہ یہ ننھی سی مخلوق اور نووارد مسافر یہ دریافت کرنے کی کوشش میں ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ کیا ہے۔ کیوں ہے اور کس طرح ہے گو وہ زبانِ قال سے یہ سوالات نہیں کر سکتا۔ اور نہ اِنپر روشنی ڈال سکتا ہے لیکن اُسکے دل و دماغ میں وہی سوالات متموّج ہوتے ہیں جو ایک بالغ اور تجربہ کار انسان ہی کبھی کبھی کیا کرتا ہے۔ کیا ان حرکات اور ان اشارات سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قدرت نے وجدانی طور پر اس بچے کی فطرت میں بھی وہی مواد بھرا ہے جو بڑوں بڑوں میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ فلسفہ کا شروع حیرت اور تعجب سے ہوا کرتا ہے کیا بچوں کا یہ تعجب دیکھنے والوں کو خاموشی سے بچوں کی زبانِ حال سے یہ پیغام نہیں دیتا بچے بھی وہی بات اور وہی جذبہ رکھتے ہیں جو بڑے بڑے رکھتے ہیں۔ بچوں کے دل و دماغ میں بھی وہی ولولہ اور وہی ذوق ہے جو ارسطو اور بقراط کے دل و دماغ میں بعہد طفولیت متموج اور جوش زن تھا مانا کہ ان حکیموں کا پیمانۂ دماغ اور وسعت دل کچھ اور ہوگی لیکن اس سے تو ہم انکار نہیں کر سکتے کہ بمصداق۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم اسکا کاریگر وہی تھا جس نے ارسطو اور بقراط کے دل و دماغ کو بنایا تھا۔ ہاں بفحوائے فضلنا بعضھم علی بعض تفاوت بھی ضرور ہوتا ہے آنکھیں جنھیں دی گئی ہیں اُنھیں نورِ بصارت بھی دیا گیا ہے۔ نظر کا تفاوت ضرور ہوتا ہے۔

اگر بچوں میں بھی اسی قسم کے جذبات اور قوتیں ہیں تو کیوں نہ کہا جائے کہ وہی جذبات اور وہی قوتیں رفتہ رفتہ نشو ونما پاکر ترقی پذیر ہوتی ہیں جس طرح ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ عقل فطری ہی ہوتی ہے چاہے کسی سن وسال میں ہو اور چاہے اسکے معلومات اور مدرکات کیسے ہی وسیع کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ عقل مختلف طریقوں اور مختلف پیرایوں سے ترقی پذیر ہوتی یا جدید معلومات حاصل کرکے اپنی وسعت کا ثبوت دیتی ہے۔ عقل تو وہی ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ ترقی پاتی جاتی ہے۔ کبھی اندرونی رنگ میں تموّج ہوتی ہے اور کبھی بیرونی اور کسی طور پر زید، اگر ایک طرف ریاضی میں مشق کرتا ہے تو دوسری جانب فلسفہ اور منطق میں بھی مہارت پیدا کرتا ہے۔ صرفی بھی ہوتا ہے اور نحوی بھی، مورخ بھی اور سائنس داں بھی، ہر حالت میں گو زید کے معلومات اور اکتسابات جداگانہ ہوتے ہیں لیکن ان سے زید کی شخصیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ اگرچہ عالم طفولیت میں زید صرف کہانیاں ہی سننے کا شوق و ذوق رکھتا تھا تاہم دوسرے دور میں وہ منطقی اور فلاسفر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ترقی علوم و فنون اُسکی شخصیت میں کوئی فرق نہیں لاسکتی۔

ع ہاں کاسہ ہاں آش

روشنی چاہے جس آئینہ اور جس ظرف اور جس مقام میں پڑے اور منتقل ہو روشنی ہی اسکو کہیں گے۔ ہاں مقام انعکاس اور مواقع انجلا جداگانہ ہونگے مکان کی تبدیلی سے مکین کی مقامی اور معلوماتی تبدیلی تو ہوتی ہے ذاتی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مختلف شیشوں میں دیکھنے سے (بشرطیکہ چہرہ اور بشرہ بدل نہ گیا ہو) چہرہ بدل نہیں سکتا وہی رہیگا چاہے آئینہ چینی ہو چاہے ہندی۔ جس طرح سب رنگ روشنی کے جاذب ہوتے ہیں اُسی طرح ہر ملکہ اور ہر قوت ہر رنگ میں عمل پذیر ہو سکتی ہے بشرطیکہ کوئی مزاحم اور دراندازنہو۔

چونکہ عقل کی اصلیت واحد ہے اگرچہ اسپر بھی وہ مدارج اور مراتب رکھتی ہے کسی میں کم ہوتی ہے اور کسی میں زیادہ اسواسطے وہ ہر رنگ کے کمالات اور معلومات میں ایک ہی عقل اور ایک ہی ملکہ و شعار ہوگی۔

سلطان احمد

فرانس کی ایک ملکۂ حسن

"ایک خوبصورت چین کا برتن" یہ تعریف تھی جو لوئی پانزدہم بادشاہ فرانس کی معشوقہ میڈیم ڈی پمپاڈور کے نسبت کیجاتی تھی - اسکی پتلی کمر پر ایک نفیس اور خوشنما لیس لگی ہوئی تھی جسپر آسمانی فیتہ کی گرہ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی اور یہی خاص چیز تھی جو اسکے نام کے ساتھ منسوب کیجاتی تھی اور اسی کی وجہ سے وہ "پمپاڈور" کہلائی جاتی تھی - بوٹا سا قد - گورا رنگ مگر دلفریب گلاب کی ہلکی سی رنگینی لئے ہوئے - اسکے ہاتھ خوش وضع اور بازو سڈول تھے - چہرہ کی ساخت دلربایانہ انداز رکھتی تھی - وہ اور حسن کی دیویوں کی طرح عالی خاندان نہ تھی - جین انٹوانٹ پائیسن کی اصلیت کا بہت کم لوگون کو علم ہے - ہم اتنا جانتے ہین کہ بچپن مین اسکی تعلیم و تربیت "یسولی نارمنڈ" کے سپرد تھی - گو جین کے بپتسمی نام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ پائیسن کی لڑکی تھی - مگر بہت ممکن ہی کہ وہ بھی اسکے والدین نہ ہون - بہرحال اسکی تعلیم اچھی ہوئی - اسنے علم موسیقی مین اچھی مہارت حاصل کی - ایک عمدہ مصوّر بھی تھی حقیقت مین اسکو آرٹ سے دلچسپی تھی اور آئندہ زندگی یعنی زمانۂ اقبالمندی مین اسنے آرٹ (آرٹسٹ) کے ساتھ بیحد ہمدردی ظاہر کی اور انکی ترقی کے لئے بہت کوشان رہی - آرٹ کی ترقی کے لئے بہت سے انعامات مقرر کئے - یہی وہ عورت تھی جسنے بمقام لورنائش مصوری کا سلسلہ قائم کیا - اگرچہ یہ بات تعجب خیز نظر آتی ہے اسلئے کہ اسکے نام کے ساتھ لفظ بیوقوف لگا رہتا ہے مگر اس بات کے ماننے سے بھی انکار نہین کیا جا سکتا کہ میڈیم ڈی پمپاڈور فن مصوری مین مستند مانی جاتی تھی اور اسکے پاس اس فن کے متعلق تین ہزار سے زیادہ کتابون کی لائبریری تھی

جب جین نے اُنیسوین سال مین قدم رکھا تو اسکی شادی مسیو لی نارمنڈ کے بھتیجے لی نارمنڈ کے ساتھ ہوگئی وہ اسے بیحد چاہتا تھا - ہر وہ چیز جو روپیہ سے مہیا کیجا سکتی تھی اسکے مہیا کرنے مین کبھی لی نارمنڈ نے کوتاہی نہین کی -

ایک عمدہ مکان تھا۔ بہت نوکر تھے۔ جواہرات اور قیمتی لباس بھی موجود تھے۔ خرچ کرنیکے لئے کافی دولت موجود تھی۔ رفتہ رفتہ جین کو بھی شوہر سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ اپنے معصوم لڑکی کی پرورش کرتی تھی۔ یہ ایک تعجب خیز بات ہے جسکا اثر جین کی آئندہ زندگی پر پڑا۔ فی الحقیقت یہ اُس پیشینگوئی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو جین کے لڑکپن کے زمانہ مین کی گئی تھی کہ جین بادشاہ کی معشوقہ بن کر سلطنت کرے گی۔

لوئی پانزدہم بادشاہ فرانس بھی ایک بادشاہ تھا جس سے وہ کچھ توقع کرسکتی تھی مگر بہت پیشتر جبکہ جین کی عمر صرف چار سال کی تھی اسکی شادی ہوگئی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ لوئی بدچلن اور عیاش تھا اسکی زندگی ایک فسانۂ غم اور عجیب عبرتناک زندگی ہے۔

اسے میری کے ساتھ بے انتہا محبت تھی۔ آخرکار اسنے میری کے ساتھ شادی کی حالانکہ میری عمر مین اس سے ۷ سال بڑی تھی۔ میری جلد ضعیف ہوگئی اور لوئی کی نگاہین اب بدلنے لگین۔ بظاہر وہ میری کا بہت پاس خاطر ملحوظ رکھتا تھا اسلئے کہ وہ نہین چاہتا تھا کہ اسکے اصلی الدون اور منتشر خیالات سے کوئی اور آگاہ ہو۔ جین کے متعلق بہت سے افسانے مشہور ہین۔ کہا جاتا ہے کہ اسکی مستقل مزاجی تھی جسنے بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسنے ہر شکار کی پارٹی مین شرکت کی وہ یا تو گلابی یا آسمانی لباس جسپر ایک عاشق حقیقی کے آسمانی پھول لگے ہوتے پہنکر جاتی تھی۔ لوئی پانزدہم کو اس سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی مگر میڈیم ڈی میلی (موجودہ منظور نظر) میڈیم ڈی ایٹائل کے طرز انداز کو سمجھکر وہ تاڑ گئی اور اسنے شکار کی پارٹیون مین شرکت کرنے سے اسکو روک دیا۔

میڈیم ڈی میلی کے مرنے کے بعد اسکی جانشین ایک اور میڈیم ہوئی۔ اسکی جانشین ایک اور ہوئی۔ مگر جین نے صبر کی باگ ہاتھ سے نہ چھوڑی وہ جانتی تھی کہ اسکی بھی باری آنیوالی ہے۔

تیئیس سال کی عمر مین جین نے ایک ناچ کی محفل مین شرکت کی جو ڈی دن ہوٹل مین منعقد ہوئی تھی۔ وہان لوئی بھی موجود تھا۔ لوئی اسوقت اکیلا تھا۔ اسکے ساتھ کوئی معشوقہ نہ تھی۔ اسکی آخری معشوقہ میڈیم ڈی چیاٹرو کو انتقال کئے ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے۔ اسنے تین مہینے تک اسنے سوگ کیا اور اسکے رنج و غم مین مبتلا رہا۔ اس دفعہ جین پر نظر پڑتے ہی وہ گرویدہ ہوگیا۔ اسکی ساحرانہ نظرون نے اسے مسخر کرلیا۔ نظر فیا بطبیعت اور انداز خاص نے اسے مفتون بنالیا۔ اسنے اس جدید معشوقہ کا

نام معلوم کرنے کی کوشش کی مگر اسمین ناکام رہا۔ جب وہ آسمانی گون والی ناچ گھر سے جانے کے لئے مڑی تو قصداً ہاتھ سے رومال گرادیا۔ بادشاہ نے اُسے اُٹھالیا۔ مصاحب محو حیرت ہو گئے جب اسکا مطلب سمجھ مین آیا تو انھون نے خوشی کے نعرے لگائے اور انھین اس نئی محبوبہ کا نام معلوم کرنے کی تشویش پیدا ہوئی۔

والیان ملک اپنی خواہشات پورا کرنے کے طریقے خوب جانتے ہین۔ چند دن کے بعد لوگون پر ظاہر ہو گیا کہ کوئی جوش و خروش کے ساتھ جین کی محبت کا دم بھر رہا ہے۔ لوئی کے طرز عمل سے یہ بات صاف عیان تھی کہ وہ ایک دوشیزہ سے محبت کر رہا ہے۔ جین بھی اسکا مطلب سمجھتی تھی اور دل ہی دل مین وہ اسے مسخر کرنے کے طریقے سوچ رہی تھی۔ گو بظاہر اسکے تبسم سے اسکی خوشی کا پتہ چلتا تھا مگر وہ بادشاہ کی ہر حرکت سے اسکی طبیعت کا اندازہ کر رہی تھی تاکہ وہ آسانی کے ساتھ بادشاہ کو زیر کرلے۔ لوئی فریفتہ ہو گیا مگر اس سے جین کی جستجو مین کسی قسم کی کمی نہین ہوئی وہ اپنی طرز گفتگو سے اسے خوش اور محظوظ کرتی مگر پھر یکایک بے پروائی ظاہر کرتی۔ ابتک لوئی کے ساتھ کسی نے اس قسم کا برتاؤ نہین کیا تھا۔ اسکی دل لگی اور وارفتگی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ اسکے خواب و خیال مین بھی نہین گذرتا تھا کہ وہی جین جو ایک خوشنما اور دلفریب گلاب کا پھول ہے خاردار بھی ہے۔ جین اُس باریک بینی و دقیقہ سنجی سے اسکے طرز عمل کو معلوم کرنا چاہتی تھی جسکی ایک سائنس دان کو ضرورت ہوتی ہے۔ جب وہ خرد بین سے مینڈک کا معائنہ کرتا ہے۔

اسنے بادشاہ کی دعوتین کین محفل رقص منعقد کی۔ بہرحال ہر طرح سے بادشاہ کو اپنا فریفتہ بنالیا۔ میڈیم کی فضول خرچی نے عوام الناس کو بہت برافروختہ کیا۔ اسلئے کہ وہ خراج ادا کرتے کرتے بالکل غریب ہو گئے تھے۔ اور رؤسا و درباری بھی جین کے عالی خاندان نہونے کی وجہ سے بہت مخالف تھے۔ جو جو اسکے بہی خواہ بنے ہوئے تھے وہ سب بڑے بڑے عہدون کے جویا تھے اور یہ ایک عام بات ہے کہ لوئی کے دربار مین جو لوگ بڑے بڑے عہدون پر مامور کئے گئے تھے وہ خود غرض مطلبی اور بے اصول تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو زوال شروع ہو گیا۔

میڈیم ڈی پمپاڈور نے بہبودی حکومت کے لئے چند اچھے کام کئے۔ اسے پیرس سے خاص الفت تھی اسکو ترقی دینے اور سجانے کے لئے بہتیری کوششین کین مختلف جگہ پر خوشنما

چھوٹے چھوٹے باغ بنوائے۔ محکمۂ حفظ صحت کو ایک عمدہ پیمانہ پر قائم کیا۔ بے روزگار مزدورون کی روزی کا بندوبست کیا۔ بہرحال وہ شہر پیرس کے لئے بہت مفید تھی۔ اور فرانس کے لئے ایک بدترین فرمان روا۔ ایک حد تک لوئی کو بہ نسبت کسی اور محبوبہ کے میڈیم پر زیادہ اعتماد تھا۔ یہ اعتماد محبت کی وجہ سے نہین تھا بلکہ وہ اسکی قوت استقلالی سے ڈرتا تھا۔

آخری عمر مین اِن مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے پراثر اور دردانگیز الفاظ مین وہ اعتراف کرتی ہے کہ اسکی تمام زندگی عجیب کشمکش اور خانہ جنگی مین گذری۔ اور یہ بات قابل یقین ہے اسلئے کہ اسکو اپنی حالت اور رتبہ کو برقرار رکھنے کے لئے نہ صرف بادشاہ بلکہ تمام اہل دربار سے لڑنا پڑتا تھا۔

بیالیس سال کی عمر مین اُسکا انتقال ہوا اور بہت بہادری سے موت کا مقابلہ کیا۔ مرنے کے وقت اسکی عجیب حالت تھی۔ بہت خوشنما ریشمی گون پہنے ہوئے تھی۔ عمدگی کے ساتھ بالون کا سنگھار کیا تھا۔ بھاری قیمتی جواہر پہنے ہوئے تھی جس طرح کسی عاشق زار کے استقبال کو بن سنور کر جانیوالی ہے۔ ۲۰ دن کی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے اس دنیا سے روانہ ہوئی۔ مگر اسوقت بھی اپنے لہجہ سے کسی قسم کی پریشانی کی علامت ظاہر نہ ہونے دی جس طرح زندگی خوشی کے ساتھ بسر کی تھی اسی طرح اس دنیا سے گذر گئی۔ اُسکی ہر ادا سے مصوری نمایان اور وہ خود گویا ایک متحرک تصویر تھی۔

میڈیم کو مرے ہوئے تین دن ہوگئے۔ لوئی ایک کھڑکی مین کھڑا ہوا میڈیم کی لاش کو گذرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس سخت دل اور نفس پرست کو اسکا کچھ بھی خیال نہین ہے۔ ساتھ ہی وہ ایک محبوبہ کے خیال مین غرق ہے۔ اسے صرف یہ تشویش ہے کہ کہین یارش مین میڈیم لامارکوئس (محبوبہ جدید) بھیگ نہ جائے۔ آہ زمانہ اس سے بڑھکر اور کسی نفس پرست۔ احسان فراموش سنگدل کی مثال نہین پیش کرسکتا۔ کل جسے میڈیم کا خیال سوہان روح تھا وہ آج اس طرح بیفکر اور انجان کھڑا ہوا ہے۔

میڈیم لباس لونی موجد ہے۔ تمام لوگ اس لباس کو پسند کرتے ہین مگر بہت کم ہین جو اس موجد کے نام سے واقف ہین اور اسکا نام معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہین۔

(ترجمہ) منعم (علیگ)

انصاف یا ظلم

لوگ مجھے شریمتی ساوتری دیوی کہتے ہین دنیا مجھے چاہے جو کچھ کہے لیکن مین تو نہ شریمتی ہون اور نہ دیوی۔ کیونکہ عصمت مآب ساوتری جان شوہر تھی اور مین شوہر کے محبت کی محتاج ہون مین اِس سے نفرت کرتی ہون ایسی حالت مین اپنا حال غم مین کیا لکھون۔

مین ہندی مڈل پاس ہون اور آٹھوین درجہ تک انگریزی بھی پڑھی ہون۔ کچھ کچھ سنسکرت اور اُردو بھی جانتی ہون۔ مین نے ہندو دھرم کے مطابق اپنے شوہر کی خدمت کی ہے، مین انجان نہین ہون، میری عقل مین فتور نہین، میری عمر اسوقت سترہ برس کی ہے۔ مین بخوبی جانتی ہون کہ میرے کیا فرائض ہین، مین نے پڑھا ہے، اور مین خوب سمجھتی ہون کہ کاہل اور بدکار شوہر کی بھی خاطر عورت کو کرنی چاہیے لیکن آج مین اپنے شوہر کی بُرائی کر رہی ہون۔

اے پرماتما! یہ کیسا بُرا وقت آگیا ہے نہین معلوم میرا کیا حشر ہوگا، زمین پھٹ جائے اور مین اُسمین سما جاؤن تو بہتر ہے۔ آسمان سے بجلی گرے اور میرے خرمن ہستی کو جلا کر خاک کر دے تو اچھا ہے۔

اپنے مزاج کے موافق اگر کسی عورت کو خاوند ملجائے اور پھر وہ قدرت ایزدی سے لنگڑا لولا اور ظالم ہوجائے تو عورت اس سے نفرت نہ کریگی، وہ اسکو اپنا جیون ادھار سمجھیگی وہ اسکو دیوتا سمجھکر اسکی پوجا کرے گی، لیکن ظالم ماں باپ اگر جان بوجھکر کسی لالچ مین ایک لائق کم سن لڑکی کا بیاہ کسی جاہل سن رسیدہ مرد سے کردین تو لڑکی کے دل مین اسکا ہمیشہ قلق رہیگا چاہے وہ زبان پر نہ لائے لیکن جب وہ جوان اور سمجھدار ہوجائیگی تو وہ اس بُرے رسم کی ضرور بُرائی کرے گی جسکی وجہ سے سکا ہمیشہ کے لئے آرام گیا اور اپنے زندگی کے ایام خون جگر پی پی کر کاٹے گی۔ لوگ اسے اچھی طرح سے سمجھ لین کہ ظلم۔ دباؤ اور جھوٹی لگاؤ لون سے

کوئی عورت اپنے شوہر پر فریفتہ ہو کر دل سے محبت نہیں کر سکتی جب تک دو دل ایک نہ ہون اس وقت تک الفت کے راگ نہیں گائے جا سکتے یون کہنے کو ہر عورت جس پر رات دن شوہر کے ظلم و ستم ہوتے ہین اپنے کو جان شوہر کہتی ہے۔ لیکن مین یقین کے ساتھ کہتی ہون کہ زمین و آسمان ایک ہو جائین مگر کوئی عورت ظالم، بدکار اور خود غرض شوہر کو دل سے پیار نہیں کر سکتی، جس عورت کی شادی کم سنی مین اپنی مرضی کے خلاف کسی سن رسیدہ مرد سے مال کے لالچ سے کر دی گئی ہے وہ اپنے شوہر پر جان نہیں دے سکتی وہ پیار کرنا تو درکنار اسکی صورت سے بھی بیزار رہے گی، جو عورت میرے اس دعوی کے خلاف رائے رکھتی ہے اُسکے دماغ مین ضرور خلل ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے معزز بھائی اور بہنین میری سوانح عمری کو پڑھکر بُرا نہ مانینگے بلکہ انصاف کر کے خدا لگتی کہین گے کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے یا نہین۔ اسی سلسلہ مین اتنا اور عرض کر دینا ضروری سمجھتی ہون کہ بہنین میرے لایق شوہر کی باتون کو سُنکر مضحکہ نہ اُڑائین گی بلکہ اس سے نصیحت حاصل کرین گی۔

میرا گھر لکھنؤ مین ہے اور سسرال بمبئی مین۔ آجکل مین اپنے سسرال مین ہون اور اپنی بند کوٹھری یعنی قید خانہ مین بیٹھی ہوئی یہ داستانِ غم لکھ رہی ہون۔ میرے ماں باپ زندہ ہین۔ میرے والد ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن اب پنشن پاتے ہین۔ مین انکی اکیلی لاڈلی لڑکی ہون، میرے والد نے مجھے بڑی محنت سے پڑھایا تھا۔ اسکول کی بڑی اُستانی جی کو میرے ساتھ اسقدر الفت تھی کہ اب بھی اُنکے محبت سے بھرے ہوئے نصیحت آموز خطوط میرے پاس آتے ہین۔ اُستانی جی اکثر فخریہ کہا کرتی تھین کہ ساوتری بہت ذہین اور سلیقہ شعار ہے۔ مین اپنا سبق بہت جلد یاد کر لیتی تھی۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے ہر امتحان مین میرا نمبر اول ہی رہا۔ میری سُریلی اور ملائم فریب آواز کی بھی اُستانی جی بہت تعریف کرتی تھین۔ جسوقت مین ہارمونیم پر گاتی تھی اُسوقت سب لڑکیان اور اُستانی جی ٹکٹکی باندھ کر حسرت سے میری صورت کو دیکھا کرتی تھین۔ ایک سماں بندھ جاتا تھا یہانتک کہ مین خود بھی بیخود ہو کر جھومنے لگتی تھی۔ مجھے دو بار نظر لگی اور مین تین بار بیمار ہوئی لیکن لعنت ہو

اس زندگی پر کہ مری ایک مرتبہ بھی نہین - مجھے بیل بوٹون کے کاڑھنے اور سینے پرونے مین کئی مرتبہ انعام ملے تھے - دنیا مین بہت کم کسی کی امید برآتی ہے - جب کوئی ہنسا ساتھ ہی آنسو نکل آئے - مین نے پندرھوین سال ہی مین قدم رکھا تھا کہ میرا بیاہ ہوگیا -

میرے والد کو میرے لئے شوہر تلاش کرنے مین دو مصیبتون کا سامنا ہوا - پہلی مصیبت تو یہ تھی کہ بہت زیادہ جہیز نہ دے سکتے تھے لیکن یہ مشکل کچھ زیادہ تکلیف دہ نہ تھی کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ میری خوبصورتی، قابلیت، گانے اور سینے پرونے پر بہت سے سندیافتہ امیرزادے فریفتہ تھے - اِن مین سے بہت سے ایسے بھی تھے جنکو اپنے مان باپ کی دلشکنی منظور تھی لیکن جہیز لینے کے لئے وہ تیار نہ تھے - الہ آباد یونیورسٹی کے ایک ایم - اے پاس رئیس زادے نے میرے والد کو اس مضمون کا خط لکھا تھا -

> اگر آپ مجھکو اپنا داماد بنالین تو مین اپنا گھربار اور مان باپ کو بھی چھوڑ سکتا ہون لیکن اسکو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے میری درخواست منظور نہ کی تو مین ریل کے پُل پر سے گنگا جی مین گود کر اپنی جان دیدونگا اور اسکا عذاب آپ کی گردن پر ہوگا وغیرہ وغیرہ -

معلوم نہین آپ نے اپنا عہد پورا کیا یا نہین کیونکہ مین نے اخبارون اور رسالون مین اپنی شادی کے بعد آپ کے ڈوبنے کی خبر کبھین نہین پڑھی -

بہرحال جہیز کا سوال تو معمولی تھا - لیکن دوسری مشکل ایسی تھی جس نے میری زندگی تباہ کردی اور مجھے زندہ درگور کردیا - میرے والد کو سرکار انگلشیہ نے "رائے صاحب" کا خطاب دیا تھا - ہائے بس اسی خطاب یا "رائے صاحب" نے میرے حسرت وارمان کا خون کردیا اور میری خوشیون کو ہمیشہ کے لئے خاک مین ملادیا - والد صاحب کی خواہش تھی کہ زیادہ جہیز بھی نہ دینا پڑے اور شوہر کا خاندان بھی خطاب یافتہ ہو - تلاش کرتے کرتے بمبئی مین ایک رائے صاحب والد کے حسب منشا مل گئے - چونکہ رائے صاحب کی تیسری شادی تھی - میرے کنجوس والد کو زیادہ جہیز بھی نہ دینا پڑا - خیر کچھ بھی ہو اصل مین یہ "رائے صاحب" کا خطاب جو گورنمنٹ نے اپنی مہربانی یا مذاق سے دے دیا ہوگا - مجھے اپنے شفیق مان باپ سے جدا کرکے بمبئی مین لے آیا - مین گورنمنٹ کو دعا دیتی ہون اور اپنے کفایت شعار خطاب کے بھوکے والد صاحب سے

عرض کرتی ہون کہ آپ کو اور آپ کے داماد کو "رائے صاحب" کے خطاب سے کیا حاصل ہوا اور آپ نے یا آپ کے داماد نے کونسل مین بیٹھکر یا اور کسی طریقہ سے دنیا کو کیا فائدہ پہونچایا۔ اگرچہ آپ اور آپ کی طرح خوشامدی ہستیان خطابون کو شکر کی طرح میٹھا سمجھین مگر مین تو انھین زہر ہلاہل سمجھتی ہون۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جس وقت میرا بیاہ ہو رہا تھا اُسوقت میری پیاری مان، اُستانی جی اور میری سہیلیان میری طرف دیکھ دیکھکر رو رہی تھین۔ مین اسوقت تو اس بھید کو نہ سمجھی لیکن سسرال آنے کے تیسرے دن جب مین نے اپنے شوہر کے درشن کیے تب مجھے معلوم ہوا کہ میری سہیلیان وغیرہ کیون روتی تھین۔

دنیا مجھے قابل الزام نہ سمجھے۔ قابل مضمون نگار جو عورتون کی برائیون اور مردون کی تعریفون مین صفحے کے صفحے سیاہ کر دیتے ہین مجھے معاف فرمائین تو مین رائے صاحب کا کچھ حال بیان کرون۔

مین چند خاص وجوہات سے آپ کے نام کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہون۔ میرے مہربان [illegible] خود کوئی فرضی نام رکھ لین۔ آپ کی عمر قریبًا ۴۵ سال کی ہے میرے اعضا جسقدر خوبصورت اور سڈول ہین۔ آپ کے اُتنے ہی بھدے اور بے ڈول ہین۔ مین جتنی نازک بدن اور دُبلی پتلی ہون۔ آپ اُتنے ہی عظیم الجثہ اور ڈبل ہین۔ مین جتنی گوری اور ہنس مکھ ہون۔ آپ اُتنے ہی کالے اور ترش رو ہین۔ میری آنکھین جتنی بڑی اور رسیلی ہین آپ کی آنکھین اتنی ہی ہاتھی کی طرح چھوٹی اور شوخ ہین۔ اور چہرے پر چیچک کے داغون نے آپ کے حسن کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ اس پر بھی آپ پیلا کوٹ پہنا کرتے ہین اور کبھی کبھی ہیٹ بھی لگاتے ہین۔ سیٹی بجانے کا بھی آپ کو بہت شوق ہے۔ تھوڑی سی اُردو بھی جانتے ہین لیکن سب زبانون مین آجکل کے شعرا کی طرح اُستاد بنتے ہین۔ خصوصًا ہندی۔ گجراتی۔ مرہٹی زبانون مین زیادہ قابلیت بگھارتے ہین۔ انگریزی کے بازاری الفاظ بھی اکثر بولا کرتے ہین آپکو ناٹک اور نوٹنکی سے عشق ہے۔ سویرے نو بجے سوکر اُٹھتے ہین۔ سب سے پہلے سگار کو منھ مین ڈالتے ہین۔ جب وہ ختم ہوتا ہے تب ناشتہ کرتے ہین اور دس بجے کے قریب حوائج ضروری سے

فراغت پاتے ہیں - آپ پان ہر وقت کھاتے رہتے ہیں اور جہاں جی چاہتا ہے تھوک دیتے ہیں شراب ارغوانی پی کر خوب تماشے کرتے ہیں - میں نے آپ کا نام "دیو" رکھا ہے - میرا دیو مجھے بہت پیار کرتا ہے - وہ میرے لئے طرح طرح کے خوشبودار تیل وعطر لایا کرتا ہے - آپکو تاش کا کھیل بھی بہت پسند ہے دن بھر آوارہ لوگوں میں تاش کھیلا کرتے ہیں - انکے خوشامدی دوست انھیں خواجہ تاشگان کہتے ہیں - آپ نے کہیں سے تاش کے دو چار کرتب سیکھ لئے ہیں جب مزے میں آتے ہیں تو مجھ بدنصیب کو بھی وہ کرتب دکھا کر بہت خوش ہوتے ہیں - کبھی بیگم کو بادشاہ اور بادشاہ کو بیگم بناتے ہیں - لیکن وہ جتنا مجھے دیکھکر خوش ہوتے ہیں میں اتنا ہی انھیں دیکھکر نفرت کرتی ہوں - یہ کیوں ؟ میرا حال غم پڑھنے والے خود ہی سمجھ لیں -

ایک دن کی بات ہے - رات کے نو بجے تھے ساون کا مہینا تھا - آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے پانی برسنے والا تھا - میری طبیعت گھبرا رہی تھی - میں چپ چاپ ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھی تھی - کوئل کی کوک نے میرے دل میں آگ لگا دی - میں کرسی سے اٹھکر کمرے میں ٹہلنے لگی - میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو آنسو نکل آئے جس سے کچھ کچھ دل کا بخار نکلگیا اور میں نے اپنی بدقسمتی کا راگ ہارمونیم پر چھیڑ دیا - میں نیچے سُر میں گا ہی رہی تھی کہ وہ دس بجے جھومتے ہوئے میرے کمرے میں آئے اور ایک کرسی کھینچکر دھم سے گر پڑے - تھوڑی دیر تک تو اپنی مہیب شکل کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے خدا جانے کیا سوچتے رہے - اسکے بعد آپ یکبارگی اُچھل پڑے - گویا آپ کو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی اور سیٹی نکال کر بجانے لگے - میں حیران تھی - ڈر - نفرت اور گھبراہٹ سے میں کانپ رہی تھی - یکبارگی میرے کان میں آپکی گرجتی ہوئی اور بھدی آواز آئی - آپ نے فرمایا "میں نے سُنا ہے کہ آپ خوب گاتی ہیں برائے مہربانی اگر گرم ہو جائے تو بہتر ہے" مجھے سکتہ ہو گیا میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا کچھ دیر کے بعد آپ نے پھر کہا "اجی حضرت آپ سنتی نہیں ایک آدھ کوئی چیز" میں سوچ رہی تھی کہ کوئی ایسی بات یاد آجائے کہ جس سے انکو گانے کی بات بھول جائے اور میں اسوقت کو ٹال جاؤں - مگر آپ نے پھر دوبارہ وہی سوال کیا - اب میں کیا کروں گانے کے لئے تو میں گا سکتی ہوں لیکن ایک مدہوش شخص کے سامنے کیا گاؤں اور کیسے گاؤں -

"آخاہ! اس ناز و نخرے کی کوئی وجہ۔ عرض کرتا ہوں سُنا دوگی تو کیا ہوگا صاحب"
اب مین پھر سوچنے لگی "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" بہزار دقّت مین نے اپنے کو سنبھالا اور اپنے مدہوش پتی سے دریافت کیا "کیا گاؤن" آپ نے فرمایا "جو آپ کا جی چاہے صاحب" مین نے پھر کہا "آپ ہی بتایئے کہ کیا گاؤن"۔ اب آپ نے فوراً جواب دیا "کوئی دادرا۔ کوئی قوالی۔ کوئی تلانہ۔ راگ سندھ طرز تھیٹر" مین آپ کے راگ اور راگنیون کے نام سُنکر سہم گئی۔ وہ مجھے چپ دیکھکر بولے "میری جان مین تمپر قربان۔ چاہے کچھ سناؤ۔ کوئی معرفت کوئی اندر سبھا امانت کی غزل۔ کوئی استاد امدن کا چوبولا۔ زہر عشق کی مثنوی۔ کوئی بانکے میان یا لال صاحب کی لاوانی۔ کوئی بھائی نظیر کی قوالی۔ ہان ہان ہونے دو"

میری قابل قدر استانی جی گو مسلمان تھین مگر انھون نے مجھے جو گیت سکھائے تھے انمین بھجن۔ مالتی گیت بطرز رامائن وغیرہ تو ضرور تھے لیکن انمین دادرا۔ تلانہ۔ راگ سندھ طرز تھیٹر نہ تھے۔ مین نے سورداس تلسی داس کبیر اور شنکر کے کبت تو ضرور یاد کیے تھے لیکن مین نے بانکے میان یا لال صاحب کا کبھی نام تک نہ سُنا تھا اور مجھے اسوقت تک یقین نہین ہے کہ ہندی یا اردو مین ان ناموں کے کوئی کبیشور ہوئے ہین۔ استانی جی! آؤ۔ میری پیاری ماں اپنی اس لاڈلی لڑکی کی جسے پڑھایا لکھایا تھا حالت دیکھ جاؤ۔ افسوس مین نے تعلیم کیون پائی۔ ہائے مین نے گانا بجانا کسکے لئے سیکھا۔ رنج و غم کے مارے میری چھاتی پھٹی جاتی ہے۔ اور جدھر نظر اٹھاتی ہون لوگون کو اپنی بربادی پر ہنستے ہوئے ہی دیکھتی ہون گویا تمام دنیا میری اس خستہ حالی پر مذاق اڑا رہی ہے اور صرف مین ہی رو رہی ہون اسی واسطے مین اپنے تعلیم یافتہ بھائی اور بہنون سے دریافت کرتی ہون کہ میرے ساتھ انصاف کیا گیا یا ظلم۔

مین یہی سوچ رہی تھی اور وہ مجھے گھور رہے تھے۔ مجھے اسوقت اپنی سدھ بدھ نہ تھی آپ یکبارگی اُچھل پڑے اور بولے "اللہ رے تغافل! اس معشوقانہ ادا کی کوئی حد بھی ہے" وہ کچھ اور واہیات بکنا چاہتے تھے۔ مین نے روک کر کہا ٹھہرئے مین گاتی ہون۔ مین نے آنسو پوچھ ڈالے اور رنج و غم مین ڈوبی ہوئی دردناک آواز مین گانے لگی۔ گویا گانے کا اب ضروری وقت آگیا تھا۔ مین نے رامائن کے دو چار دوہے گائے۔ جب مین ایک دوہے پر

پہونچی جس کا مطلب یہ تھا۔

"بن مین جہان کانٹے اور ببول کے سوا کچھ نہین ہے اور اس سنسان جنگل مین جہان کوئی ہمدرد نہین دکھائی دیتا ہے کس کا سہارا لیا جائے"

تو آپ اُٹھکر کمرے مین ٹہلنے لگے انکے مرضی کے خلاف جانکر مین نے گانا بجانا بند کر دیا آپ فرمانے لگے "خوب ہوا۔ کمال ہوگیا۔ بڑی سُریلی آواز پائی ہے۔ مگر یہ بلی کی طرح میون میون میری سمجھ مین نہین آتا۔ مجھے ہندی کے گانے اچھے نہین معلوم ہوتے۔ مین آپ کو اچھے اچھے راگ اور راگنیان یاد کرا دونگا۔ ہان خوب یاد آیا ایک یہی ہے اور اپنی توند کو پھڑکاتے ہوئے ناچ ناچ کر بتانے لگے۔

"کیسا کھلا گل لالہ چمن مین۔ ہان کیسا کھلا۔ اجی کیسا کھلا۔ واہ کیسا کھلا۔ دیکھو کیسا کھلا گل لالہ چمن مین"، باقی کل یاد کرا دونگا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کیسی پھڑکتی ہوئی چیز ہے آپ تھوڑے ہی دن مین خوب گانے لگین گی۔ اسکے بعد آپ سونے کے لئے اپنے کمرے مین چلے گئے اور تھوڑی ہی دیر مین خرّاٹے لینے لگے اور مین تنہا رہ گئی۔ مین نے ٹھنڈی سانس بھر کر دیکھا کہ چاردن طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور میرے دل کے مندر مین بھی خوفناک تاریکی چھائی ہوئی ہے۔

(ماخوذ از ہندی) اعظم کریوی ایڈیٹر طوفان

"مقالات ٹالسٹائی"

جو عورت ظاہری نمائش اور حسن سے مرد کے دلپر قابو پانا چاہتی ہے وہ کبھی مرد کے اوپر قبضہ نہین کر سکتی بلکہ مرد کا اثر خود قبول کر چکی ہے اور اُس ذلیل معیار پر پہونچ چکی ہے جس پر مرد ہین۔

مرد کے فرائض زیادہ وسیع اور مختلف النوع ہوتے ہین، اور عورت کے فرائض سیدھے سادے اور محدود ہوتے ہین، لیکن وہ اہم ہین اور اُنکی ذمہ داری زیادہ ہے۔

خدا اور بنی نوع انسان کی خدمت کرنے مین مرد اور عورت دونونکا برابر حصّہ ہے۔

"عالی لکھنوی"

انجیل کی اشاعت

یورپین قوم جس امر کو تشہیر اور ترویج دینا چاہتی ہے اُنہیں کمال کرتے ہیں۔ تخیلاً ہم صرف انجیل کے ترجموں اور شمار فروخت کا ذکر کرتے ہیں:۔

انجیل (یا اُسکے حصص) ۴۰۰ زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

۱۹۰۵ء میں اسی لاکھ کاپیاں امریکہ اور یورپ کے بیبل سوسائٹیوں نے فروخت کیں۔ یہ تعداد معمولی کتب فروشوں کی فروخت کے علاوہ ہے۔ جسکی نسبت اندازہ کیا جاتا ہے کہ چالیس لاکھ فروخت ہوئی ہونگی۔

شمار اور تعداد کے اندازوں سے ڈاکٹر فاخور کی رائے ہے کہ مختلف زبانوں میں ایک کروڑ بیس لاکھ انجیل کی جلدیں سالانہ فروخت ہوتی ہیں۔

نہ معلوم ۱۹۰۵ء کے بعد کوئی BLUE BOOK بلیو بک مشن کی جانب سے شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ میرے پاس ۱۹۰۵ء کی ایک کاپی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر میں مشن پھیلے ہوئے ہیں۔ شائد دنیا کا کوئی حصہ ہوگا جہاں عیسائی مذہب کی تبلیغ نہوتی ہو۔ ہندوستان میں ۵۰ سوسائٹیاں ۱۹۰۵ء میں کام کر رہی تھیں بعد کے ۱۰ یا ۱۵ سال میں ممکن ہے سوسائٹیوں کی تعداد اور زیادہ ہوگئی ہو۔ ان سوسائٹیوں نے یہاں بہت سے عیسائی کرلئے اور انمیں سے بعض پادری کا درجہ حاصل کرکے اشاعت عیسائیت میں سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔ اُنکے ماتحت بہت سے کیتھی کسٹ بھی ہیں جو مواضعات اور شہروں کے گلی کوچوں میں وعظ کرتے ہیں۔ ہزارہا یتیم اور محتاج و لاوارث ہندوستانی اور کثرت سے ایسے اشخاص جنکو ہندو منزلت مناسب نہیں دیتے عیسائی کے لئے عیسائی ہو رہے ہیں۔ دیسی عیسائی رفتہ رفتہ آبادی ہند کا ایک معتدبہ جزو بنتے جاتے

ہیں۔ حامیان عیسائیت کا یہ جوش و خروش (جو اپنے مذہب کی ترویج و تبلیغ میں کرتے ہیں) قابل ستائش ہے۔ جس مذہب کے لوگ مذہبی حیثیت سے اتنے سرگرم کار ہوں پھر وہ کیوں نہ کامیاب ہوں۔ اُسکے مقابلہ میں ہندوؤں کو خواب خرگوش سے جگانے والا بھی کوئی نہیں نہ اُنکی حمیت متقاضی ہے کہ وہ اس جانب توجہ کریں۔ بدھ مذہب کے لوگ ہندوستان میں موجود ہی نہیں۔ البتہ وہ اپنے اپنے ملکوں میں کچھ نہ کچھ سعی کر رہے ہیں لیکن بمقابلہ عیسائیوں کے اُنکی کوشش عشر عشیر بھی نہیں۔ اہل اسلام غافل نہیں ہیں وہ بھی حتی الامکان تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں لیکن عیسائیوں کے مقابلہ میں اُنکی کوششیں بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتیں تاہم مسلمان بہت کم دوسرا مذہب اختیار کرتے ہیں اور اُنکے شمار میں سے کم از کم کمی نہیں ہوتی۔ لطف تو جب ہے کہ ہر مذہب میدان میں آجائے اور اُسکے حامیوں کی کوششیں بھی قریب قریب مساوی ہوں پھر دیکھنا چاہئے کہ کونسا مذہب پسند عام ہوتا ہے۔ کیا ہمکو امید کرنی چاہئے کہ آیندہ کبھی ایسا موقعہ آجاویگا۔ کہ ہر ایک مذہب کے دکلاء اور حامی برابر کی لیاقتیں بھی رکھتے ہوں گے۔ اور ایک میدان میں کام کرتے ہونگے

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا زور جہاں تک اعتقاد سے تعلق ہے کمی پر ہے باہمی جنگ و جدل کے لئے یا بعض حقوق کے بچانوں کے لئے اس سے مدد لیجاتی ہے۔ مذہب فی نفسہ تو جغرافیہ قومیت پولیٹکل طاقت سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اُنکی اصل شکل تو روحانی ہے اور وہ عقبیٰ سے زیادہ واسطہ رکھتا ہے۔ لیکن اب تو شاید اگر گستاخی نہ سمجھی جاوے ایک فیشن سا ہوگیا ہے۔ یا لیس میں لڑنے کا بہانہ ہوتا جاتا ہے۔ ہر ایک مذہب اپنے پیروؤں کی تعداد میں افزونی چاہتا ہے۔ خواہ اُسکے لئے وسائل صالح ہوں یا مذموم ہوں۔ اُنا مذہب پر سخت بن آئی ہے جو ساکن اور بے حرکت ہوگئے ہیں۔ اُنکے لئے گو یہ مشکل دگرنہ گو یہ مشکل دیکھتے جائے ؎ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

شمس

مکلی کی پہاڑیان

ٹاٹا نامی ایک جھیل ہے جہان بہت سی مرغابیان رہتی ہین - اور اکثر انگریز صاحبان شکار کی غرض سے تشریف لیجاتے ہین - بنگلے کے قریب بہت سی پرانی قبرین ہین - یہ قبرین مکلی پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہین - اسکی وجہ تسمیہ کی نسبت دو باتین بیان کیجاتی ہین - بعض کا خیال ہے کہ کوئی مکلی دیوی یہان رہتی تھین - انھین کے نام پر یہ پہاڑ اس نام سے منسوب کیا گیا - بعض لوگ کہتے ہین کہ یہ نام ایک مسلمان پیغمبر نے مکے کا دروازہ سمجھکر رکھا تھا - اسکے نیچے سعید علی شیرازی کی قبر واقع ہے - مشہور ہے کہ جب شہنشاہ ہمایون شیر شاہ سے شکست کھاکر سندھ کی طرف بھاگا اور جیسلمیر ہوتا ہوا امرکوٹ کی طرف روانہ ہوا تو راستے مین اسکے بہت سے ساتھی پیاس سے تڑپ کر مر گئے - سواری کے لئے صرف ایک گھوڑا باقی بچا جسپر اکبر کی والدہ سوار کردی گئین - امرکوٹ پہونچتے پہونچتے اسکے ساتھ مین صرف سات آدمی رہگئے وہین ۱۴ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو اکبر کی پیدائش ہوئی - ان دنون ہمایون غربت اور افلاس سے تنگ تھا - اسکے پاس نہ تو ہمراہیون مین تقسیم کرنے کے لئے روپیہ تھا اور نہ بچے کو پہنانے کے لئے کپڑا - اسکے پاس ایک مشک نافہ تھا اسی کو چیر کر اسنے اپنے آدمیون مین تقسیم کردیا - اور اعلان کیا کہ اسکے لڑکے کی شہرت چار دانگ عالم مین ایک روز مشک کی خوشبو کی طرح پھیلیگی - اسی سعید علی شیرازی کے زریعہ بھتی کوٹ سے (جو اہالیان ٹاٹا کی طرف سے نذر لیکر آیا تھا) اکبر کی پیدائشی پوشاک تیار ہوئی -

مکلی دیوی کی قبر سعید علی شیرازی کے مقبرے کے جنوب مین واقع ہے - چونکہ اس قبر پر کوئی چھت نہین اور پتھر بھی ہندو مندر سے لئے ہوئے معلوم ہوتے ہین - اس لئے

پہچاننا نہایت آسان ہے

جم نظام الدین 'ٹاٹا' کے بانی تھے۔ سندھ کی تاریخ کا ابتدائی حصّہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب علاؤالدین خلجی نے سندھ کو فتح کیا اُسوقت وہان سمرس نامی ایک اجپوت فرقہ حکومت کرتا تھا۔ اُنھون نے یہان ۱۳۵۰ء سے ۱۵۲۱ء تک حکومت کی۔ لیکن جم نندو کے وقت تک وہ ٹاٹا مین آباد نہ ہوئے۔ وہ اسکے شمال مغربی حصّے مین جو سمّوئی کے نام سے مشہور ہے رہتے تھے۔ جب جم نندو نے اپنے آپ کو ہر طرح طاقتور بنا کر ڈاکوؤن سے مُلک کو پاک وصاف کرایا تو ایک نیا شہر جہان کہ دائمی خوشحالی نصیب ہو سکے بسانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ براہمنون کی صلاح اور مشورے کے مطابق ایک دن مقرر کرکے اُسنے اِس شہر کی بنیاد رکھی اور ۵۰ سال تک نہایت شان وشوکت سے حکومت کرتا رہا۔ اِسے بھی مکلی پہاڑ مین دفن کیا گیا۔ جم طماچی کا بھی جو کہ لونری نامی مچھلی گیر کی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اسکے پاس ہی مقبرہ بنا ہوا ہے۔

اسکے بعد جم فرنز لیسر جم نندو تخت نشین ہوا۔ وہ رقّاصہ لڑکیون کا دلدادہ اور مذاق کا شیدائی تھا۔ سلطنت کے کامون کی اُسے زیادہ پروا نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۵۲۱ء مین شاہ بیگ ارہون (جسکو کہ بابر نے قندھار سے نکالدیا تھا) حملہ آور ہوا اور اُسکو تخت سے علیحدہ کردیا۔ ۱۵۳۶ء مین شاہ حسین ارغون اپنے والد کے تخت پر قابض ہو گیا۔ اور جس زمانے مین ہمایون صحرا نوردی کرتا ہوا یہان آیا۔ یہی راج کرتا تھا۔ اُسنے ۱۵۵۴ء مین وفات پائی اور مرزا اِستعار خان بانیٔ خاندانِ ترکھان ٹاٹا کا مالک بن بیٹھا۔

عیسیٰ خان کی قبر ایک پُرانی مسجد کے سامنے واقع ہے۔ اسکی ساخت نہایت اعلیٰ ہے۔ مرزا عیسیٰ کے زمانے مین پُرتگال والون نے ٹاٹا پر حملہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۵۵ء مین مرزا عیسیٰ خان سلطان محمود بکرؒ جسکی مدد سے وہ سندھ کا بادشاہ بنا تھا لڑا۔

عیسیٰ خان نے پُرتگال والون سے مدد طلب کرنے کے لئے اپنا آدمی گوا روانہ کیا۔ اُس زمانے مین اُن لوگون کی بہت شہرت تھی۔ چند سال پہلے شاہ گجرات انھین کی مدد سے ہمایون کو اپنے ملک سے نکالنے مین کامیاب ہوا تھا۔ اور بدلے مین بسین اور سال سٹ

کا علاقہ بطور انعام اُنکے حوالے کر چکا تھا۔ عیسیٰ خان کو کامل یقین تھا کہ اُنکی مدد سے وہ سلطان محمود کو زک دے سکیگا۔ اور دوسری جانب پُرتگال والے دریائے سندھ سے سیراب شدہ علاقہ بدلے مین حاصل کرنے کی خواب دیکھ رہے تھے۔ پُرتگالی گورنر نے ۲۸ جہاز اور ۷۰۰ آدمی پیڈرو بہادر کی زیرکمان عیسیٰ خان کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ پیڈرو کے سندھ پار پہونچتے پہونچتے عیسیٰ خان نے سلطان محمود کے یہ بات دلنشین کردی کہ اسکے لیے فتح پانا ناممکنات سے ہے اور سمجھوتہ کرنے مین ہی بہتری کی صورت ہوسکتی ہے۔ عیسیٰ خان نے کہلا بھیجا کہ اب اُسے پُرتگال والون کی مدد کی ضرورت نہین ہے۔ پیڈرو بہادر نے اسپر تمام اخراجات جو کہ اُسے اس سفر کے دوران مین برداشت کرنے پڑے تھے طلب کیے۔ لیکن مرزا عیسیٰ نے صاف جواب دے دیا۔ پیڈرو غصے مین آگیا اور ٹاٹا پر حملہ آور ہوا۔ ۸۰۰ آدمی قتل ہوئے۔ اُسنے شہر مین آگ لگادی اور بہت سا روپیہ لوٹ کر واپس چلا گیا۔

عیسیٰ خان نے پھر شہر بسایا لیکن پُرتگال والون سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ ۱۵۷۳ء تک نہایت شان وشوکت سے حکومت کی، مرنے کے بعد مکلی پہاڑ مین دفن کردیا گیا۔

عیسیٰ خان کی وفات پر اُسکا لڑکا محمد باقی تخت نشین ہوا۔ اسکی قبر طغرل بیگ کی قبر کے شمال مشرق مین ٹوٹی پھوٹی اینٹون کی بنی ہوئی ہے۔ محمد باقی رعیت کے ناک کان کٹوانا اور داڑھی مونچھون کی صفائی کروانا تفریح طبع سمجھتا تھا۔ اور اُنکو پھانسی دینا اور ہاتھی کے پانون سے کچلوانا کھیل جانتا تھا۔ ۱۵۸۴ء مین اِسنے خودکشی کرکے اپنی جان دی۔

اِسکے بعد جانی بیگ جسکی قبر جنوب ترین حصے مین واقع ہے تخت نشین ہوا۔ اِس کے تخت نشین ہونے سے پہلے اکبر بہت شہرت حاصل کرچکا تھا۔ سلطان محمود والیٔ بکر نے اکبر کی اطاعت قبول کرلی۔ لیکن جانی بیگ دریائے مٹو کے پیچھے سُرنگون سے شاہی فوج کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر صلح کرنی پڑی۔ اور شہنشاہ نے اُسے ٹاٹا کا گورنر مقرر کردیا اُسنے ۱۵۹۹ء مین وفات پائی اور شہنشاہ نے اُسکے بیٹے بخاری بیگ کو گورنر مقرر کیا جو ۱۶۱۲ء مین قتل

کر دیا گیا۔ وہ جانی بیگ کے مقبرے مین دفن کیا گیا۔ اس قبر کو زیارت گاہ سمجھکر ہر سال بہت سے آدمی آتے ہین۔ بہت سی عورتین بچے مانگنے کی غرض سے وہان جاتی ہین۔ لیکن بخاری بیگ کے خود کوئی اولاد نہین تھی اور اُسکی موت پر اُس خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

اسکے بعد سندھ کا گورنر شہنشاہ دہلی کی طرف سے مقرر ہوتا رہا۔ دیوان شرفا خان وزیر گورنر امیر خان سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔ یہ دو منزلہ ہے۔ اسکے مشرق مین شاہی بیگمات کی قبرین ہین۔ مرزا طغرل بیگ کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُسکو جیتے جی اپنی قبر آپ ہی تعمیر کرانی پڑی۔ اُس کو ڈکاری کا خطاب ملا۔ اور لوگ اتنا حقیر سمجھتے تھے کہ چلتے چلتے قبر پر پتھر پھینکدینا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ وہان پتھرون کا ایک ڈھیر جمع ہوگیا تھا۔ لیکن جب سے محکمہ تعمیرات نے قبر کا انتظام اپنے ہاتھ مین لیا ہے پتھر اُٹھوا دیئے گئے ہین۔

رام سروپ شرما لاہور

"نغمۂ محبت"

پیارے! کل جہان سوسن کی سرخ سرخ کلیان کھلی ہوئی تھین آج وہان سفید برف شدت سے گر رہی ہے، اور باغ کی اُن روشون پر جہان مین تمھارے ساتھ ٹہلا کرتی تھی اب سرد ہوائین چل رہی ہین اور تمام فضا خنکی مین ڈوبی ہوئی ہے۔

اس سناہِ بلوط کے نیچے کوئل ہمارے ہی محبت کے روح افزا ترانے گایا کرتی تھی، اب کیون خاموش ہے، ہان ہان مجھے بتاؤ کہ وہ اب کہان ہے؟ کیا پہاڑون اور باغون مین بہار کا موسم ہے؟ مگر اے میرے دوست ہمارے لئے تو وہی سرد اور غمناک مہینا ہے جسمین سوائے وحشت آفرین مناظر کے میری منتظر آنکھون کو اور کچھ نہین دکھائی دیتا۔ شائد میری ہمراز محبت کوئل میری محرومِ نمناؤن سے عاجز آکر سرسبز وادیون مین چلی گئی اور اس فردِ بے محبت کو ہمیشہ کے لئے ویران و تنہا چھوڑ گئی۔

برف رات کی منجمد خاموشی مین گر رہی ہے اور گرجا کے اسطرف گھنٹے کی آواز اب نہین سنائی دیتی، آؤ، اب ہم اور تم ایک ساتھ مل کر گائین اور اپنے دل کی دبی ہوئی چنگاریون سے فضائے محبت کو روشن کردین۔

"میرے لئے تم ہو اور تمھارے لئے مین ہون" بس یہی ایک نغمہ ہو جسکی صدائے بازگشت سے ہم دونون محوِ حیرت ہو جائین،

(ترجمہ) شیام کشور

تنقید کتب

تخمیسین

تخمیسین کے نام سے جناب احسن مارہروی کی دو تخمیسین، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے کتابی صورت مین شائع ہوئی ہین، پہلی تخمیس جناب محسن کاکوروی مرحوم کی مشہور نعتیہ قصیدہ سے متعلق ہے، اور دوسری مولانا حالی مرحوم کے مشہور و معروف نظم عرض حال سے۔

جناب احسن مارہروی کی قادر الکلامی اور اُستادی مین کوئی کلام نہین۔ آپ کے کلام مین پختگی اور شستگی کے ساتھ دلکشی بلا کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان تخمیسون مین جناب احسن نے اپنی اُستادی اور قادر الکلامی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کے شروع مین ۴۴ صفحہ کا مقدمہ ہے اور اسکے بعد ۴۰ صفحہ پر دونون تخمیسین ہین،

آجکل عموماً طولانی مقدمے پسند کئے جاتے ہین۔ اور ستم یہ ہے کہ مقدمے کے زور پر نفس مضمون کی خوبی کا دارومدار سمجھا جاتا ہے، حالانکہ دونون الگ چیزین ہین۔ ایک کو دوسرے سے علاقہ ضرور ہے، لیکن یہ مناسب نہین ہے کہ ساری کتاب تمہید ہی مین ختم ہو جائے اور نفس مضمون ضمیمہ تمہید بن جائے۔

مولانا حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھکر ہندوستان کے شعراء کو یہ راستہ دکھا دیا ہے یعنی اب ایک مختصر دیوان کے لئے بھی ایک طولانی دیباچے اور مقدمے کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ مولانا حالی کا مقدمہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف ہے، وہ مولانا حالی کے وسعت نظر اور معلومات شعری کا آئینہ ہے، پھر پڑھنے والون کے لئے بھی ایک معلم ادب ہے۔

جناب احسن کا مقدمہ بھی پر زور ہے اور آپ نے بھی اُسے ہر حیثیت سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اکثر آپ نے مولانا حالی مرحوم کا اتباع کیا ہے۔ اور مذاق شاعری مین ضروری اصلاح و ترمیم پیش کی ہے۔ لیکن مولانا حالی نے جو کچھ لکھا ہے عملاً اُسکا ثبوت

بھی دیا ہے۔ اور اپنے کلام کو اپنے قول کے تائید مین پیش کیا ہے، مگر آپ جو کچھ فرماتے ہین اُسپر خود آپ کا عمل نہین، پھر اثر کیونکر ہو۔ مثلاً ایک جگہ تحریر فرماتے ہین "اگر ہمارے نکتہ سنج چھوڑی ہوئی ہڈیون پر قناعت نہ کرتے اور اپنی ملکی خصوصیتون کو پیش نظر رکھکر شعر کہتے تو وہ سخنوری کے آسمان پر آفتاب بنکر چمکتے" بلاشبہہ آپ صحیح فرماتے ہین۔ لیکن یہ تو فرمایئے آپ سخن سنج بھی ہین، اور ناصح مشفق بھی، پتے کی باتین بھی جانتے ہین، آخر آپ نے اپنے قول پر کیون نہ عمل کیا۔ آپ کے یہان بھی وہی گل وبلبل، وہی شب فرقت کی درازی، وہی رقیب روسیہ کی فرضی داستان، پھر ملکی خصوصیتون کو پیش نظر رکھکر شعر کہنے کا ادّعا، معاف کیجئے گا۔ آپ کے خیالات کا آپ کے عملیات پر سایہ بھی نہین پڑا۔ نائیٹل پر آپ کے اسم گرامی کے ساتھ قافیہ پیمائی کی ایسی بہتر تصویر نمایان ہے جس سے اسلاف کے رنگ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، یعنی، ازفکر رواروی، علی احسن صاحب احسن مارہروی، یہ فکر رواروی، کیا بلا ہے، یہ بے ضرورت قافیہ پیمائی کیا معنی رکھتی ہے۔ آپ فرماتے ہین، عشق وعاشقی کے جذبات کا اظہار کیا جائے تو محسن سرے سے شاعر ہی نہین، مین کہتا ہون، عشق کے جذبات نہون تو کوئی شعر ہی نہین کہہ سکتا، کیا عشق اللہ، عشق رسول کو آپ عشق نہین سمجھتے، اسکے علاوہ محسن نے وہ عاشقانہ شاعری بھی کی ہے جسکی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہین، بہرحال آپ یہ نہین کہہ سکتے کہ محسن شاعر نہ تھے، یا جذبات عشقیہ نہ رکھتے تھے، یہ بھی صحیح نہین کہ جناب محسن یا جناب انیس پر، نعت یا مرثیہ گوئی ختم ہوگئی۔ ہر اچھی چیز کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ اسکے بعد دوسری چیز ممکن ہوگی، لیکن زمانہ اس سے بہتر چیز کو اُسکی جانشینی کے لئے منتخب کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ لفظی رعایتون کے ساتھ ساتھ جناب محسن نے نفس مضمون کو مغلق نہین ہونے دیا، لیکن اکثر شعرون مین رعایت لفظی کے وہی کرشمے جناب محسن کے یہان بھی موجود ہین۔ جیسے دوسرے شعراء کے یہان، قلم آپ کے ہاتھ مین ہے جسکو چاہئے آسمان پر پہونچایئے، جسکو چاہئے گاڑ زمین کے سمون مین یا مال کر دیجئے، لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ جناب محسن تشبیہات اور استعارات کے گرویدہ تھے، زبان پر قدرت رکھتے تھے اور اشعار مین اپنی طبیعت کا یو ازور دکھا دیتے تھے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نعت اکثر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، لیکن اس سے بھی انکار نہین ہوسکتا کہ کبھی کبھی لفظی

رعایتوں کی وجہ سے جب محسن کا شعر بھی دوسروں کی طرح صرف الفاظ کا گورکھ دھندا رہجاتا تھا اُنکے مشہور قصیدے کا یہ شعر ہے۔ ؎

سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخیٔ لب چمن حسن سے لال اُڑ گئے بنکر ہریل

بلند پروازی اور معنی آفرینی کا کیا کہنا۔ لیکن غور فرمایئے، سبزۂ خط اور سرخیٔ لب کی تشبیہ لال اور ہریل سے دی گئی ہے۔ اسکے علاوہ شعر مین کیا ہے۔ یا قبول آپ کے دوسرا مصرعہ ملکی خصوصیات مین داخل بھی ہوجائے تو حاصل کیا ہے۔ ہونٹ پر تو بال نکلے نہین۔ پھر سبزۂ خط سے سرخی لب کیونکر مٹیگی، بفرض محال یہ بھی سہی کہ سبزۂ خط سے سرخی لب زائل ہوگئی لیکن لال کا ہریل بننا کہان ثابت ہوا، یہ البتہ ہوا کہ لال کی جگہ ہریل آگیا۔

اس تنقید سے میرا یہ مدعا نہین کہ جناب محسن مرحوم نے اپنی تشبیہ کو پایۂ ثبوت تک نہین پہونچایا بلکہ غرض یہ ہے کہ جس زمانہ مین مولانا مے مرحوم کی نشو ونما ہوئی تھی اُس زمانہ مین عموماً تشبیہ و استعارے کی خصوصیت سے قدر کیجاتی تھی، اور یہی رنگ کم و بیش اُس زمانہ کے تمام شعراء پر چڑھا ہوا تھا۔ عموماً تشبیہ و استعارے کے مقابلے مین سیدھے سادے مضمون پر بہت کم التفات کیا جاتا تھا۔ حتی کہ بعض وقت تشبیہ و استعارے کی وجہ سے نفس مضمون پر بھی حرف آجاتا تھا۔

بہرصورت جناب احسن صاحب مارہروی نے مقدمہ بہت زوردار لکھا ہے اور شعراء عرب کی مثالون سے اُسے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ بعض بعض جگہ طرز خطاب ویسا ہی تحکمانہ اختیار کیا ہے جو بعض خود پسند بیوقوف بیوون کا ہوتا ہے۔ یعنی "یاد رکھو" "دیکھو" بیوقوفی کے سوا کچھ نہ پاؤگے۔ اس سے ذرا پڑھنے والے پر ایک خاص اثر پڑتا ہے، مقدمہ کے آخر مین مولانا محسن مرحوم کی سوانح عمری لکھی ہے جس سے دلچسپی مین ایک خاص اضافہ ہوگیا ہے۔ مقدمہ کے آخری صفحہ پر تحریر ہے ایک مرتبہ گاڑی پر سوار تھے گھوڑے نے شرارت کی، گاڑی سے کود پڑے، دست راست کی ہڈی اوکھڑ گئی، دست راست کی ہڈی، کے بجائے اگر داہنے ہاتھ کی ہڈی لکھا جاتا تو غالباً اُردو صاف ہوجاتی، ہان صرف فارسیت پر حرف آجاتا۔

آخر مین لکھا ہے، مرحوم کے اعقاب گرامی، دفرزندان نامی، مقفیٰ فقرے کے علاوہ اعقاب

گرامی کی ترکیب اعماق روح سے کم دلچسپ نہیں۔

اِس ۴۴ صفحے کے مقدمے کے بعد صفحہ ۱ سے تخمیس شروع ہوتی ہے۔

تضمین کی خوبی یہ ہے کہ اصل مصرع یا شعر اُسمین پیوند ہوجائے، یہ نہ معلوم ہو کہ زبردستی مصرعے جوڑ دیے گئے ہین، جب اس معیار پر ہم جناب احسن مارہروی کی تضمینون کو پرکھتے ہین تو بیساختہ جناب ممدوح کو داد دینے کا جی چاہتا ہے۔ بندش کی چستی، اور خیالات کی پاکیزگی بھی قابل تحسین ہے۔

مطلع اول کی تخمیس ملاحظہ ہو۔

ضیائے حق سے عبداللہ کے روے منور مین — وہ طلعت تھی نہین جسکا نشان خورشید خاور مین
سبب اسکا یہ فرماتے تھے وہ ہر بزم اطہر مین — ہو منزل اک مہ کنعان کی قلب زار مضطر مین
یہ مہمان عزیز اُترا ہے کس اُجڑے ہوئے گھر مین

اِسی مطلع کی دوسری تخمیس ملاحظہ ہو،

نہ گھر کی طرح گھر ہے اور نہ کچھ سامان گھر بھر مین — نہ اتنی استطاعت جتنی ہوتی ہے تونگر مین
نہ کیون پھر آب خجلت جوش زن ہو دیدۂ تر مین — ہو منزل اک مہ کنعان کی قلب زار مضطر مین
یہ مہمان عزیز اُترا ہے کس اُجڑے ہوئے گھر مین

سبحان اللہ جناب احسن نے تخمیس کے دو پہلو اختیار کیے ہین اور حق یہ ہے کہ دونون مین نہایت خوش اسلوبی سے کامیاب ہوئے ہین، داد نہ دینا ظلم ہے، مطلع کی دوسری تخمیس مین ہمین بندش اور زبان کے لحاظ سے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر "نہ کچھ سامان گھر بھر مین" کے بجائے "نہ کچھ سامان ہے گھر مین" ہوتا، تو بندش بھی چست ہوجاتی اور "ہے" کی ضرورت بھی پوری ہوجاتی۔

صفحہ ۵ پر یہ بند تحریر ہے،

یہ حصہ ہو چکا ہے طبع گوہر بار محسن کا — کہ نقطہ نقطہ موتی بن گیا اشعار محسن کا
بہت بیجا ہے احسن رشک یہ اغیار محسن کا — حسد کیون لامکان پردازیٔ افکار محسن کا
کسی دن معرکہ ہوگا عطارد مین سخنور مین

تضمین کی خوبی مین تو کلام نہین، لیکن اغیار کے قافیہ مین ضرور کلام ہے، خدا جانے آپ نے 'اغیار محسن' کے کیا معنی لئے ہین۔ اگر شعراء کے اصطلاحی معنی لئے جائین (یعنی رقیب) تو تاویل کی ضرورت پڑیگی، اور پھر ایک معشوق خیالی تلاش کرنا پڑیگا، جسکی جھلک ان مصرعون مین موجود نہین، اور اگر اغیار کے اصلی معنی لئے جائین (یعنی غیر کی جمع) تو ردیف مین 'لفظ' محسن' چسپو ہوجاتا ہے، یعنی، صرف اتنے ہی سے مفہوم ادا ہوجاتا ہے، بہت بیجا ہے' احسن رشک یہ اغیار کا، مگر ایسی صورت مین نہ ردیف پوری ہوتی ہے نہ وزن، بہرحال کوئی اور قافیہ ہوتا تو مناسب تھا۔ تیسرے مطلع کی تضمین ملاحظہ ہو۔

جو کی آب و ہوا نے عطر بیزی بحر مین بر مین — بنایا پھول آتش کو بسائی خاک عنبر مین
عناصر کی جو خوشبوئین پھیلین جسم اطہر مین — ہوا عالم معطر صبح میلاد پیمبر مین
بسا ہے نالۂ جان سوز بلبل تک گل تر مین

سبحان اللہ جس زور کا شعر تھا اُسی زور کی تخمیس بھی ہوئی، خصوصاً تیسرا مصرع جناب احسن نے اس قوت سے لگایا ہے، کہ داد نہین دی جاسکتی، ساتھ ہی ساتھ ایک سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ردیف (مین) بیکار ہوئی جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب عناصر کی خوشبوئین جسم اطہر سے پھیلین، تو صبح میلاد پیمبر مین عالم معطر ہوگیا۔ اگر ردیف کو قائم رکھا جائے تو مفہوم ادا نہین ہوتا، عالم تو اُسیوقت معطر ہوسکتا ہے جب خوشبو عالم مین پھیلے، لیکن تیسرا مصرع یہ بتاتا ہے کہ "خوشبوئین جسم اطہر مین پھیلین" آپ نے خوشبو کو محدود کردیا۔ خوشبو جب تک نافے کے اندر پھیلی ہے، اُسوقت کسی کے دماغ کو معطر نہین کرسکتی، جب نافے سے نکلے گی تو دماغون پر اُسکا اثر ہوگا۔

صفحہ ۱۸ پر یہ مصرعہ تحریر ہے۔ "بچے گا بے گئے کل کوئی کب سرکار عالی مین،
مفہوم تو ضرور ادا ہوگیا لیکن "بچیگا بے گئے کل" کیوجہ سے فصاحت کا خون ہوگیا۔
صفحہ ۲۵ سے عرض حال کی تضمین شروع ہوئی ہے، حقیقت ۔ ہے کہ احسن صاحب نے خوب ہی تضمین کی ہے،
چند بند ملاحظہ ہون۔

جس دین کے تابع تھے کبھی قیصر و خاقان جس دین سے دنیا پہ کھلا جوہرِ ایمان
جو دین کہ تھا امن کا اک قلعۂ دیشان جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہبان
اب اُسکا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو خانہ بدوشوں کو بساتا تھا ٹھکانے آباد کئے وحشیوں کے جسنے گھرانے
جو اُنس و محبت کے سناتا تھا فسانے جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اِس دین میں اب تفرقہ خود آکے پڑا ہے

جس دین کا پابند تھا سلطان بھی گدا بھی جس ملتِ محمود کا اچھا تھا بُرا بھی
جس دین میں تھی صبر کی دولت بھی سخا بھی جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اُس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

اِن تین بندوں کو پڑھئے اور زورِ تخمیس ملاحظہ کیجئے، معلوم ہوتا ہے کہ کل مصرعے ایک ساتھ لکھے گئے ہیں، اور پانچوان مصرع ہر مصرع سے متعلق ہے، اور یہی خوبی تخمیس ہے

صفحہ ۳۱ پر یہ مصرع تحریر ہے۔ "جنیون میں مسلمان ہیں شامل نہ مرون ہیں"
لفظ مرون کی سند چاہیئے۔

احسن صاحب نے جا بجا حاشئے بھی لکھے ہیں جس سے تخمیس کی خوبی بڑھ گئی ہے توضیحات کی تفصیل نے اشعار کو زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، بہرحال یہ کتاب قابلِ قدر ہے، اور جناب احسن مارہروی کی شاعرانہ قابلیت کی شاہد عادل،

کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب، قیمت غیر مجلد ۱۲ر مجلد ایکروپیہ عہ،
ملنے کا پتہ۔ مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علیگڈھ

مجموعہ کلامِ جوہر

مجموعۂ کلامِ جوہر، پاکٹ سائز کے ۵۴ صفحے پر مطبع یتیمہ علیگڈھ سے شائع ہوا ہے، شروع میں مولانا محمد علی صاحب جوہر کا فوٹو ہے، اسکے بعد موصوف کے مختصر حالات درج ہیں، پھر غزلیں ہیں، ابتدا میں وہ غزلیں ہیں جو آپ نے پہلے لکھی تھیں اور آخر میں کلام جدید کے عنوان سے وہ غزلیں درج ہیں جو آپ نے بیجاپور جیل میں کہی ہیں۔

اُردو شاعری کے لئے جیل خانہ بھی عجیب جولانگاہ ہے، شاید وہاں پہونچکر دماغ انسانی مین شعریت کا عنصر غالب ہوجاتا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے وہین بیٹھے بیٹھے اپنے کئی دیوان مرتب کرلئے، اس عام داروگیر کے زمانہ مین بھی جیلخانہ سے برابر مشاعرون کی آوازین آتی رہین، ممکن ہے کہ خیالات کی دنیا احاطۂ زندان مین پہونچکر کچھ اور وسیع ہوجاتی ہو۔

مولانا محمد علی صاحب کے خیالات پہلے بھی اگرچہ شاعرانہ ہی تھے لیکن اس ادب نواز آب و ہوا مین داخل ہوتے ہی آپ کی شاعری کچھ سے کچھ ہوگئی، پہلے کم فرماتے تھے، لیکن اب اکثر فرماتے رہتے ہین، پہلے شعرون مین یہ جوش و اثر نہ تھا، لیکن اب اس عنفوان کی دلکشی ہے کہ ہر شعر دل مین چٹکیان لینے لگتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ آپ جو کچھ نظم فرماتے ہین جذبات حقیقی اور واردات قلبی کا پرتو ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام سوز و گداز کا آئینہ اور راز و نیاز کا مرقع ہوتا ہے۔

اس مختصر سے مجموعہ مین مذہبی، ملی، سیاسی، ہر قسم کا کلام شامل ہے، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے ایک خاص رنگ مین فرمایا ہے اور کوئی نہ کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے طبیعت پھڑک جاتی ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی آپ کا درجہ کم نہین، جو کچھ فرماتے ہین بعقد صاف فرماتے ہین کہ نفس مطلب برآسانی سے عبور حاصل ہوجاتا ہے۔

مذہبی رنگ مین امید کا فلسفہ ملاحظہ کیجئے، فرماتے ہین۔

قتل حسینؑ اصل مین مرگ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

کتنا حوصلہ افزا شعر کہا ہے جسے پڑھکر افسردہ طبیعتون مین بھی کامیابی کا ایک جوش پیدا ہوجاتا ہے، تلمیح کا نفس مضمون سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ جزو مضمون بن گئی ہے۔

مسلمانون کی تباہی و بربادی کی ان لفظون مین تصویر کھینچتے ہین، اور بتاتے ہین کہ ان کی ذلت و خواری مومن ہونے کی دلیل ہے، زور بیان ملاحظہ کیجئے۔

اس شان امتیاز کو دیکھو کہ اہل کفر — مومن سمجھ رہے ہین ہمین خوار دیکھکر

سیاسی رنگ ملاحظہ ہو۔

گر بوئے گل نہین نہ سہی بادِ گل تو ہے — صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

پہلے شعر مین یہ دکھاتے ہین کہ صیاد ہمکو اسیر کرکے ہمارے خیالات پر قابو نہین پا سکتا، اور دوسرے شعر مین فرماتے ہین کہ اسی اسیری کی سختیون نے ہم مین طاقتِ پرواز بڑھادی ہے اور ہمارے لئے مخلصی کے راستے کھول دیئے ہین، ان حقائق سے کسکو انکار ہو سکتا ہے۔

ایک غزل کے چند مسلسل شعر ملاحظہ فرمائیے، جسمین ادبی رنگ کے ساتھ ساتھ ناصحانہ اور عاشقانہ رنگ بھی موجود ہے

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہی یہی ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد تیری زلفون کا جو شانون پہ بکھرنا ہے یہی

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا اب بھی احساس ہو اسکا تو ابھرنا ہی یہی

ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست قلبِ مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی

نقد جان نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر کام کرنے کا یہی ہے تمہین کرنا ہے یہی

پہلے شعر مین زیست و مرگ کا ایسا دلکش اور ناصحانہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ تعریف نہین ہو سکتی، دوسرا شعر اگرچہ بظاہر عاشقانہ شعر ہے لیکن حقیقت شناس نظرین پہچانتی ہین کہ الفاظ کے پردے مین معنی کی کیسی دلکش تصویر پنہان ہے۔ تیسرا شعر قطعی غیر فانی اور تعریف سے مستغنی ہے قوم کی غفلت شعاری کی کتنی دلکش تصویر کھینچی ہے، اور پھر کس دلکش انداز مین ابھرنے کی ہمت دلائی ہے۔

تنقید کا ایک رخ آپ ملاحظہ فرما چکے، اب صرف دوسرا رخ باقی ہے، اسکے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ مولانا میدانِ سیاست کے مرد میدان ہین، میدان شاعری کے نہین، ممکن ہے کہ زبان و بیان کے لحاظ سے آپ کے کلام مین غلطیان ہون، اور ممکن ہے کہ بعض اشعار ایسے بھی ہون جنمین خامیان موجود ہون۔ لیکن ہمارے خیال مین مولانا کا قومی اور مذہبی جوش ان سب کا پردہ پوش ہے۔ کیونکہ آپ جو کچھ فرماتے ہین قومی و مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر کہتے ہین حتی کہ بعض وقت یہ بھی خیال نہین ہوتا کہ جو شعر یا جو مصرعہ موزون ہوا ہے وہ اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ چنانچہ آپ کی غزلون مین چند مصرعے ایسے بھی نظر آتے ہین جو دوسرے شعراء کی غزلون مین معمولی تغیر کے ساتھ موجود ہین۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اس قسم کا خیال

خود مولانا کے دل مین پیدا ہوا ہو،
آپ نے ایک مطلع فرمایا ہے۔

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

یہ مطلع مولانا آسی رحمۃ اللہ علیہ کے مطلع سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ مولانا آسی کا مطلع یہ ہے

صبا پہونچ کے یہ کہنا دہان سلام کے بعد کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا کے دماغ مین اس قسم کے خیالات کا آنا ناممکن ہے، خصوصاً جیل خانہ مین جبکہ عزیزون اور دوستون سے جدا ہو کر اس قسم کے جذبات و خیالات کا پیدا ہونا لازمی و فطری ہے۔

بہرحال یہ مجموعہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہے۔ کاغذ نفیس، کتابت جلی، طباعت دیدہ زیب، قیمت مہتمم مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے معلوم ہو سکتی ہے۔

وطن پرست

یہ کتاب "ریجنس ڈاٹر" مصنفہ الگزینڈر ڈوماس کا ترجمہ ہے۔ منشی تیرتھ رام صاحب فیروزپوری اسکے مترجم ہین، ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے، صرف کہین کہین پنجابی محاورے نظر آجاتے ہین۔ بہرحال مترجم کی کوشش قابل داد ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم ۳۹۹ صفحہ۔ ملنے کا پتہ۔ لال برادرس۔ پارسنز نولکھا لاہور

"اعظمی"

الفلاح

الفلاح، انجمن اشاعت اسلام جالندھر کی طرف سے ہر مہینے کی پہلی اور پندرھوین تاریخ کو شائع ہوتا ہے اسکے ایڈیٹر غازی رحمت اللہ صاحب ہین۔ مضامین عموماً مذہبی ہوتے ہین۔ ۱۵ اپریل کے پرچے مین اسلام اور مسلم کے عنوان سے ایک قابل قدر مضمون شائع ہوا ہے۔ مذہبی مباحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس رسالے کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ تقطیع ۲۲×۲۲ حجم ۱۶ صفحہ قیمت سالانہ للعہ مشتہاری ۴ عہ

شائقین اس پتے پر درخواست خریداری ارسال فرمائین۔ دفتر انجمن اشاعت اسلام جالندھر

داستانِ نیاز

(از محمد مبین نازش بدایونی)

ازل سے دیرِ مغاں میں ہیں رونقِ رخِ خوانِ نیاز
دیا ہے کوئے ملامت میں امتحانِ نیاز

چراغِ مردہ کی بو کیوں ہے خانۂ دل میں
مزارِ کشتۂ حسرت ہے یا نشانِ نیاز

رخِ صنم کی زیارت سے دل کو شاد کیا
ادائے نالۂ ناقوس سے زبانِ نیاز

ادا فریب تھے شاہد پرستیوں کے مزے
کسی کے ناز اُٹھا کر جتائی شانِ نیاز

لقائے دخترِ رز اور خندۂ مستاں
ثنائے پیرِ خرابات پھر زبانِ نیاز

حیا کا پاس نہ کچھ دل میں خوفِ رسوائی
سُنائی جلوہ فروشوں کو داستانِ نیاز

خیالِ یار کی وہ بے رُخی وہ غمزۂ شوخ
بگڑ بگڑ کے وہ کچھ طعنۂ فغانِ نیاز

اُدھر غرور کا اظہار اور شوقِ جفا
اِدھر سے عجز کا انداز ہم عنانِ نیاز

اُدھر یہ فکر کہ دل توڑنا ثواب ہے آج
اِدھر یہ عرض کہ جاتی رہیگی شانِ نیاز

اُدھر یہ طنزِ جنوں کے ہیں ولولے گستاخ
اِدھر یہ عذر کہ ہے اضطرابِ جانِ نیاز

اِدھر یہ دل کی تمنا کہ پائے بوس ہوں میں
اُدھر یہ شرم کہ ہو ہو نہ میں گمانِ نیاز

ہزار حیف کہ اِک عمر تک کئے سجدے
بتوں میں کوئی بھی نکلا نہ قدردانِ نیاز

کلیجہ تھام کے رہ جائیں مہ رُخانِ جہاں
سُنائے قصۂ رفتہ اگر زبانِ نیاز

ابھی ہے جلوہ پرستی کا ذوق لے ناصح
نہ چھیڑ دیکھ خبردار داستانِ نیاز

تصورات کو حیرت ہے ورنہ عقلِ بشر
اُمورِ کلیہ کیونکر ہوں رازدانِ نیاز

اُڑی ہے اسکی طرف بو جھکی ہے سجدہ میں شاخ
مجھے ہے جنبش و تحریک پر گمانِ نیاز

نظامِ عالمِ ہستی کا مدعا ہے یہی
نفس نفس کے لئے شرطِ امتحانِ نیاز

کبھی شمار میں اجزا سے کائنات نہوں
نفوس مدرکِ پرتنگ ہو جہانِ نیاز

دلیلِ عشق ہے حکمت ہو شیخ کی معدوم
وہ بے نیاز دکھائے جو اپنی شانِ نیاز

یہ زہد میں ہے کوئی زہد ہم نہیں قائل
کہ دل میں کفر جبیں پر رہے نشانِ نیاز

اسطرح جو رہی اتقا کی پابندی
تو ایک روز اُجڑ جائیگا جہانِ نیاز

خونِ آرزو

اب تو امید سے بھی ہوں محروم — میری تقدیر یا مرا معصوم
تیری ہستی حسن "معنی خیز" — میرا عشق "ایک لفظ بے مفہوم"
کھول دے پردۂ حقیقتِ راز — عقل کی ہر زہ کاریاں معلوم
توڑ دے خود طلسم ہستی کا — کیوں ہے سرگشتۂ قیود و رسوم
عشق کی بخت کاریاں! توبہ — دل سے شوقِ طلب بھی ہے معدوم
نالۂ نیم شب، خروشِ سحر — ہیں اب اور ایک خاطرِ مغموم
رنگ لائیگا یہ تغافلِ حسن — جان دیدے گا عاشقِ مظلوم
ایک جان اور غموں کا یہ انبوہ — ایک دل اور یہ حسرتوں کا ہجوم
اُس کے مٹتے ہی مٹ گئی دنیا — ہائے اِک چیز تھا دلِ مرحوم
شوق افسردہ، جوش پژمردہ — ہو گئی دہر کی ہوا مسموم
میکدے میں نہ ولولے ہیں نہ کیف — نہ حریفانِ بادہ نوش کی دھوم
یادگارِ زمانۂ ماضی — ایک اُمید ہے سو وہ موہوم

ہو چکا خونِ آرزو فہمی
مِل گئی داد حسرتِ معصوم

فہمی بدایونی

آئینۂ حال

کیا خوب جہان کی بستی ہے، مظلوم کوئی جلّاد کوئی
کرتا ہے کوئی داد طلب، اور کرتا ہے بیداد کوئی

ہے کام کسیکا رحم و کرم، کرتا ہے ستم ایجاد کوئی
حاتم کا مقلد ہے کوئی، ہے معتقدِ شدّاد کوئی

تعمیر کہین پر جاری ہے، گھر بسنے کی تیاری ہے
آباد کوئی گھر ہوتا ہے، اور ہوتا ہے برباد کوئی

ہوتا ہے کہین ناچ اور گانا، گھر کوئی بنا ماتم خانہ
مسرور کوئی رنجور کوئی، غمگین کوئی دلشاد کوئی

نادار کوئی، زردار کوئی، مجبور کوئی مختار کوئی
ماتحت کوئی سردار کوئی، پابند کوئی آزاد کوئی

حاکم ہے کوئی محکوم کوئی، خادم ہے کوئی مخدوم کوئی
شادان ہے کوئی مغموم کوئی، ہے صید کوئی صیّاد کوئی

مفلس ہے کوئی، امیر کوئی، محتاج کوئی ہے فقیر کوئی
ہے شاہ کوئی، ہے وزیر کوئی، اور مانگتا ہے امداد کوئی

جینے سے پریشان ہے کوئی، ہستی پر نازان ہے کوئی
ماتم میں گریان ہے کوئی، گاتا ہے مبارکباد کوئی

غالب ہے کوئی، مغلوب کوئی، طالب ہے کوئی مطلوب کوئی
عاشق ہے کوئی محبوب کوئی، شیریں ہے کوئی فرہاد کوئی

واصل ہے کوئی مہجور کوئی، ہے کوئی قرین اور دور کوئی
ہے بادۂ وصل سے چور کوئی، اور ہجر سے ہے ناشاد کوئی

ہر نوع کے شاعر بھی ہین یہان، بزمی ہے کوئی احسن کوئی
نوشی کوئی نقّاد کوئی، شاگرد کوئی اُستاد کوئی

عبدالصمد بزمی (دبائی)

لطفِ سخن

(جناب نادرت سیرٹھی)

کچھ بھی نہ تھا نکلتے ہی پیکانِ آرزو
تھی دل کی جان کاوشِ پنہانِ آرزو

پہلے تو دل کو پھونک لیا ضبطِ آہ سے
اب دم بخود ہین سوختہ سامانِ آرزو

دنیا مین کیا پڑھے گا کوئی میری سرگذشت
لکھا ہے دل کے خون سے عنوانِ آرزو

مین اُنکی آرزو کو سمجھتا ہون جانِ دل
وہ میرے دل کو جانتے ہین جانِ آرزو

ہم سے رُکے گا گریۂ بے اختیار کیا
پوشیدہ ہے ہر اشک مین طوفانِ آرزو

الزام سر پہ حسن کی رسوائیون کا ہے
ہے ابتدا سے عشق پشیمانِ آرزو

آئی دمِ اخیر صدائے شکستِ دل
ٹوٹا ہے آج کیا درِ زندانِ آرزو

رگ رگ مین دل کی جال ہے امید و بیم کا
اب کشمکش سے چھوٹ چکی جانِ آرزو

اے آسمان! کچھ مجھے خوفِ خدا بھی ہے
یہ دل نہ بحرِ عشق، نہ طوفانِ آرزو

ہے دل مین خارِ غم تو نکلنے کی کیا امید
اُلجھا رہے گا گوشۂ دامانِ آرزو

ندرت سے کہہ رہی ہین اُمنگین شباب کی
کیا اب کچھ اور چاہیے سامانِ آرزو

ابوالمعانی جناب مرزا یاس لکھنوی

قفس کو جانتے ہین یاس آشیان اپنا
مکان اپنا زمین اپنی آسمان اپنا

ہوائے تند مین ٹھہرا نہ آشیان اپنا
چراغ جل نہ سکا زیرِ آسمان اپنا

بس ایک سایۂ دیوار یار کیا کم ہے
اُٹھالے سر سے مرے سایہ آسمان اپنا

ہمارے قتل کا وعدہ ہے غیر کے ہاتھون
عجیب شرط پہ ٹھہرا ہے امتحان اپنا

مزے کے ساتھ ہون اندوہ و غم تو کیا کہنا
یقین نہو تو کرے کوئی امتحان اپنا

شریکِ حال ہوا ہے جو فقر و فاقہ مین
گرا لگا ساتھ ہی کیا اپنے میہمان اپنا

سُنا ہے رنگ زمانہ کا اعتبار نہین
بدل نہ جائے یقین سے کہین گمان اپنا

عجیب بھول بھلیاں ہے منزل ہستی
بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کاروان اپنا
کدھر سے آتی ہے یوسف کی بوئے پیراہن
خراب پھرتا ہے جنگل میں کاروان اپنا
جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤں کاروان اپنا
خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیان اپنا

ہمارا رنگ سخن پاس کوئی کیا جانے
سوائے آتش سے کون ہمزبان اپنا

جناب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی

میری بیربطی فریاد پہ مسرور نہو
غمزدے کیا کریں جب ضبط کا مقدور نہو
پھر وہ الفت نہو بلکہ ہوسنائی ہے
ذرہ ذرہ جو مری خاک کا منصور نہو
امتیاز من و تو سہل نہیں ہے کہ مٹے
دل سمندر گرم فنا تو ابھی مسرور نہو
ایک چٹکی میں تسلی نہیں ہوتی دل کی
تم جلا دو مجھے لیکن شرر طور نہو
واہ کس لطف سے اٹھا ہے دوئی کا پردہ
حسن خود بین نے کہا عشق کا مذکور نہو
وصل میں ہجر ہو اور ہجر میں ہو لذت وصل
میں طلبگار ہوں اس دل کا جو مجبور نہو
تو نے اے عشق زلیخا جسے یوں جذب کیا
دیدۂ حضرت یعقوب کا وہ نور نہو
اب نظر آتے ہیں دل میں جو مٹے سے کچھ نقش
ایک بھی ان میں نہ ایسا تھا جو مستور نہو
قابل رشک ہے وہ دل کہ محبت میں جسے
ہجر کی تاب نہو وصل کا مقدور نہو
ہیں خلوت کدۂ ناز میں رکھتے ہیں قدم
خیر تو جلوہ نما اے بت مغرور نہو
اشک خون بنکے ٹھہر جا سر مژگان ابدل
دار موجود ہے صاحب جو منصور نہو
دیکھنے کے لئے کچھ فاصلہ لازم ہے کلیم
جو رگ جان سے قریب اتنا ہو کیوں دور نہو

بد نما داغ ہے اک دامن ہستی پہ اثر
دل اسے کیوں کہیں جلووں سے جو معمور نہو

جناب حکیم جگر صدیقی بسوانی

ہم اس بزم میں میہمان جا رہے ہیں
بلایا ہے کس نے کہاں جا رہے ہیں
اٹھے ہیں جو خوش خوش کوئی پوچھے
وہ دفنا کے ہمکو کہاں جا رہے ہیں
مرے بعد اتنا خیال ان کو آیا
مٹانے لحد کا نشان جا رہے ہیں

عدم جانے والے عدم کو سدھارے — کسی نے نہ پوچھا کہاں جا رہے ہیں
خدا ہی جو پہونچائے اُن کو تو پہونچیں — عدم کو ترے ناتوان جا رہے ہیں
مجھے دَر سے اُٹھوا کے کہتے ہیں ہنسکر — کوئی اِنسے پوچھے کہاں جا رہے ہیں
بڑے لُطف سے ہم چلے ہیں قفس کو — لیئے دوش پر آشیاں جا رہے ہیں
کسی نے نہ اے موت ہمکو بتایا — کہاں سے ہم آئے کہاں جا رہے ہیں
خجل ہونگے میخانے میں شیخ صاحب — مرے ساتھ حضرت کہاں جا رہے ہیں

جگر ہمکو بہکا کے دل لیچلا ہے
نہیں کیا بتائیں کہاں جا رہے ہیں

جناب احسن سمبھلی ناظم حلقہ ادبیہ کانپور

سرِ محفل کہیں چھن جائے نہ حاصل میرا — نگہِ ناز کو دعویٰ ہے کہ ہے دل میرا
حسن والوں کو بنا دیتا ہے قاتل میرا — یہ مری جان کا دشمن ہے کہ ہے دل میرا
دیکھ لیں وہ بھی تڑپنا سرِ محفل میرا — پھر بُرا حال بنائے طپشِ دل میرا
ہائے رے ہائے ترے دستِ تسلی کے مرے — کاش پہلو میں تڑپتا ہی رہے دل میرا
داغِ ناکامی و مایوسی ارمان و امید — ایک دنیا لئے دنیا سے چلا دل میرا
وہی وحشت وہی صورت وہی ہُو کا عالم — کوئی ویرانہ ہے پہلو میں کہ ہے دل میرا
بیخودی میں مجھے احساسِ الم تک نہ رہا — اب خدا جانے کہ یہ درد ہی یا دل میرا
دامنِ یار پہ گر گر کے مچلنا دیکھو — قطرہ قطرہ مرے آنسو کا بنا دل میرا
اُف رے محفل میں تری شوخ نگاہی ظالم — آج پہلو میں ہر اک شخص کے ہے دل میرا
پھر اُنھیں دیکھ کے کیا جانئے کیا یاد آیا — حشر میں حشر اُٹھائے نہ کہیں دل میرا
یوں سمجھ لیجئے افسانۂ طور و موسیٰ — آپ کی جلوہ گہِ ناز تھی اور دل میرا
نگہِ مست ذرا دل پہ سنبھل کر گرنا — ٹوٹ جائے نہ کوئی آبلۂ دل میرا
عالمِ بیخودیٔ عشق بھی کیا عالم ہے — نہیں معلوم کہاں میں ہوں کہاں دل میرا

شغلِ مے فرقتِ ساقی میں نہ چھوٹا احسن
بادہ ہے خونِ جگر ساغرِ مے دل میرا

علمی نوٹ اور خبرین

(منشی نوبت رائے نظر مرحوم)

ادبی دنیا مین یہ خبر نہایت اندوہ وغم کے ساتھ سُنی جائیگی کہ ۱۰-اپریل کو لکھنؤ کے سرآمد شعرائے حال اور اُردو کے نامور انشا پرداز منشی نوبت رائے صاحب نظر کا انتقال پُرملال ہوگیا - مرحوم کچھ عرصہ سے مرض ضیق النفس مین مبتلا تھے، مگر اسطرف صحت یاب ہو رہے تھے اور کسی کو خبر نہ تھی کہ موت اسقدر جلد اُنکو ہم سے جدا کرنیوالی ہے، گذشتہ فروری مین اُنھون نے رسالہ زمانہ کے خاطر اکبر مرحوم کے خطوط کی تنقید لکھنا شروع کی، اسکا ایک حصہ حسبین مخدومی مولینا حسن نظامی صاحب کے نام خطوط پر ریویو زمانہ کے پچھلے نمبر مین شایع ہوچکا ہے، دوسرا حصہ مکرمی عزیز صاحب کے نام خطوط کے متعلق ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت سے لکھا جانیوالا تھا، مگر شائد کچھ اور بھی، اور قبل اسکے کہ یہ مضمون ختم ہوسکتا سفر آخرت درپیش ہوگیا - اُردو ادب کے لئے یہ وفات حسرت آیات ایک صدمۂ عظیم ہے، جسکی تلافی ناممکن ہے جس یکسوئی اور یکدلی سے مرحوم نے اپنی زندگی اردو ادب کی توسیع و ترقی کے لئے وقف کر رکھی تھی اُسکی صرف چند ہی مثالین ملک مین ہونگی، اوائل زندگی سے آخر عمر تک مرحوم ملک کے بہترین ادبی خدمت مین مشغول و مصروف رہے - پہلے اُنھون نے خود ایک رسالہ خدنگ نظر جاری کیا، جب ملک اسکے بار کا متحمل نہ ہوسکا تو وہ ۱۹۰۴ء مین رسالہ زمانہ کے اسٹاف مین شامل ہوگئے، اور یہان کئی سال تک برابر کام کرتے رہے - دفتر کے معمولی کامون کے علاوہ اُنھون نے رسالہ ہذا کی بہترین تنقیدین لکھین جنکا مطالعہ آج بھی اہل ذوق کے لئے مفید اور سبق آموز ہوسکتا ہے، حصہ نظم کی ترتیب و تدوین بھی آپ کے ذمہ تھی کئی سال تک کام کرنے کے بعد آپ انڈین پریس الہ آباد مین چلے گئے جہان سے آپ کی ایڈیٹری مین اُردو کا مشہور و معروف رسالہ ادیب جاری ہوا - دو سال کے بعد بعض وجوہ سے آپ کا اس سے قطع تعلق ہوگیا اور پھر اپنے وطن مین آکر جا گزین ہوئے لیکن ۱۹۱۲ء مین ایڈیٹر زمانہ کی محبت آپ کو پھر کانپور کھینچ لائی - یہان آکر اس دفعہ آپ نے اخبار آزاد مین بھی ایڈیٹر زمانہ کا ہاتھ بٹایا - بعد چندے کچھ دنون کیلئے آزاد روزانہ شایع ہوا اور اس سلسلے مین آپ کو بھی اخبار نویسی کا کام کرنا پڑا جس سے اس مدمین بھی آپ کو مشق اور تجربہ حاصل کرنے کا پورا موقعہ مل گیا - چنانچہ تھوڑے ہی دنون مین آپ نے پولٹیکل اخبارون کے

ایڈیٹری کی قابلیت بھی حاصل کرلی۔ مسٹر حامد علیخا نصاحب مرحوم کے توسط سے آپ کو مطبع منشی نولکشور نے اپنے یہان بُلالیا، یہان پہلے تو تصحیح کی ایڈیٹری اور بعدہ اودھ اخبار کا قلمدان ادارت آپ کے سپرد کیا گیا آپ کے وقت مین اودھ اخبار کی بالکل کایا پلٹ ہوگئی اور یہ قدیم اخبار بھی متانت اور اعتدال کو مدنظر رکھتے ہوئے رفتار زمانہ سے متاثر ہونے لگا، مگر روزانہ اخبار کی ذمہ داری آپ کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی اور اس سلسلے مین جو محنت شاقہ کرنا پڑی اُس سے آپ کی تندرستی خراب ہوگئی، سو اتفاق سے پیم خانگی صدمات نے طبیعت کو اور بھی نڈھال کردیا، پہلے آپ کا نواسہ جسکو آپ بہت چاہتے تھے داغ مفارقت دے گیا، پھر مادر مہربان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، اور بھی کئی خاندانی صدمات پہونچے۔ آخر مین آپ کی اکلوتی بیٹی بھی داغ مفارقت دے گئی۔ غرض پے در پے حادثات نے مرحوم کو بہت دل برداشتہ کردیا، اِدھر تندرستی نے جواب دیدیا تھا اُدھر اودھ اخبار سے قطع تعلق ہوگیا، اور اسکے ساتھ ہی اطمینان قلب بھی رخصت ہوگیا۔ چنانچہ ان حادثات اور تفکرات کا عکس آپ کے آخر زمانہ کے اشعار مین موجود ہے، اس طرف دو تین سال سے جب آپ اپنی زندگی و تندرستی کا ذکر کرتے تو اس طرح باتین کرتے تھے، گویا زندگی سے سیر اور دنیا سے بالکل مایوس ہوگئے ہین، کلام مین بھی اکثر اشعار اس طرز کے نظم ہوئے تھے جنسے معلوم ہوتا تھا کہ مرحوم کا دنیا سے جی بھر گیا ہے اور موت کا شوق سے انتظار کر رہے ہین اور اسکو دنیوی کشمکش کا خاتمہ اور مصائب زندگی کا علاج سمجھتے ہین، آپ کے لفظ لفظ سے بیدلی اور مایوسی مترشح ہوتی تھی، مثال کے طور پر آخر زمانہ کے چند اشعار ملاحظہ ہون۔

نقاب چلکے کرنا چاہیے آباد مرقد کو — بہت ہی منتظر اپنی زمین گور غریبان کی

موت سے کیا ساز کر رکھا ہے اُسنے اے نظر — مدتین گذرین سبب کھلتا نہین تاخیر کا

زندگی کی کشمکش سے مرکے پائی کچھ نجات — اِس سے پہلے اے نظر فرصت کبھی ایسی نہ تھی

بار الم نہ اُٹھ سکا، کثرت اضطرار مین — مرکے سبب ہوا ہون مین دیدۂ اعتبار مین

اِس سلسلے مین فروری کی غزل کے دو ایک شعر خاص طور پہ قابل ملاحظہ ہین۔

مدت سے ڈھونڈتا ہون ملتا مگر نہین ہے — وہ یک سکون خاطر جو بیشتر نہین ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی — زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھکو خبر نہیں ہے
آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑتا ہے باقی — اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہوگئی ہو دنیا ہی جب نظر میں — پھر کوئی امتیاز شام و سحر نہیں ہے

دنیا سے جا رہے ہو کیا لیکے اے نظر تم
زادِ سفر نہیں ہے رختِ سفر نہیں ہے

طولِ غم سے مختصر غم کی کہانی ہوگئی — جب بھری اک آہ دل کی نوحہ خوانی ہوگئی
ختم دورِ بے کسی اے دارِ فانی ہوگئی — ہم بھی زندہ تھے کبھی دو روز جانی ہوگئی
ہر قدم پر ایک نالہ ہر نفس پر ایک آہ — زندگی کیا ایک شرحِ سخت جانی ہوگئی
ہجر میں آنکھوں سے جاری ہے برابر سیلِ اشک — بند دو کوزوں میں دریا کی روانی ہوگئی

مے کو دنیا آتشِ سیال کہتی ہے نظر
لیکن اپنے جام میں آتے ہی پانی ہوگئی

دنیوی نقطۂ خیال سے نظر صاحب کی زندگی ایک ناکامیاب زندگی تھی مگر اردو زبان کے بہترین انشاپردازوں کے لئے ابھی تک دنیا میں فراغت کی زندگی بسر کرنے کا کوئی سامان نہیں ہے، نظر صاحب کو ابتدائے زندگی ہی سے علم و ادب سے دلچسپی ہوگئی تھی، یہ دلچسپی آخر عمر تک انھوں نے اس طرح قائم رکھی کہ زندگی بھر انھوں نے کوئی اور مشغلہ اختیار ہی نہیں کیا۔

فطرت سے انھوں نے علم ادب کے لئے نہایت موزون طبیعت پائی تھی۔ قدرت نے انھیں نہایت شستہ و سلیم ذوقِ سخن عطا کیا تھا، بچپن میں انکو بہت اچھی صحبت ملی تھی، جس سے طبیعت میں رفعت، مزاج میں تہذیب متانت و سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی، انکا ذہن بھی بلا کا تھا کہ جس بات کو اور لوگ مہینوں میں حاصل کرتے اُسپر وہ چند دنوں کی محنت میں حاوی ہو جاتے تھے۔ انکا معیارِ خیال بہت اونچا، ان کا مطمحِ نظر بلند اور رفیع تھا، انکی پسند مشکل ہوتی تھی، خیالات وسیع، اور نظر غائر، اور نکتہ رس رکھتے تھے، طبیعت دوررس اور دماغ نکتہ سنج پایا تھا، ہر اعتبار سے آپ کا کلام اُردو کے بہترین شعراء کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے، انکی زبان صاف اور پاکیزہ، انکی بندشیں چست اور طرزِ بیان ہمیشہ بے عیب ہوتا تھا۔ ہمیشہ لطیف اور نفیس خیالات ہی کو نظم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہتات کی انھوں نے کبھی پرواہ نہ کی۔ اپنے اشعار میں بلحاظ فن وہ ہر دم تکمیل کا درجہ حاصل کرنے کے درپے رہتے تھے جبتک

لوئی خاص نکتہ اُنکے ذہن مین نہ آتا کبھی نظم ونثر کی طرف رجوع نہ ہوتے تھے۔ مگر جدت کی تلاش مین وہ دور از کار استعارات، مبہم اور مغلق ترکیبون اور بے معنی بندشون سے ہمیشہ بہت سختی سے بچتے چیثیت نقاد سخن انکا درجہ دور جدید کے تنقید نگارون مین بہت اونچا تھا۔ انکی بعض تنقیدین جو زمانہ مین چھپ چکی ہین اپنے قسم کی بہترین تنقیدین ہین، اور ہم سمجھتے ہین کہ دنیاے اُردو مین ان مباحث وموضوع پر اسوقت بھی ان سے بہتر تنقید لکھنے والا موجود نہین ہے۔ اردو زبان کو انکی بے وقت وفات سے جو نقصان پہونچا ہے اسکا اندازہ ناممکن ہے۔ رسالہ زمانہ کے لئے تو یہ ایک ناقابل تلافی حادثہ ہے۔ ایڈیٹر کی ذات کے بعد صرف دو ہی چار نام زمانہ کے خاص کارکنان مین شامل کئے جا سکتے ہین۔ نظر۔ سرور۔ اور پریم چند نے اس رسالہ کی ترقی مین جو حصہ لیا ہے اسکے لئے یہ رسالہ ہمیشہ انکا ممنون منت رہے گا۔ سرور کی جدائی کا غم ابھی تک تازہ ہے۔ افسوس نظر بھی اب اس دنیا مین ہمارا ساتھ دینے کو موجود نہین رہے۔ افسوس وہ دل ودماغ جسکے نور باطن سے زمانہ کے صفحات اکثر منور ہوا کرتے تھے آج بے حس وحرکت ہوگیا ہے۔ آہ انسانی زندگی کیسی بے اعتبار و بے اختیار ہے۔ کل جسکو اپنا سمجھتے تھے۔ آج وہ بیگانہ ہوگیا۔ مگر دنیا کا یہی لکھا ہے ؎ بہت آگے گئے باقی جو ہین تیار بیٹھے ہین، خداوند تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت مین جگہ دے، اور پسماندگان کو اس حادثۂ عظیم کے برداشت کی طاقت عطا فرمائے۔

ایک خادم علم کی وفات افسوس کہ منشی عبداللہ خانصاحب مرحوم نے ۱۶ اپریل کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی آپ مشہور ومعروف پبلشر کتب تھے، بعض کتابون کے مصنف بھی تھے، چیدہ اور منتخب کتابون کی تجارت کرتے تھے، ۷۰ برس تک کتبخانہ آصفیہ مین رہے، آخر عمر مین آنکھون سے معذور ہوگئے تھے، اور حین حیات تک ۵۰ ماہوار سرکار آصفیہ سے وظیفہ پاتے رہے۔

تاریخ دکن سینت نہال سنگھ صاحب انگریزی مین دکن کی تاریخ لکھ رہے ہین، اس سے پہلے آپ کو سرکار سے ۱۵ ہزار روپیہ اس کام کے لئے عنایت ہوچکا ہے، حال مین پانچہزار کی رقم اور بھی عطا کی گئی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا امریکہ کی ایک سوسائٹی انسائیکلوپیڈیا کا ایک خاص اڈیشن شائع کرنا چاہتی ہے جسکا حجم کم سے کم اور معلومات زیادہ سے زیادہ ہونگی، کاغذ باریک اور اعلیٰ قسم کا ہوگا، ضخامت صرف اتنی ہوگی کہ یہ آسانی ہینڈ بیگ مین بند ہوسکے، اور سفر مین کام دے سکے۔

زمانہ

جلد ۴ جون سنہ ۱۹۲۳ء نمبر ۶

جاپان

براعظم ایشیا کے مشرقی طرف جزیروں کا ایک مجموعہ واقعہ ہے۔ جسکا نام جاپان ہے۔ براعظم ایشیا کا وہ حصہ جو جاپان سے نزدیک ہے۔ جزیرہ نمائے کوریا کے نام سے مشہور ہے۔ جو بحیرۂ زرد کو بحیرۂ جاپان سے جدا کرتا ہے۔ کوریا جو "سرزمین سکوتِ صبح" کے نام سے مشہور ہے بہت پرانا ملک ہے۔ وہ منظر کتنا خوشنما ہوتا ہے جب کرۂ آتشیں سمندر سے نہا کر نکلتا ہے۔ اسکی سنہری کرنیں لہروں پر رقص کرتی ہیں اور اسکی روشنی سے آسمان پر ہلکے اور خوشنما رنگوں کے تار بندھ جاتے ہیں۔ چینی لوگ قدیم الایام سے اس شاندار مشرقی منظر کو دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اور انکے اسلاف اپنی کتابوں میں اس شاندار مشرقی سمندر کے جزیرہ میں رہنے والے خیالی دیوتاؤں کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں لکھ گئے ہیں۔ اس طرح جاپان طلوع آفتاب کا ملک ایک پاک اور پُراسرار سرزمین گنا جانے لگا۔ جسکے باشندے جائز فخر سے اپنے آپ کو دیوتاؤں کی اولاد بتلاتے ہیں۔ کچھ مدت کے بعد ملک میں دیوتاؤں۔ اوتاروں اور روحوں کی پرستش شروع ہوگئی۔ جسکا اثر ابتک جاپانیوں پر باقی ہے۔ اس مذہب کو شنٹو ازم یعنی "دیوتاؤں کا طریق" کہا جاتا ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ غاروں میں رہنے والے انسانوں کے بعد جاپان میں

اینو AINU قوم کے لوگ سائبریا سے آکر آباد ہوئے۔ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سائبریا جیسے یخ بستہ ملک کے مقابلہ میں انھوں نے ان جنوبی زرخیز اور خوبصورت جزیروں کو جنکی آب وہوا نہایت معتدل اور فرحت بخش ہے۔ کسقدر پسند کیا ہوگا۔ اینو قوم کو ہر دفعہ مہذب حملہ آوروں کے سامنے پسپا ہونا پڑا۔ ان حملہ آوروں میں سے بعض تو چینیوں کے شابہ منگولین قوم سے تھے۔ جو بحیرۂ جاپان کو طے کرکے کوریا منچوریا سے آئے تھے۔ اور بعض ملائے MALAY قوم سے تھے جو جنوبی ایشیا سے آئے تھے۔ اگرچہ موجودہ جاپانی انھیں دونوں بڑی قوموں کی اولاد ہیں۔ تاہم اینو قوم کے لوگ کامل طور پر جاپان سے خارج نہیں ہوسکے۔ اب بھی شمالی جاپان میں ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ وہ جاپانی قوموں سے علیحدہ رہتے ہیں اور اُنکے جسم پر بہت زیادہ بال ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ عام طور پر امن پسند ہیں۔ اور انمیں بعض اچھی صفات بھی پائی جاتی ہیں تاہم انکو اپنی ترقی کا کچھ خیال نہیں۔ اور انکا گزارہ صرف مچھلی اور جنگلی جانوروں کے شکار پر ہے۔

جاپانیوں کے کئی تیوہار ہیں جنمیں سے دو زیادہ مشہور ہیں جو ۱۱ فروری اور ۳ اپریل کو منائے جاتے ہیں۔ انمیں سے اول الذکر تاریخ ان کے سب سے پہلے شہنشاہ کی تخت نشینی کی یادگار ہے۔ اور دوسری اُسکی وفات کی۔ اُسکا نام جمیو JIMMU تھا جو آج سے ۲۵۰۰ سال پہلے گزرا ہے۔ جاپانی کہتے ہیں کہ اسکی اولاد اسوقت سے لیکر آج تک ان پر حکمراں رہی ہے۔ لیکن اس طویل عرصہ کی ابتدائی تاریخ کچھ زیادہ معتبر نہیں۔

کوریا کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے۔ مسیح سے قریباً ہزار سال پہلے پرانے مہذب چینی اس کوہستانی جزیرہ نما میں آئے۔ انھوں نے پرانے غاروں کے رہنے والوں کو ملک سے باہر نکال دیا۔ اور خود مختار ریاستیں قائم کرلیں جو بعد میں ایک ہی بادشاہ کی ماتحت ہوگئیں مسیح سے قبل اور بعد کے زمانہ میں چینی اور کورین لوگ جاپان میں بکثرت پھیل گئے۔

یہ پرانی داستانیں درست ہوں یا نہوں لیکن اسمیں شبہہ نہیں کہ جاپان اور کوریا کے لوگوں میں اُن دنوں بہت آمد و رفت تھی۔ جاپانی چینیوں کی طرح شروع سے نہروں کے کاٹنے دھان کے کھیتوں میں پانی لانے اور تجارت اور مصنوعات کی ترقی کی طرف بہت متوجہ تھے

وہ زمانۂ قدیم ہی سے اپنے اباؤ اجداد کی عزت کرنے کے خوگر تھے۔ چنانچہ بادشاہ میکاڈو MIKADO بھی قابل پرستش مان لیا گیا جسکے پاس تک عام آدمیوں کی رسائی ناممکن تھی۔

چھٹی صدی میں جب اینگلو سیکسن قوم انگلستان میں آباد ہو رہی تھی اُسوقت بودھ مذہب چین اور کوریا کے ذریعہ جاپان میں پھیلنا شروع ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے اتنی اہمیت حاصل ہوگئی کہ پرانے مذہب شنٹوازم کے برابر مقتدر سمجھ لیا گیا۔

امیروں کے کئی طبقے تھے۔ ہر طبقہ دوسرے سے بازی لیجانے کے لئے برسرپیکار رہتا تھا۔ جوں جوں مکاڈو کی زندگی پس پردہ گزرنے لگی امیروں اور سرداروں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ اصلی حکمراں طاقت کا سردار شوگن SHOGUN کہلاتا تھا۔ یوری ٹومو YORITOMO جو ایک قابل جرنیل تھا سب سے پہلا شوگن تھا۔ آخری شوگن ۱۸۶۸ء میں سلطنت سے دستکش ہوگیا۔ شوگنوں کے عہد میں جاپان خانہ جنگیوں کا گھر بنا ہوا تھا بڑے بڑے خاندانوں کے جھگڑے لڑائیوں سے طے ہوتے تھے۔ سپاہی لوگ مضبوط قلعوں میں رہتے تھے۔ وہ سامورائی کہلاتے تھے اور کسی غنیم کے حملہ آور ہونے کے وقت مالکان اراضی کا فرض تھا کہ وہ خطرہ کے انسداد کے لئے اُمرا کو مدد دیں۔

جب چین کے منگول بادشاہ کبلا خاں KABLA KHAN نے آرین اور چینیوں کا ایک جرار لشکر جاپان کی تسخیر کو بھیجا تو سارا جاپان اپنے پاک ملک کو غنیم سے بچانے کے لئے سربکف تیار ہوگیا۔ حسن اتفاق سے ساحل جاپان کے قریب یہ عظیم بیڑہ طوفان سے تباہ ہوگیا۔ اور اُسدن سے آج تک کسی اور دشمن نے جاپان پر فوج کشی نہیں کی۔

مارکو پولو MORCO POLO مشہور سیاح پہلا آدمی تھا جس نے جاپان کا تعارف مغربی دنیا سے کرایا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں اس ملک کا نام کپنگو CIPANGO بتاتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ سمندر کے وسط میں چین کے مشرق کی طرف ایک جزیرہ ہے۔ اسکے باشندے گوری رنگت کے ہیں اور اُنکا مذہب بت پرستی ہے۔ وہ کسی کے دست نگر نہیں ہیں۔ کیونکہ سونا خود اُنکے ملک میں دستیاب ہوتا ہے

اُن دنوں جب مختلف قومیں نئے ملکوں کی تلاش میں مصروف تھیں - ہر جگہ بحری ڈاکو لوٹ مار کر رہے تھے - جاپان بھی اس دلیرانہ بیباکی میں کسی سے پیچھے نہیں رہا - اور ان کے تجارتی جہاز - ہندوستان - سیام - اور اغلباً میکسکو تک دھاوا کرتے رہتے - کولمبس کی وفات سے تھوڑی مدت بعد پرتگالیوں نے ہندوستان کا وہ مشرقی راستہ دریافت کر لیا جسکے لئے کولمبس مغرب کی طرف بے سود کوشش کرتا رہا - وہ ہند سے چین اور آخر کار جاپان میں جا پہونچے - اسکے بعد جاپان مغربی ممالک کے واسطے کئی ایک دلچسپیوں کا مرکز بن گیا -

گذشتہ صدی کے وسط میں جاپان میں ایک حیرت خیز انقلاب رونما ہوا - وہ جاپان جو ابتک دوسرے ممالک کی نظروں سے اوجھل اپنی زراعت و تجارت اور مصنوعات کی ترقی میں غرق تھا - اب بیرونی طاقتوں سے صلحنامے تحریر کر رہا تھا - یوکوہاما کا بندرگاہ تمام ممالک کی بحری تجارت کے واسطے کھول دیا گیا - شوگن کو معہ اپنے دقیانوسی خیالات کے رخصت ہونا پڑا - اور دوبارہ میکاڈو (جو ابھی تک زرّیں محلوں میں خواب ہستی کے مزے لوٹ رہا تھا) ملک کا حقیقی حکمراں اور بادشاہ مقرر ہوا -

پچھلے ستر سال کی ترقی ایک محیر العقول سرگذشت ہے - مغرب سے ملتے ہی جاپان نے اپنا صدیوں کا پرانا دستور یک قلم موقوف کر دیا - ازمنہ وسطی کی جہالت کو چھوڑ کر جونہی جاپان نے موجودہ تمدن و تہذیب کے میدان میں قدم رکھا - تو اُسکی معاشرتی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا - تشنگان علم - امریکہ اور یورپ میں اپنی پیاس بجھانے کو دوڑے - سڑکیں اور پل بنائے گئے - ریل - تار برقی - ٹیلیفون کا ملک میں جال بچھا دیا گیا - بنک - کارخانے - سوداگروں کی کوٹھیاں اور تجارت کی منڈیاں بیش از پیش ظہور میں آنے لگیں - قانونی عدالتیں قائم کی گئیں اور ۱۸۸۹ء میں ایک قانون کے رو سے مجلس نمایندگان ملک ظہور میں آئی - تعلیم جدید کا عام چرچا ہو گیا - آزادی نسواں کی لہر ملک بھر میں دوڑ گئی - مغربی عادات اور لباس نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا - ایک عظیم الشان بحری اور بری طاقت نے ملک کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے -

۱۸۹۴ء و ۱۸۹۵ء میں چینیوں کے ساتھ جو محاربہ ہوا۔ چھ ماہ جاری رہا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرہ فارموسا چینیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور دنیا کو پتہ لگ گیا کہ مشرق بعید میں ایک ایسی طاقت کا ظہور ہوا ہے جو اسکی آیندہ قسمت کی مالک ہوگی۔

یہ قیاس درست نکلا۔ کیونکہ جو شاندار کامیابی جاپان نے جنگ روس و جاپان میں حاصل کی اُسکی چمک نے یورپ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ روس کو شکست فاش ہوئی۔ مکڈن MUKDEN اور پورٹ آرتھر PORT ARTHUR پر جاپانیوں نے عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ آخر کار پریزیڈنٹ روزولٹ ROSE VELT نے اگست ۱۹۰۵ء میں متخاصمین کے مابین صلح کرادی۔ اس لڑائی سے کوریا جاپان کے قبضہ میں آگیا۔ جہاں کی کل حکومت جاپانیوں نے اپنے ذمہ لے لی۔

اس لڑائی کے نتیجہ نے مغرب کی آنکھیں کھولدیں۔ جاپان کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔ اور ایک نیا خوف اُنکے دلوں کو مرعوب کرنے لگا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جاپان کو جسقدر نازاپنی کامرانی پر ہو تھوڑا ہے۔ ہر جاپانی لڑکے کو شروع سے سکھایا جاتا ہے کہ اُسکی زندگی کا سب سے شاندار مقصد اپنے بادشاہ اور ملک کے لئے جان قربان کر دینا ہے اُسکا عزم راسخ ہوتا ہے اور اُسکا ارادہ مستحکم۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک جاپان نے کسی لڑائی میں پیٹھ نہیں دکھلائی۔

جاپان کا نیا مفتوح ملک کوریا بھی بہت دلچسپ اور پرانی سرزمین ہے۔ ناگاسکی NAGASKI سے جہاز میں بیٹھکر ہم بہ آسانی وہاں پہونچ سکتے ہیں اور اسکی خوشگوار بہار اور پرلطف خزاں کا مزہ اُٹھا سکتے ہیں۔ بندرگاہ چملپو CHIMULIO سے اسکے دارالخلافہ سیول SEUL تک ریل جاتی ہے جسکے چاروں طرف دیوار ہے جس میں آٹھ دروازے ہیں۔ کئی ایک خوشنما عمارتیں ہیں۔ سنگ مرمر کا ایک مندر ہے۔ معبد اور مقبرے بکثرت ہیں۔ سب سے زیادہ حسرتناک منظر شہزادی کا وسیع محل ہے۔ جو اب ویران پڑا ہے کیونکہ جنگ کے دوران میں شہزادی ماری گئی تھی۔ کوریا کے باشندے غریب اور بزدل ہیں اور بہت مدت تک اپنے طاقتور ہمسایوں کو خراج دیتے رہے ہیں تاکہ وہ انھیں تنگ

نہ کریں۔ کوریا میں زرخیز وادیاں ہیں اور ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا ہے۔ جنگلات بہت ہیں اور گمان غالب ہے کہ معدنیات کی بھی کمی نہیں۔ لیکن ملک کے ذرائع ترقی ابھی تک پستی کی حالت میں ہیں۔

جاپان والے اپنے ملک پر بجا طور پر نازاں ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے سمندر کے نظارے خوشنما جھیلیں۔ پاکیزہ اور سبز مرغزار۔ موسم بہار کے خنداں پھول۔ صحت بخش آب وہوا۔ غرض اس خوش قسمت جزیرہ کو صانع ازل نے بہت سی خوبیوں سے مالامال کر رکھا ہے۔ تعطیل کے دنوں میں تمام لوگ باغات میں چلے جاتے ہیں۔ اور آڑو۔ سیب۔ آلوچہ اور خوبانی کے روح پرور نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پھولوں کی اس ملک میں وہ کثرت ہے کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ جاپان کیا ہے۔ پرستان ہے۔ جسکی ادنیٰ سی جھلک ہمکو ان نازک چلمنوں کے دلآویز۔ ہلکی اور لطیف رنگ آمیزیوں میں نظر آتی ہے۔ جو جاپان سے تحفتہً ہمارے یہاں آتی ہیں۔ یا ان پنکھوں کی صناعی میں جو پیارے پیارے چھوٹے چھوٹے نازک جاپانی ہاتھوں نے حسینوں کے شغل کے واسطے تیار کئے ہیں۔ اور یہ صناعی۔ یہ دلفریبی۔ یہ جدّت آفرینی جاپانیوں کی انشا میں کیوں نہ ہو۔ جب وہ اپنے نقش و نگار اور بیل بوٹوں کو بناتے یا کاڑھتے وقت فطرت کی گلکاری پیش نظر رکھ کر اس سے براہِ راست سبق لیتے ہیں۔

ممکن ہے کہ جاپان جیسے خوبصورت پہاڑ۔ سُرپلی اور رقصاں آبشاریں۔ زرخیز وادیاں۔ انمیں چکر کاٹنے والے چمکتے ہوئے دریا۔ دامن کوہ کے دلفریب مناظر۔ ساحل رود بار کی پُرلطف کیفیتیں۔ کسی اور جگہ بھی مل سکیں۔ لیکن وہاں متبرک فیوجی یاما کی FUJI YAMA پُراسرار شان و شوکت نظر نہ آئے گی۔ یہ ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جسے جاپانی نہایت عزت و حرمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور جسے وہاں کے صناعوں کی نازک خیالی نے بارہا صفحہ کاغذ پر جلوہ گر کیا ہے۔ یہ پہاڑ داری سے ۳ میل اونچا ہے۔ اور نہایت شوکت و جلال سے اپنا پُرغرور سر بلند کئے ہوئے ہے۔ اسکا پیندا قریب ۱۰۰ میل کے ہے۔ یہ سمندر کے نزدیک اور دارالخلافہ سلطنت۔ ٹوکیو سے تھوڑے فاصلہ پر ہے۔ لوگ دور دراز سے اسکی زیارت

اسکی چوٹی خصوصاً جب وہ برف سے ڈھکی ہوتی ہے۔ جاپان کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ یہ چوٹی دشوار گذار ہے اوپر چڑھتے چڑھتے آدمی تھک جاتا ہے۔ لیکن چوٹی پر پہونچ کر راستے کی سب کلفت دور ہوجاتی ہے۔ کیونکہ جو نظارہ اوپر سے دکھائی دیتا ہے وہ مست کردینے والا ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں۔ شاداب وادیاں۔ اور نقرئی جھیلیں عجیب بہار دکھاتی ہیں۔ جوں جوں اوپر چڑھتے جاتے ہیں درختوں اور مرغزاروں کی حالت تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر یہ دونوں چیزیں مفقود ہیں۔ اس سے ذرا نیچے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں۔ اس سے نیچے طبقہ میں جنگل کے جنگل اپنے گھنے سایہ دار درختوں سے نظر کو لبھاتے ہیں اور دامن کوہسار کے قریب ہرے ہرے مخملی سبزے کے مرغزار اور لوبیا۔ مٹر۔ جو۔ چاول اور گندم کے کھیت اپنی اپنی بہاریں دکھاتے ہیں۔

فیوجی یاما کی چوٹی سے ہمکو دوسرے آتش فشاں پہاڑ آساما یاما ASAMA YAMA کی چوٹی نظر آتی ہے۔ اگرچہ جاپان کے بہت سے آتش فشاں پہاڑ اب سرد ہوچکے ہیں تاہم ان دونوں پہاڑوں کے آتشیں دہانے سے اب بھی بھاپ کی ایک تیز رو نکلتی رہتی ہے جو اکثر اوقات زلزلوں کی صورت میں رونما ہوتی ہے اور جس سے بعض دفعہ بہت نقصان ہوتا ہے۔

جاپان میں کئی بڑے بڑے شہر ہیں۔ ٹوکیو TOKYO دارالخلافہ سلطنت نپن یا ہونشیو NIPPON HONSHIO جزیرہ پر آباد ہے۔ اسمیں بیس لاکھ نفوس بستے ہیں شوگنوں کے محلات اس شہر میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ شاہی محلات بھی جنکو شیش محل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہیں واقع ہیں۔ یونیورسٹی میں ہزارہا لوگ گل داؤدی کی سالانہ نمائش کے موقع پر جمع ہوتے ہیں۔ یہ پھول بہ نسبت دیسی گل داؤدی کے بہت بڑے اور زیادہ خوشنما ہوتے ہیں۔ شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے رکشا کا زیادہ استعمال کیجاتا ہے۔ جسکو قلی نہایت پھرتی سے دوڑاتے پھرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی شملہ وغیرہ میں رکشا کی سواری ضعف نازک کی مرغوب خاطر ہے۔ ٹوکیو کا بندرگاہ یوکوہاما ہے۔ جہاں جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔ یہاں پہلے شوگن یوری ٹومو YORITOMO کا مقبرہ ہے

اور اس سے ذرا دور بودھ کا بت ہے جو پچاس فٹ اونچا ہے۔ اور جسکے اندر ایک نہایت خوبصورت اور مرصع مندر واقع ہے۔ جاپانی ضرب المثل ہے۔ "جسنے نکو NIKKO نہیں دیکھا وہ لفظ عظیم الشان کے معنی نہیں جانتا"۔ نکو نہایت ہی خوشنما شہر ہے۔ نغمۂ آبشار سورج کی شعاعوں کا رقص۔ تختہ ہائے سبزہ زار۔ اور پہاڑی مناظر کے علاوہ بدھ کے حیرت انگیز مندر اور شوگن کے مقابر اس شہر کے زیورات ہیں۔ جزیرہ کیوشیو KIOSHU میں مشہور بندرگاہ ناگاساکی واقع ہے جسے جاپان اور مغربی تہذیب کے توصل کی باہمی کڑی سمجھنا چاہئے۔ یہی وہ جزیرہ ہے جہاں پہلے پہل پرتگالی اترے تھے۔ جب سے غیر ممالک کے ساتھ تجارت شروع ہوئی ہے۔ کوب KOBE نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ پہلے یہ ماہی گیروں کے جھونپڑوں کا چھوٹا سا گانوں تھا۔ اب سارے ملک کی اندرونی تجارت کی منڈی ہے۔ جہاں بیرونی طاقتوں کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ اوساکا OSAKA بھی کوب کی طرح سمندر کے قریب واقع ہے۔ اور اسکے خوبصورت معبد اور بازار مشہور ہیں۔ اوساکا کے پاس سے ایک دریا گذرتا ہے جو جاپان کی سب سے بڑی جھیل بیوا BEWA میں جا گرتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں چاندنی رات کو لوگ دن بھر کے کاروبار سے فارغ ہوکر چھوٹے چھوٹے خوش شکل۔ عروس کی مانند آراستہ بجروں پر صاف سطح و شفاف آب پر لطف زندگی اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ یہ سماں بلا کا دلچسپ ہوتا ہے کشتیوں کی لالٹینوں کی رنگین شعاعیں دریا کے نقرئی پانی پر رقص کرتی ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ موسیقی کے دلآویز نغمے۔ سینان جاپان کے باریک۔ سریلے اور لطیف قہقہے۔ ایک ہندوستانی کے دلمیں کشمیر کی مشہور جھیل ڈل کی روح پرور یاد تازہ کرتے ہیں۔ اوساکا سے ٹرین کیوٹو جاتی ہے جو جاپان کا صدر مقام تھا۔ اور جہاں کی پرانی عمارات اور مکانوں کے وسیع محلات سیاح کی دلچسپی کو جذب کر لیتی ہیں۔

اگرچہ جاپان کی شہری آبادی روز افزوں ترقی پر ہے تاہم ہندوستان کی طرح زیادہ لوگ کاشتکار اور زراعت پیشہ ہیں۔ کئی ہزار سمندروں۔ جھیلوں اور دریاؤں کے کنارے ماہی گیری کرکے اپنی اوقات خوشحالی سے بسر کرتے ہیں۔ اگرچہ تہذیب جدید کے تحفے۔

مشینیں بکلیں۔ ملک میں عام ہوتی جاتی ہیں۔ تاہم جاپان کی حقیقی شہرت اور عظمت کا راز اُسکی دستکاریوں میں مضمر ہے جنھوں نے ممالک غیر کے لوگوں کو اپنا وارفتہ بنا لیا ہے ہر جاپانی مرد اور عورت مادرزاد آرٹسٹ ہے۔ چائے کی کاشت۔ اور ریشم سازی بھی مدت سے ملک میں رائج ہے چینی کے برتن۔ جو کیوں مٹی سے بنائے جاتے ہیں۔ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ قالین۔ ٹوکریاں۔ لکڑی کا جالی دار کام۔ خوشنما پنکھے۔ اور دلآویز فانوس، اور کھلونے اور ہزارہا قسم کی مفید اور نظر نواز اشیا جاپانی صناع دنیا بھر میں مقبول کرا چکے ہیں۔ افسوس ہے کہ جو اشیا یا مصنوعاتِ جاپان ہمارے ملک میں آکر بکتی ہیں وہ یا تو خود ہندوستان ہی میں سستے داموں نقلی طور پر بنائی جاتی ہیں۔ یا جاپان کی تجارت کے ذلیل کرشتے ہیں۔ وہاں کی قیمتی اور اصلی اشیا نہ صرف خوبصورتی بلکہ پائداری میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔

اگرچہ جاپانیوں کا لباس بڑی حد تک مغربی طرز کا ہو گیا ہے۔ اور دربار، محکمہ بحری۔ و فوج میں بالکل یورپی لباس مروج ہے تاہم ابھی تک ڈریسنگ گون کی شکل کا خوبصورت کمونو MIKANO ملکی لباس شمار کیا جاتا ہے۔ جو امرا کے لئے تو ساٹن یا زرد وزکپڑوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اور غربا کے لئے گاڑھے کرزی سے۔

جاپانی پاپوش دنیا سے نرالی ہے۔ ایک موٹی سفید جراب جوتے کے ساتھ پہنی جاتی ہے جوتہ مکان میں داخل ہوتے وقت اُتار لیا جاتا ہے تاکہ چٹائیوں کو (جو کرسیوں کا کام دیتی ہیں) میلا نہ کرے۔ عام مکانات کا فرنیچر بہت سادہ ہوتا ہے۔ یا بالکل نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات مکان کا زیادہ حصہ سخت کاغذ یا لکڑی کا بنا ہوتا ہے۔ بعض اوقات کاغذ کے چھاتے اور برساتی کوٹ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ جاپان میں چارپائی نہیں ہوتی۔ ایک موٹی توشک فرش پر بچھائی جاتی ہے جسپر لکڑی کے تکئے ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت یہ تہ کرکے علیحدہ رکھدی جاتی ہے۔ جاپانی ہر چیز کو نہایت مصفا طور پر سلیقے سے سجا کر رکھتے ہیں اور صفائی کے دلدادہ ہیں۔

جاپانی بچے غالباً تمام دنیا میں سب سے زیادہ خوش طبع ہوتے ہیں۔ اُنکے والدین انسے

بہت محبت کرتے ہیں۔ اور اوائل عمر سے اُنکو خوش اخلاقی۔ حب وطن اور حفظ نفس کی تعلیم دیجاتی ہے۔ کُند ذہن۔ کاہل الوجود۔ یا چڑچڑے بچے شاذ و نادر ہی جاپان میں آپ کو نظر آئیں گے۔ اُنکی پڑھائی اور کھیل کے اوقات مقرر ہیں۔ اُنکے کھلونے بالکل وہاں کے باشندوں کا نقشہ ہیں۔ لڑکیوں کے واسطے گڑیوں کے میلے رچائے جاتے ہیں۔ اور لڑکوں کے لئے خاص تیوہار منائے جاتے ہیں۔ آغاز بہار میں "یاد رفتگان" کی تقریب تمام ملک میں منائی جاتی ہے (جاپانی لوگ مُردوں کا خاص احترام کرتے ہیں) اس میلہ کا عجیب و غریب اختتام ناگاساگی پر ہوتا ہے جو خالی از دلچسپی نہیں۔ نصف شب کے بعد ہزارہا تنکوں کے جہاز جن میں بھل اور تقدی کے چڑھاوے ہوتے ہیں اور جن میں چھوٹے چھوٹے رنگین فانوس رکھے ہوتے ہیں۔ خلیج کی سطح پر چھوڑے جاتے ہیں۔ جب ہوا کے جھونکوں سے جہاز کو آگ لگتی ہے تو جاپانی عقیدہ کے مطابق روح انسانی پھر عدم آباد میں داخل ہو جاتی ہے۔

جاپانیوں کے معبد اور مندر بہت بارونق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دیوتاؤں کی پرستش کے اتنے شائق ہیں کہ زیارات کے لئے دور دراز سفر اختیار کرتے ہیں۔ فیوجی یاما کے متبرک پہاڑ کے یاتریوں کا امتیازی لباس سفید کمونو اور بڑے بیٹھے کی ٹوپی ہے۔

سیاحوں کی رائے ہے کہ جاپان دنیا پر فردوس کا نقشہ ہے۔ اس خوبصورت اور دلآویز ملک نے (جہاں سوائے شعریت۔ داستانہائے حسن و عشق کے اور کچھ نہونا چاہیئے) تھوڑے عرصہ میں وہ معاشرتی۔ تمدنی اور سیاسی ترقی کی ہے کہ ایک دنیا جاپان کا نام عزت سے لیتی ہے۔ اور جاپانی آج متمدن اقوام کی صف اولیں میں جگہ پاتے ہیں۔

نذیر احمد خاں

بی۔ اس۔ سی۔ ایل ایل بی۔

سلیمانی زبان

ترکی کردستان کا جنوبی حصہ سلیمانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں جو زبان بولی جاتی ہے وہ مختلف زبانوں خاصکر عربی۔ ترکستانی اور فارسی کے اختلاط باہمی سے پیدا ہوئی ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل کے ایک نامہ نگار مسٹر۔ ای۔ بی۔ سون ( ) اس سرزمین میں کئی ماہ تک رہ چکے ہیں اور زبان کو سیکھا ہے۔ اس مضمون میں جو کچھ لکھا جارہا ہے زیادہ تر انھیں کے فیض عام کا نتیجہ ہے۔

سلیمانی زبان اور اُسکے قواعد مکری زبان سے بہت کچھ مشابہ ہیں جو کردستان کے اور حصوں میں بولی جاتی ہے۔

شوان۔ قاراداغ۔ بانا۔ سردشت (جو سلیمانیہ کے سرحدی حصے ہیں) کے کردوں کی زبان اس زبان سے مختلف ہے۔

ترکی الفاظ کثرت سے اِس زبان میں ملینگے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ترکستان یہاں سے قریب ہے اور کچھ اسلئے کہ ایک زمانہ گذرا ترکوں کے ایک گروہ نے کرکوک اور آلتون کیوپرو کے اضلاع میں جو سلیمانیہ کے مغرب میں واقع ہیں بود و باش اختیار کرلی اور وہاں کے اصلی باشندوں سے مِل جُل گئے۔

سلیمانیہ ملک کا آخری جنوبی حصہ ہے جہاں خاص کُردی زبان بولی جاتی ہے۔ اس سے آگے جنوب یا مشرق کی طرف بڑھیے تو قدیم فارسی اور مائی اور گورانی وغیرہ سننے میں آئینگی۔ چونکہ دریائے سروان اور اورامانی وجوانرو کے پہاڑ درمیان میں حائل ہیں اسلئے قدرتی طور پر یہ زبانیں سلیمانی سے مخلوط نہ ہوسکیں۔

سلیمانیہ کو ۱۷۸۷ء میں سلیمان بابن نے آباد کیا تھا جو فرقہ بابن سے تعلق رکھتا تھا

بابنی اب بھی کُردستان کے بعض حصون مین خاصکر اربل کے قریب موجود ہین۔ اِنکا سلسلۂ نسب ہکاری قوم سے مِلا ہوا ہے جو کسی زمانے مین سب سے زبردست کُردی قوم تصور کی جاتی تھی۔

اِس طرح مُکری زبان جسکا ذکر اوپر آچکا ہے جنوب مین شہرزور تک پھیل گئی جہان پہلے کسانون کی بستی تھی۔ اور اورامانی بولی جاتی تھی۔

اب زیادہ وہ سُنّیون کا فرقہ ہے جسکی زبان خاص کُردی ہے۔ شیعون کی زبان کوُری سے ملتی جلتی ہے۔ مُکری سوج بلاق کے گِرد و نواح اور مشرق مین رائج ہے۔ جہان ترکون کی آبادی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سُلیمانیون کو بطلس۔ ارض روم اور بایزید کے رہنے والون سے گفتگو کرنے مین زیادہ دقت نہین مگر اورمانی اور گورانی سمجھنا اُنکے لئے بہت مشکل ہے۔ حالانکہ اُنکے جوار ہی مین بولی جاتی ہین۔

غیر صحیح تلفظ کے باعث جو سقم عموماً زبان مین پیدا ہوجاتا ہے وہ سلیمانی زبان مین بھی موجود ہے لیکن جیسا کہ یہان کے باشندے خود کہتے ہین اسکی وجہ وہ یہودی اور کلدانی ہین جنھون نے اسلام قبول کرکے کُردی زبان اختیار کرلی اور بے شمار عربی اور شامی الفاظ اس زبان مین شامل کرلئے۔

سلیمانی محاورات اور قواعد کی تعیین ایک حدتک شاعرون نے کردی ہے۔ نثر تو اس زبان مین بہت کم ہے نظمین البتہ کافی تعداد مین ہین۔

اس زبان کا تلفظ بہت مشکل ہے روزمرہ کی بول چال نے الفاظ کی ہیئت بھی بدل دی ہے۔ اکثر مقام پر حرف (د) گرگیا ہے۔ مثلاً

مایَن	دراصل	مادَین	بمعنے	گھوڑی
لےیا	〃	لیَدا	〃	〃 مارو
لیَام	〃	ایدام	〃	〃 مین دیتا ہون
کام	〃	کدام	〃	〃 کَون
جُو	〃	جُوُد	〃	〃 یہودی

حرف (د) کبھی کبھی لام سے بھی بدل جاتا ہے
مثلاً "کلی لکا" دراصل "کلید کا" تھا یعنے کنجی فارسی لفظ کلید سے نکلا ہے۔
حرف (ب) جیساکہ اور زبانون مین بھی قاعدہ ہے عموماً "و" سے بدل جاتی ہے۔
جیسے قرداق فی الحقیقت قرباق تھا یعنے مینڈک
عروا " عربا " " عرب
دووال " دُمبل " " پھوڑا
مگر "وفر" (یعنے برف) مین "ب" "و" سے نہین بدلی ہے بلکہ ژند کی فارسی قائم رکھی گئی ہے جو "وفرا" ہے۔
"ست" گاہے گاہے۔ مبدل بہ "ز" ہوجاتی ہے۔
مثلاً "دست" سے "دز" ہوگیا۔
"ہ" جو فارسی مین اکثر محذوف ہوگئی ہے اس زبان مین ابھی تک موجود ہے۔
مثلاً ہنجمن فارسی مین انجمن ہے ژند مین ہنجمن ہی تھا
ہنکوین " " انگبین ہوگیا ہے یعنے شہد
ہور " " ابر ہوگیا ہے " بادل
ہشتر " " اشتر " " اونٹ
یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلیمانی زبان مین "حائے حطّی" نہین ہے۔ جہان جہان اہل فارس نے "س" کو "ہ" سے بدل دیا ہے۔ اس زبان نے قائم رکھا ہے۔
مثلاً ماسی جو ژند مین مَسیا تھا اب فارسی مین ماہی ہوگیا
یا آسن فارسی مین آہن ہوگیا اور سنسکرت مین اَیاس ہے۔
فارسی یا عربی مین اکثر الفاظ جو "خ" سے شروع ہوتے ہین اس زبان نے کسیقدر اُنکی صورت مین تغیر پیدا کردیا ہے اور "خ" کی جگہ "ہ" یا "ک" ہوگیا ہے۔
مثلاً "کر" فارسی مین خر ہے یا "ہشک" فارسی مین "خشک" ہے۔
یا مثلاً "ہویر" عربی مین "خمیر" ہے۔

اب کچھ گرامر پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ پہلے یہ تبلا دینا اچھا ہوگا کہ اسم کے آخر میں "آن" زائد کر دینے سے جمع بنجاتی ہے۔ جیسے "پند" سے "پندان" معنے خیالات۔ مگر جس لفظ کے آخر میں "ا" "ی" یا "و" ہو تو اسمیں "اک" یا صرف "ک" بڑھا کر "آن" شامل کرتے ہیں تاکہ تلفظ صاف ہوسکے۔ مثلاً گورا سے گوراکان ہوگیا۔

"یائے وحدت" کے بجائے اس زبان میں "ک" ہوتا ہے اور حرف ماقبل کو کسرہ ہوتا ہے۔

فارسی میں بولتے ہیں "قاطرے خریدم" یعنی میں نے ایک خچر خریدا۔ سلیمانی زبان میں کہینگے۔ "استرِکم کرِی" "م" بمعنے "میں" یا مثلاً پیاوک ہات۔ بمعنے ایک آدمی آیا لیکن اگر کسی اسم کے آخر میں "کہ" ہو تو وہ اسم مخصوص ہوجاتا ہے۔ مثلاً پیاوکہ بمعنے وہ آدمی۔

علامت اضافت "ی" ہوتی ہے جو مضاف و مضاف الیہ کے درمیان آتی ہے مثلاً "منالی کچم" معنے میری لڑکی کا بچہ (منال = بچہ۔ "ی" علامت اضافت۔ کچ = لڑکی۔ م = میرا)

یا مثلاً "روجی ہوین" معنی گرمی کا دن (روج = دن۔ "ی" علامت اضافت ہوین = گرمی) یہ خیال رہے کہ مضاف ہمیشہ پہلے ہوتا ہے اور مضاف الیہ بعد کو جیسا کہ فارسی زبان کا بھی قاعدہ ہے۔

جار و مجرور کا قاعدہ اس زبان میں عجیب ہے۔ ہر مجرور کے آخر میں "دا" ضرور ہوتا مثلاً "ہاتم لدہ دا" بمعنے میں اس دہات سے آیا "ل" بفتحہ حرف جار ہے بمعنے سے یا تک۔

یا مثلاً "راکردوہ بوشاردا" = وہ شہر کو بھاگ گیا۔ "بو" حرف جار ہے = کو یا تک۔

اگر کسی اسم کے آخر میں لاحقہ "اولا" یا "ک" یا "کہ" ہو تو وہ علامت تصغیر جیسے میشولا = چھوٹی مکھی میش = مکھی۔

یا "میرولا = چھوٹی چیونٹی - میورا = چیونٹی -

اب اسکے بعد اسماء کی ایک فہرست دیجاتی ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کون لفظ دوسری زبان سے لیا گیا ہے اور کون لفظ خاص کُردی یا سلیمانی ہے -

سُلیمانی الفاظ	معنے	کیفیت
خوشک	بہن	فارسی مین خواہر ہے "ہر" "مش" سے بدل گیا "ک" علامتِ تصغیر ہے -
با	ہوا	فارسی لفظ باد ہے "د" محذوف ہوکر "با" ہوگیا -
مان گشو	شعاعِ مہتاب	یہ کُردی لفظ ہے -
باران	بارش	فارسی مین بھی بجنسہ یہی لفظ ہے -
تیر	اُولا	فارسی مین تگرگ ہے سلیمانی زبان "گ" بھی اکثر گر جاتا ہے -
آگر	آگ	سنسکرت مین اگنی ہے دیگر کُردی زبانون مین بھی آگر ہی مستعمل ہے -
آگردان	آتش دان	"دان" فارسی لاحقہ ہے -
پلیتہ	بتّی	فارسی مین فتیلہ ہے مگر قدیم فارسی پلیتہ ہی ہے - عربی مین فتیل ہے -
مِنال	بچّہ	کُردی لفظ ہے - دراصل مِندال تھا -
کچ	لڑکی	ترکی زبان مین "قِز" کہتے ہین -
ژن	عورت	فارسی مین زَن ہے -
مرد	مرد	فارسی لفظ بھی یہی ہے - مگری زبان مین اسکے معنے شوہر کے ہین -
ہتاؤ	سورج	فارسی مین آفتاب ہے -
دم	مُنھ	شمالی کُردستان مین "دف" کہتے ہین -
سردل	دل	سنسکرت مین "ہردَے" ہے -
دار	درخت	ژند مین "دارو" تھا -
کوچک	چمچہ	ترکی مین قاشق ہے -

ہوتا ہے کہ کبیر صاحب بچپن ہی سے رامانندجی کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے اصول کے اِتنے پکّے تھے کہ ماں باپ کو بھی اُن پر سخت حیرت ہوتی تھی۔ باپ اکثر اُن کو کپڑا بیچنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ کپڑے کا تھان فروخت کر رہے تھے کہ ایک سادھو نے آکر سوال کیا کہ بچے کپڑا دو۔ کبیر صاحب نے آدھا تھان دینا چاہا مگر اُس نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ یہ پورا ہوگا۔ آپ نے اُسے سارا تھان دیدیا۔ مگر دل میں ڈرے کہ باپ ناراض ہونگے اور اسی ڈر کے مارے کئی دن گھر سے نکلے رہے۔ آخر کار جب باپ کو پتہ چلا کہ کبیر اس خیال سے گھر نہیں آتا تو اُنکو ڈھونڈھکر گھر لائے اور اُنکے اس کام پر خوشی کا اظہار کیا۔ کبیر صاحب کی شاعری پر مفصل تبصرہ کی تو اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں مگر اتنا کہدینا ضروری ہے کہ کبیر صاحب کی نظمیں حُسن کی تلاش اور امن و راحت کے تجسّس کی تصویریں ہیں بعض سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِن کا مصنف روح القدس سے فیض پاتا ہے اور اسی سے ہمکلام ہے۔ بعض روحانی جوش اور وجد کا آئینہ ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے بھی ہیں جنسے حُسن کا جلال برس رہا ہے اور جن میں محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ کبیر صاحب کی اِنشا ایک ایسی روح کی درد بھری التجا ہے، جو خدا سے لَو لگائے بیٹھی ہو۔ اُن کی نظمیں روحانیت سے لبریز ہیں۔ اُنکے گیت حُسن اور زندگی کے برکات کی طرف دُنیا والوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ غرضکہ کبیر صاحب کی جذباتی شاعری اپنے حسن و شیرینی میں مختلف الانواع ہے۔ اُنکا جذبۂ عشق "جو نصف فرشتہ ہے اور نصف پرند" روحانیت کے شفاف آسمان پر اُڑتا ہے۔ اور زمین و آسمان۔ پیڑ اور خدا دنیا اور دنیا سے اس پار کا نظارہ حُسن دیکھتا ہے۔ اُنکی نظمیں کیا ہیں؟ نہایت سادہ انسانی جذبات معصومیت کے سے پاک خیالات سادہ ترین معاشرتی غم و مسرت اور خدا کی طرف روح کی خالص اور سادہ ترین آرزوئیں ہیں۔

کبیر صاحب کی موت کا افسانہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ مرے تو اُن کی لاش کے متعلق ہندو مسلمانوں میں جھگڑا پڑا۔ ہندو کہتے تھے کہ ہم انھیں جلائیں گے اور مسلمان کہتے تھے کہ ہم انھیں دفن کرینگے۔ آخر جب چادر اُٹھائی گئی لاش غائب تھی۔ صرف چند پھول پڑے ہوئے تھے جو فریقین نے آپس میں تقسیم کر لئے۔

ڈاکٹر سر رابندر ونا تھ ٹیگور نے اُن کی نظمون کا انگریزی مین ترجمہ کیا ہے۔ مین اُنھین اُردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کرکے ہدیۂ ناظرین کرتا ہون "گر قبول اُفتد زہے عز و شرف"

(۱)

مین اُسکی بانسری کے دلخوش کُن نغمے سُنتا ہون مگر برداشت نہین کرسکتا، پھول کھلتے ہین اگرچہ موسم بہار نہین، اور شہد کی مکھی کو بھی دعوت کا پیغام ملتا ہے، آسمان گونجتا ہے بجلی کوندتی ہے اور میرے دلمین لہرون کا تلاطم اُٹھتا ہے، مینھ برستا ہے اور میرا دل اپنے آقا کی یاد مین محو ہوجاتا ہے، جہان دنیا بڑھتی اور گھٹتی ہے، جہان چھپے ہوئے جھنڈے ہوا مین لہراتے ہین وہان میرا دل بھی پہونچ جاتا ہے۔ کبیر میرا دل مَر رہا ہے مگر اُسمین جان ہے،

(۲)

اے میرے دل! تونے دیارِ محبت کے رازون کو نہ پایا۔ تم جہالت مین آئے اور جہالت مین چلے گئے۔ اے میرے دوست! تمنے اس زندگی کے ساتھ کیا کیا، تمنے اپنے سر پر پتھرون کے بھاری بوجھ کو اُٹھا لیا ہے، مگر کیا تم جانتے ہو کہ کون اسے ہلکا کریگا۔

تمہارا دوست دریا کے دوسرے کنارے پر تمھارا منتظر ہے۔ مگر تم خیال نہین کرتے کہ اُس تک کس طرح پہونچ سکوگے۔ کشتی ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن پھر بھی تم کنارے پر بیٹھے ہوئے ہو، اور لہرین تمھین برباد کررہی ہین، تم اکیلے ہو، تمھارا کوئی مونس نہین، تمھین اپنے اعمال کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ کبیر صرف اُسکی مدد ڈھونڈھ جو تجھے ہمیشہ مدد دینے کے لئے تیار رہے۔

(۳)

جب مین اپنے محبوب سے جدا ہوتا ہون تو میرا دل غم سے بھرا ہوتا ہے۔
مجھے دن کو چین نہین آتا۔ مجھے رات کو نیند نہین آتی۔ آہ! مین اپنا غم کسکے سامنے بیان کرون
رات اندھیری ہے، اور وقت گذر رہا ہے۔ کیونکہ میرا آقا موجود نہین ہے۔
مین اُٹھ بیٹھتا ہون اور خوف سے کانپنے لگ جاتا ہون۔
اے میرے دوست سُن! یہان سوائے محبوب دلنواز کے اور کوئی چیز تسلی دینے والی نہین۔

افتخار الرسول بدر

یونان کا ایک گمنام حکیم

حکیم اکلیوبول، جزیرۂ اڈواس کے مشہور شہر لندہ مین پیدا ہوا، بچپن ہی سے طبیعت حکمت کی طرف مائل تھی، چنانچہ تھوڑی ہی سے عمر مین یونان کے بڑے بڑے حکمار مین اسکا شمار ہونے لگا، تعلیم فلسفہ کے لئے وہان کے عام قاعدے کے مطابق مصر چلا گیا، تعلیم سے فارغ ہوکر ایک مدّت کے بعد پھر اپنے وطن واپس آیا، اور ایک متمول خاندان کی نہایت مشہور عورت سے شادی کرلی، اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جسکا نام اقلوبین تھا۔ حکیم اکلیوبول نے خود نہایت محنت ومستعدی کے ساتھ اُسکو تعلیم دی وہ جوان ہوکر اپنے ہمعصر حکمار سے سبقت لے گئی۔ اور اُس زمانے کے بڑے بڑے جادو نگار النشا پردازون اور نکتہ رس لوگون مین اسکا شمار ہونے لگا، اسمین ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرح اہم سے اہم مسائل فلسفہ کو نہایت آسان وسادہ الفاظ مین (کبھی ضرب المثل اور کبھی چیستان کی شکل مین) حل کردیا کرتی تھی، باوجود ان کمالات کے انکسار وعجز اتنا تھا کہ جو شخص اسکے باپ سے ملنے آتا، رسم کے مطابق[1] اسکے پاؤن دھویا کرتی۔

یہ حکیم خاندان لہرقول سے منسوب تھا، اسکے باپ کا نام اوجراس ہے، اسکی پیدائش کے وقت اکرسیوس شہر لاپا پر حکمران تھا، جوان ہوکر یہ خود ایک چھوٹی سی ریاست کا حکمران ہوگیا۔ اور اپنے اس فرض کو اس عمدگی اور دیانت داری سے انجام دیا کہ تمام رعایا کے دل اسکے گرویدہ ہوگئے، اس نے اپنی اس چھوٹی سی سلطنت مین اتحاد واُخوّت کا وہ سامعہ نواز صور پھونکا کہ سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہوگئے، اور یہ چھوٹی سی ریاست گویا ایک خاندان بن گئی۔

---

[1] یونان کی یہ ایک قدیم رسم تھی جسے اہل یونان انتہائی ادب سمجھتے تھے۔

یہ حکیم پستہ قد، قوی الجثہ اور بارعب تھا، شجاعت وبہادری کے ساتھ ساتھ نیک دل، بادضع، راست باز، متین وخاموش تھا، امن پسندی اور صلح جوئی اسکا خاص جوہر تھا۔ وہ دوسرے بوالہوس بادشاہوں کی طرح اپنی عزیز رعایا کا خون ہلاکت کی دلدی پر چڑھتے ہوئے نہین دیکھ سکتا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اُس سے تمام ریاستون سے اتحاد تھا۔ شہر مین مسافرون اور سیاحون کے لئے بہت سے مسافر خانے تھے، جنھین آرام پہونچانا وہ اپنا سب سے پہلا فرض خیال کرتا تھا، یتیم بچون اور بیکس بیواؤن، ناچار ومصیبت زدہ لوگون کی اعانت ودست گیری اُسکا نصب العین تھا، وہ خود بھی دنیا وغم دنیا سے آزاد رہکر ایک معمولی آدمی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا وہ جس طرح اپنی بیوی سے محبت اور بچون پر شفقت کرتا، اُسی طرح اہل وطن پر بھی جان دیتا تھا۔

حکیم سولون جو اپنے زمانے کا ایک مشہور ومعروف حکیم گذرا ہے۔ حکیم اکلیبول کا ہم مرتبہ وہمعصر تھا۔ اسکے ہزارون شاگرد معتقد تھے، جب حکیم اکلیبول نے سُنا کہ اسنے وطن ترک کردیا ہے تو اسکے آیندہ مصائب وتکالیف کے خیال سے بہت متاثر ہوا اور اُسے اپنی ریاست مین بُلانے کے لئے اس مضمون کا ایک محبت بھرا خط لکھا جس سے اُسکی شرافت ونیکدلی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

محترم دوست! مین جانتا ہون کہ تمھین ترک وطن کے بعد اپنے شہر سے زیادہ آرام ملیگا اور تمھارے لاکھون شاگرد، معتقد اور دوست اپنے گھرون کو تمھارا گھر سمجھین گے، لیکن مین نہایت محبت وخلوص کے ساتھ یہ اپیل کرتا ہون کہ تم میری ریاست شہر لندہ مین چلے آؤ، جسکی آغوش محبت تمھین قبول کرنیکے لئے ہر وقت تیار ہے، جہان آنے کے بعد تمھین دوسری ریاستون سے کسی قسم کا خوف نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ خود بھی ایک آزاد وخود مختار ریاست ہے، اگر خدانخواستہ کسی قسم کی مخالفت ہوئی بھی تو باور کرو کہ تمھاری عزیز زندگی کو مین اپنی زندگی سمجھون گا۔

شہرت کا سبب اسکی شہرت کا خاص سبب یہ تھا کہ اسنے حکمائے مصر کے اقوال، طریقہ تعلیم اور فلسفیانہ انداز بیان کا نہایت غور سے مطالعہ کیا تھا، حکمائے مصر عموماً نصیحتون کو چیستان کی شکل مین پیش کرتے تھے جو مؤثر ہونے کے علاوہ بہت جلد زبان زد خاص وعام ہوکر خیر فانی ہوجاتی تھین، اسنے بھی مصر سے یونان واپس آکر اسی طریقہ بیان کو اختیار کیا جو وہان کے لوگون مین بہت مقبول ہوا اور اسکی شہرت مین چار چاند لگ گئے، یونانی حکمار مین یہ سب سے پہلا

شخص ہے جس نے یونان مین چیستان گوئی کو رائج کیا، یہان تک کہ وہ اپنے تمام خطوط مین بھی وہ اپنے عزیزون یا دوستون کو لکھتا، اسی طرز بیان سے کام لیتا تھا۔ مثال کی طور پر اسکی ایک "چیستان" ذیل مین درج کیجاتی ہے، وہ کہتا ہے

"مین بارہ بیٹون کا باپ ہون، اِنمین سے ہر ایک لڑکے کے تیس تیس لڑکیان ہین، ان لڑکیون مین بعض تو نہایت حسین وجمیل ہین، اور بعض نہایت ہی مکروہ، و بدنما، یہ سب کی سب غیر فانی ہین ... مگر پھر بھی ہر ایک کی عمر ایک دن سے زیادہ نہین ہوتی"

اسکا حل۔ "سال، مہینے، اور دن" ہے۔

شاہ مبداس کی تعریف مین جو کتبے اُسکی قبر پر لکھے ہوئے ہین وہ اسی نکتہ رس حکیم اور سحر طراز ادیب کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہین،

آخر کار قدرت کے غیر اختیاری قانون "موت" نے ستر برس کی عمر کے بعد اسکے لبون پر بھی ہمیشہ کے لئے مُہر سکوت لگادی، جس سے عرصہ تک شہر لندہ ماتم کدہ بنا رہا۔ اگرچہ اس حکیم کو مرے ہوئے ایک مدّت ہوچکی ہے، لیکن اُسکے وہ زرّین مقالات ابتک زندہ ہین جو اُسنے وقتاً فوقتاً اہل وطن کے لئے لکھے تھے، اُن مین سے بعض ذیل مین نقل کئے جاتے ہین۔

دنیا مین احمقون کی تعداد ہر چیز سے زیادہ ہے، حقیقی بزرگی یہ ہے کہ انسان ظلم و تعدی سے دور رہے، ہر شخص کو اپنی حیثیت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیے، دوست اور دشمن دونون کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ، جو ارادہ کرو اُسپر گھر ہی مین کافی غور کرلو، کسی سے بے ادبی اور گستاخی سے پیش نہ آؤ، کم بولو اور زیادہ سوچو، اپنے کامون مین پہلے اُن لوگون سے مشورہ کرو جنھین تم اپنے سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہو، دشمن سے حتی الامکان صلح کرلو، جبر و تشدد سے کسیکی کوئی چیز نہ چھینو، دنیا مین سب سے زیادہ ذلیل اور احمق وہ ہے جو دوسرے کی محبوب چیز خود مانگے، ایسے بے شرم و نادان شخص کو دنیا حقارت سے دیکھتی ہے، اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت مین کوشش کرو، غریبون پر ہنستے وقت اپنے مستقبل کو یاد رکھو، اگر زمانے کی ہوا تمھارے موافق بھی ہو تو کاہل و سست نہ بنجاؤ۔ اور اگر خلاف ہو تو بیقرار نہو، ہمیشہ اپنے ہی خاندان مین شادی کرو، باپ کو چاہیے کہ ایک خاص حد تک اپنے بیٹون کی عزت کرے، اپنی بیوی کی تعریف یا اسکی باتون کو غیر محرم سے بیان کرنیوالا اُس شخص سے بھی زیادہ ذلیل ہے جو اپنی عورتون سے حجاب مفقت کرتا ہے۔

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

لاگ کی آگ

(۱)

چتوڑ کی دھاک تمام راجپوتانہ میں بندھی تھی اور مسلمان فرمانروا ہمیشہ اسکے فتح کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ غیاث الدین تغلق بادشاہ کے عہد حکومت میں پے در پے حملے ہوئے مگر جیسی کامیابی چاہیے نصیب نہوئی۔ ۱۳۲۳ء کے قریب کے حملے بڑے معرکے کے حملے تھے انھیں میں سے کسی ایک حملے میں بُوندی کے نارائن داس بھی مدد کے لئے آئے تھے۔ رانا رائے مل والی چتوڑ اور نارائن داس والی بوندی کے دلیر سپاہیوں نے شاہی فوج کو پسپا کر دیا اور یہ بلا کچھ دنوں کے لئے ٹل گئی۔

رانا رائے مل نے واپسی پر دعوت مدارات اور طرح طرح کی شکرگذاری کے علاوہ آپس کے تعلقات قائم رکھنے کے لئے اپنی لڑکی کی شادی نارائن داس سے کر دی۔ اس گہرے تعلقات میں بہت سے راز مضمر تھے۔ اِس لڑکی کے بطن سے ایک لڑکا شجاع اور ایک لڑکی شجاع بائی پیدا ہوئی۔ رائے مل والی چتوڑ کے بھی ایک لڑکا رانا رتن سنگھ تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد تاج و تخت کا یہی مالک ہوا۔ اور ۱۳۳۳ء میں رائے مل کے مرجانے کے بعد شجاع بھی باپ کی گدی پر بیٹھا۔ شجاع اور شجاع بائی میں غیر معمولی اُنسیت تھی۔ شجاع نیک اور بہادر تھا۔ دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ عزیز اگر کوئی چیز تھی تو وہ شجاع بائی تھی۔ ایک مرتبہ وہ چتوڑ گیا۔ وہاں اسکی خاطر مدارات میں غیر معمولی خلوص سے کام لیا گیا۔ آپس کے تعلقات قائم رکھنے اور رشتۂ محبت مضبوط کرنے کے خیال سے اُسنے شجاع بائی کی شادی رانا رتن سنگھ سے کر دی۔ اور رانا رتن سنگھ نے بھی اپنے خاندان میں شجاع کی شادی کر کے اس تعلقات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔

بہن کی محبت شجاع کو بے چین کئے رہتی تھی اور وہ اکثر اُسکے دیکھنے کے لئے چتوڑ جایا کرتا تھا۔ شجاع بائی بھی ہمیشہ اُسکے دیدار کی طالب رہا کرتی تھی۔ جہاں زیادہ دن گذرے آدمی پر آدمی آنے شروع ہوئے اور شجاع کو تمام کام بند کر کے جانا پڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان محبت کے ہاتھوں کچھ ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسکو سوائے اُس دُھن کے اور سب کچھ ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ شجاع نے بارہا اپنی بہن کو بُوندی بُلانے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہا۔

اُس زمانہ میں آپس کے خوشگوار تعلقات کی وجہ سے مسلمانوں کے حملے زیادہ خطرناک ثابت نہیں ہوتے تھے۔ بات یہ تھی کہ ایک دوسرے پر ہمیشہ جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا تھا اور سب مِل کے اسلامی فوج کا مقابلہ کرتے تھے۔ رانا رتن سنگھ کی تمام باتیں شجاع کو پسند تھیں مگر جب وہ خصتی کے بارے میں تذکرہ کرتا اور سوکھا جواب پاتا تو اُسکو سخت تکلیف محسوس ہوتی مگر لیا کرتا مجبور تھا۔ وہ خود جاکر بہن سے مِل لینا ہی مناسب سمجھتا تھا۔

(۲)

رانا رتن سنگھ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا چڑچڑا۔ کینہ پرور اور ضدی واقع ہوا تھا اُسکو اپنی توہین اشارتاً کنایتاً بھی گوارا نہ تھی۔ جان دینا اسکے لئے آسان تھا مگر انتقام نہ لینا دشوار تھا۔ ایکمرتبہ جبکہ شجاع چتور میں موجود تھا شجاع بائی نے اپنی طرف سے دعوت کی۔ رانا رتن سنگھ اور شجاع دونوں کھانا کھا رہے تھے اور شجاع بائی دونوں کے آگے ضرورت کی تمام چیزیں رکھ رہی تھی شجاع نے بے تکلف اپنے آگے کی تمام چیزیں کھالیں مگر رانا رتن سنگھ معمولی طور پر ساتھ دیکر رہگیا۔ جب پان کھانے کے لئے دونوں شجاع بائی کے کمرے میں آئے تو شجاع بائی نے اپنے شوہر کو مخاطب کرکے کہا کہ "دیکھا میرے بھائی نے کھانے کی تمام چیزوں شیروں کی طرح کھالیں اور آپ لڑکوں کی طرح اُنسے کھیلتے ہی رہ گئے"۔

بات تو تھی معمولی مگر رانا رتن سنگھ کے تیور بدل گئے۔ ابرو پر بَل آگیا۔ آنکھیں غصہ سے لال لال ہوگئیں۔ غصہ کو ضبط کرکے صرف اسقدر کہا کہ "دیکھوں گا تمھارے شیر کو"۔ شجاع بائی کے لبوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ فوراً کافور ہوگئی اور چہرہ پیلا پڑگیا۔ شجاع رانا کے رنگ روپ کو دیکھکر بھانپ گیا کہ بات بیموقع ہوئی۔ رانا کے دل سے یہ ملال نکالنے کے لئے مسکرا کر کہنے لگا۔

شجاع۔ کیا آپ کو اس مذاق سے کچھ رنج پہونچ گیا؟ ایسی مذاق کی باتوں کا خیال نہیں کیا جاتا۔

رانا۔ (چہرے کی حالت درست کرتے ہوئے) نہیں نہیں مجھے ہرگز رنج نہیں پہنچا واقعی

آپ شیر ہیں۔

شجاع۔ کیا کھانے پینے ہی پر بہادری کا خاتمہ ہے۔ زیادہ کھانا تو درحقیقت عیب میں داخل ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں اگر شجاع بائی کے مذاق سے آپ کو رنج ہو پہنچا ہو تعجب ہے کہ اُسنے اتنے دنوں میں بھی آپ کا مزاج نہیں پہچانا۔

رانا۔ مزاج پہچاننے کی آپس کوئی بات نہیں۔ مجھے ایسے مذاق کی پروا نہیں۔ آپ فضول بدگمان ہو رہے ہیں۔

اُسوقت تو یہ معاملہ رفت گذشت ہوگیا مگر رانا کے دل میں یہ بات ہمیشہ نوک نشتر بنکر کھٹکا کرتی تھی۔ ہنسی دل لگی یا مذاق سے تفریح روح تو ضرور ہوتی ہے مگر ایسے لوگ جو قدرتاً چڑچڑے۔ ضدی۔ مردہ طبیعت واقع ہوتے ہین وہ اپنے لئے تیر و تفنگ سے بڑھکر سمجھتے ہیں اور ایسے ایسے ناخوشگوار واقعات ظہور میں آجاتے ہیں کہ جنکا گمان بھی نہیں ہوتا۔

شجاع کی موجودگی میں رانا رتن سنگھ بمشکل اپنے جوش کو دبائے رہا اور کوشش کرتا رہا کہ دلی ملال کا اظہار کسی طرح نہونے پائے لیکن شجاع کے چتوڑ سے چلے جانے کے بعد آمد و رفت خط و کتابت سب بند ہوگئی۔ شجاع کے آدمی آئے بہن کے خط گئے مگر رانا نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ہاں زیادہ تر اُسکا وقت فوج کی ترتیب میں صرف ہونے لگا۔ اور یہی مشغلہ اُسکے لئے دلچسپ ہوگیا۔

(۳)

شجاع بائی کہنے کو تو کہہ گئی مگر شوہر کی بے رخی اور اُسکے خطرناک انجام سے ہمیشہ کانپتی رہی۔ رتن سنگھ نے محل میں بھی آنا جانا بند کردیا۔ شجاع بائی کو موقع نہیں ملتا تھا کہ اُس سے تنہائی میں ملکر اپنے قصور کی معافی چاہے۔ فوج کی تیاری کا حال سُن سُن کر اُسکا خون خشک ہوا جاتا تھا لیکن اُسکو یہ علم نہ تھا کہ فوج کی ترتیب کیوں اور کس لئے دیجاتی ہے۔ اُسنے اپنے بھائی کو اس امر کی اطلاع دی کہ "رانا اسوقت فوج کی تیاری میں مصروف ہیں۔ محل میں آمد و رفت قطعی نہیں ہے۔ میرا دل گھبرایا کرتا ہے۔ آگ لگے اُس تمسخر کو جبکہ میرے منھ سے ایک مذاق کا جملہ نکل گیا۔ میں نے ہرچند کوشش کی مگر یہ نہ معلوم ہوسکا کہ فوج کی تیاری کیوں ہوتی ہے۔"

شجاع کو خط ملا بہن کی اس پریشانی سے اُسکا دل بھر آیا مگر کیا کرتا رانا کے دل پر کیا اختیار تھا

اُسنے رانا کو خط لکھا کہ "عرصہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا جس سے تردد ہے۔ سنا ہے کہ آپ اس وقت فوج کی تیاری میں مصروف رہا کرتے ہیں اور شاید اسی وجہ سے مجھے بھول گئے ہیں۔ فوج میں غیر معمولی اضافہ سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو آپ خود کہیں حملہ کرنے والے ہیں یا کسی کے حملہ کرنے کی خبر معلوم ہوئی ہے۔ آپ صاف صاف لکھئے تاکہ میں بھی آپکے اوپر جان نثار کرنے کے لئے تیار رہوں۔"

رانا کو یہ خط ملا پڑھکر خاموش ہو رہا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خیال ہوا کہ ہو نہ شجاع بائی نے اسکو اطلاع دی ہے۔ اِسنے اب یہ انتظام کر دیا کہ کوئی شخص بوندی نہ جانے پاوے راستہ میں پہرہ دار مقرر ہو گئے۔ اس طرح سے آمد و رفت مسدود ہو گئی۔

رانا ایک دن محل میں آیا۔ شجاع بائی کو اس سے بہتر موقع اور کیا تھا وہ پاس گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"پران ناتھ اس ابلا کی چوک کو بھول جائے۔ میں نے بڑا دوش کیا۔"

رانا۔ دوش کیا اور اسکی چھما کیسی۔ ہنسی دلگی کے رشتے ناتے میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔

شجاع بائی۔ جیون آدھار! اگر دوش اور اپرادھ نہیں تو آج اتنے دن کے بعد کیوں درشن دیئے ہیں

رانا۔ مسلمانوں کے حملے کی خبر پے در پے آئی اسلئے فوج کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

شجاع بائی۔ ایشور آپ کی سہایتا کریں۔ بھائی جی کو اسکی خبر بھیجی گئی ہے یا نہیں۔

رانا۔ جب تک میں اُنکو آدمی سمجھتا تھا تب تک ہر کام میں صلاح لیا کرتا تھا مگر جب سے تم نے "غیر" بنایا ہے تب سے مجھے اُنسے ڈر لگتا ہے۔"

شجاع بائی روتی ہوئی پیروں پر گر پڑی اور جو لفظ ٹوٹی پھوٹی آوازوں سے بنے اُنکا مطلب یہی تھا کہ "پران ناتھ چھما کیجئے۔"

رانا بجائے اسکے کہ اسکو معافی بخشتا اور اُٹھا کر پاس بٹھا لیتا سخت ترشروئی سے "مکاری سخت مکاری" "تریا چرتر زبردست تریا چرتر" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔

(۴)

پھاگن کا مہینہ ہندوؤں کے لئے نہایت خوشی کا مہینہ ہے حقیقت یہ ہے کہ اس مہینہ میں خون کی روانی میں نئی لہر پیدا ہو جاتی ہے سردی سے تنگ آئے ہوئے غربا بھی اس موسم میں ننگوئی میں پھاگ کھیلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

گھر گھر خوشیاں منائی جاتی ہیں رنگ اُڑتے ہیں مگر بہت سی حسرت نصیب ہستیاں ایسی بھی ہیں جنکو اس موسم میں بھی خون کے آنسو بہانے پڑتے ہیں۔

رانا رتن سنگھ نے مدتوں کے بعد شجاع کو بلایا کیا اور اس مضمون کا خط لکھا کہ میں پھاگن کے مہینہ میں شیر کا شکار کھیلنے آؤنگا آپ تیار رہیئے گا۔ شجاع نے بھی بغیر کسی پس وپیش کے سادے لفظوں میں یہ جواب دیا کہ آپ خوشی سے تشریف لائیے میں جملہ انتظام کئے رہونگا۔

پھاگن کے آخری مہینہ میں معہ ترتیب یافتہ فوج کے رانا رتن سنگھ نے دریائے چمبل کے کنارے جہاں سے جنگل قریب تھا ڈیرا جمایا۔ کل انتظام پہلے ہی سے شجاع نے درست کر رکھے تھے جانے کے دوسرے دن شکار کی ٹھہری۔ رانا رتن سنگھ ایک طرف اور دوسری طرف شجاع چل نکلا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جبکہ دونوں میں ایک فرلانگ کا فاصلہ رہگیا۔ رانا رتن سنگھ نے شجاع پر تیر چلانے شروع کئے۔ پہلے شجاع کی سمجھ میں یہ معمہ نہ آیا مگر متواتر تیر کے آنے سے سمجھ گیا کہ یہ تیر قضا ہیں اور میرا ہی شکار کھیلنے رانا آیا ہے۔ اِن سے بچنے کی فکر لازم ہے چنانچہ اُسنے تیروں سے حفاظت شروع کی اور تقریباً کل تیر بیکار کر دیئے۔ جب رانا رتن سنگھ نے یہ دیکھا تو جھپٹ کر تلوار کا ہاتھ مارا جس سے شجاع زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا۔ خون کی روانی سے طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بیہوش ہو گیا۔ اور رتن سنگھ اُسکو مُردہ سمجھکر اپنے خیمے کی طرف چلدیا۔

تھوڑی دیر بعد شجاع کو ہوش آیا اور دوشالے سے زخم باندھ کر اُٹھ کھڑا ہوا بہت مردانہ ابتک اُسی شان سے رگوں میں دوڑ رہی تھی تلوار کھینچکر رانا رتن سنگھ کو للکارا۔ وہ بھی تعجب کے ساتھ اُسکو دیکھ کر بکتر ذالتہ موت چکھانے کے لئے بھڑا اور پوری طاقت سے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ مگر اس مرتبہ شجاع نے اُسکا وار خالی دیکر اُسکو گھوڑے سے نیچے کھینچ لیا اور چھاتی پر چڑھ کر رانا کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لیکن زخم کی تکلیف سے تڑپ تڑپ کر خود بھی

آغوش اجل میں سو رہا۔

یہ افسوس ناک خبر برقی لہر کی طرح بوندی اور حیرت پھیل گئی۔ شجاع بائی بیچارے بھائی اور شوہر کی حالت سنتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑی۔ جب ہوش آیا تو فوراً اُس جنگل میں پہونچی جہاں ارمان و محبت کے دو پتلے خون کی ہوئی کھیل کر ہمیشہ کے لئے سو رہے تھے۔ اور شوہر کی لاش پر گر کر بیہوش ہو گئی۔

ایک طرف شجاع کی بیوی بھی اپنے شوہر کی لاش پر بیہوش پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چتا کا سامان تیار ہوا اور دونوں دیویاں اپنے اپنے پران پتی کے لاشے کو زانو پر لیکر آگ کے دشمن شعلوں میں یہاں سو گئیں

دیکھتے ہی دیکھتے آگ بجھ گئی اور ایک تودہ خاکستر تھا اور بس۔

ع لاگ کی آگ بُری ہوتی ہے جلنے کے لئے۔

منظور الحق کلیم اعظمگڈھی

جذبات ناشاد و

آہ! اے میرے دل، مجھے اُن خواب ہائے گذشتہ کو بھول جانے دے جو کہ پریشان ہو چکے ہیں۔

ہاں مجھے اس جنگل میں گری ہوئی سرخ و سفید پتیوں اور کلیوں کا ایک چتا بنا دے تاکہ میں اُن منتشر خوابوں کو آگ کی شعلہ افروز شعلوں سے جلا دوں۔

میں تھک گئی ہوں آہ! اے میرے دل، میں عرصہ تک خواب محبت کے گراں بوجھ برداشت کرنے سے تھک گئی اب مجھے آرام کرنے دے۔

ہاں مجھے اُسکی خاک کو منتشر کرنے دے تاکہ میں کچھ لمحوں تک اُسکا ماتم کر سکوں۔

لیکن ہاں اے میرے دل مجھے فوراً اُٹھکر ایک مرتبہ پھر دنیاوی جھگڑوں کے مجمع میں دیوانہ وار پھرنا چاہیے۔

اے میرے دل مجھکو اُٹھنے دے تاکہ میں اُن خوابوں کو جمع کروں، جو کہ باقی رہ گئے ہیں۔

سنو! کہ میں زندگی کے مصائب و آلام کو اپنے غم انگیز نغمے سے فتح کر لوں گی۔

ناقب کانپوری

ترقیوں کی حیرت انگیز رفتار

(از ڈاکٹر حکیم سید علی کوثر چاندپوری)

انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ اپنے ہر آئندہ وقت کو گذشتہ سے زیادہ شاندار اور روشن دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کی تمام حساس قومیں اس زرین اصول کو اپنے بہترین اور قابل رشک قوائے عمل سے آئے دن استوار کرتی رہتی ہیں۔ انکا دور ماضی اگر آغاز مستقبل کے وقت دیکھا جاتا ہے تو ان دونوں زمانوں کی وجہ اتصال نہایت دلآویز نظر آتی ہے ہم دیکھتے ہیں ماضی جن جذبات ترقی کو لیکر آیا تھا وہ ان اسباب عروج کے مقابل بہت ہی پست اور مبتذل تھے جو اب موجودہ زمانہ کے بحر العقول وسائل و ذرائع کے ساتھ پیش ہو رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے ایک بیدار قوم کے بہت جلد بام ارتقا پر پہونچ جانے کی۔ یہی اور صرف یہی سبب ہے دلدادگان ترقی کو ایسے مقام اعلیٰ پر فائز کر دینے کا جو بہت بلند ہوتا ہے عوام کے نقطۂ نظر سے۔

اقوام یورپ کے ابتدائی حالات تاریخ پر نظر ڈالنے سے ڈارون کی تحقیق کے صحیح مان لینے میں کوئی معقول عذر باقی نہیں رہ جاتا۔ خصوصاً اسوقت جبکہ ہم ان کے موجودہ طرز معاشرت تمدن اور دیگر اجزار زندگی وغیرہ پر منصفانہ خیال آرائی کرتے ہیں تو یہ باور نہ کرنے کی کوئی خاص نفی ہمارے پاس نہیں رہ جاتی کہ اک . . . . . تکمیل انسانیت کے انتہائی مدارج پر پہونچکر اپنے قابل تقلید حسیات سے دنیا کو محو حیرت نہیں بنا سکتا۔

اپنے اسلاف اور ان کے نہایت قیمتی بکار آمد کارناموں کو ہم اپنے واقعات زندگی اور سوانح حیات پر منطبق کرنے کے بعد آسانی اور افسوس سے کہہ سکتے ہیں۔

کوئی تعجب خیز امر نہوگا۔ اگر کچھ دور آگے چلنے پر ڈارون کی مضحکہ انگیز تحقیق کا صحیح عکس ہمارے

افراد قوم پر بسہولت منعکس ہوجائے"

بلکہ میرے نزدیک تو یہ کہدینا بھی زیادہ دشوار نہین کہ ہم اب بھی ان بیمانہ اوصاف کے سچے آئینہ دار ہیں جو ایک قوم اور زندہ قوم کے لئے سب سے زیادہ باعث ننگ کہے جاسکتے ہین - وہ وقت ہمین یاد ہے جبکہ اصحاب ذوق اکتساب معلومات کی غرض سے مضطربانہ ہمارے دروازون پر دستک دیا کرتے تھے - اور انکی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ملجا ہمارے خزانہ علم کے سوا دنیا کی بسیط فضا مین کوئی دوسرا مقام نہوتا تھا - اور آج یہ حسرتناک سین بھی ہمارے سامنے ہے کہ زمانے کے روشن دماغ حضرات اپنی بصیرت افزا اختراعات دکھاکر ہمین دعوت عمل دینا چاہتے ہین - مگر ہم ہیں کہ جمود غفلت آرا اور برودت کرب انگیز کی زبردست چٹانون مین اس بری طرح دبے ہوئے ہین کہ سر اٹھانا تو کجا جنبش لب بھی دشوار ہے، اگر کسی طرف سے کوئی خفیف سی آواز حمیت کانون مین پہونچتی بھی ہے تو ہماری وہ قوت سماعت جسپر خود جمود و غفلت کی تاریکیان مستولی ہین اسقدر جلد اسکو اپنی جامد کیفیات مین تبدیل کرلیتی ہے کہ ہجوم تاثرات کی معمولی سے معمولی ضرب بھی قلب تک نہین پہونچتی -

قاعدہ ہے کہ جب کسی ذی روح جسم کی وہ خوبصورت وجہ امتیاز جسے قوت حس کہتے ہین زائل ہوجاتی ہے اور اسکے خیالات پر پستی و تنزل کا ادبار مسلط ہوجاتا ہے تو صاحبان مغز کی بیدار مغزیان دکھاکر اسکو گرم کیا جاتا ہے اور سینہ مین ان تمام آثار حیات کے لبریز کرنے کی سعی کی جاتی ہے جو بقائے زیست کے لئے ازبس ضروری ہین، کیونکہ یہی ایک ایسا طریق علاج ہے جسکو ان موقعون پر آخری چارہ کار کہا جاسکتا ہے - اور جس سے مردہ، ناکام حیات دلون مین گرمئ حمیت پیدا ہوجانے کی کافی امید کیجاسکتی ہے -

اس پسندیدہ اصول کار کے بعض شیرین ثمرات، دلربا نتائج کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم بھی چاہتے ہین کہ آج کی صحبت مین ناظرین کے دماغی قوی کو دیگر افراد ملک کی داستان بلند پروازی سناکر وقف حیرت و استعجاب بنادین - دو بندن کے مختلف مدارج پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انسان کو کسقدر وسیع اختیارات مرحمت فرمائے ہین - انسان اور وہ انسان جو محض پتون مین چھپا رہنا ستر پوشی کا بہترین ذریعہ خیال کرتا تھا

آج ہزارون متنوع الالوان کپڑے بھی اسکے ترقی یافتہ تمدن کے مقابل ناکافی نظر آتے ہین۔ اور وہ انسان جو کسی وقت اس قسم کی ترقیان، قلب ماہیت سے زیادہ اہم جانتا تھا۔ اسوقت سقف آسمان کے نیچے کوئی چیز ایسی موجود نہین جو اسکے کرشمہ ہائے دماغ کی شرمندۂ احسان نہ بنی ہو، دنیا جانتی ہے جس طرح ایک عدیم البصر آنکھ کا کام کان سے نہین لے سکتا، اسیطرح یہ امر بھی حدود امکان سے باہر اور بالکل باہر ہے کہ آلات سماعت کے افعال اعضائے بصر سے پورے کئے جاسکین۔ لیکن اکتشافات جدیدہ ثابت کرتے ہین کہ یہ خیال فرسودہ ہوچکا۔ اور فی الحقیقت اس قابل نہین رہا کہ ارباب خرد اپنے لمحات عزیز اس اعتنائے بے حاصل مین صرف کرین۔ ابھی حال مین امریکہ کی انسانی اور سرگرم جماعت کے نہایت قیمتی مساعی نے عجیب و غریب حقیقت بے نقاب کرکے ہمارے سامنے پیش کی ہے کہ ہر ایسا شخص جو اپنے کسی حس کے باطل ہوجانے پر لذائذ و نعمات دنیوی سے دستکش ہوچکا ہو بہت آسانی اور سہولت سے زائل شدہ حس کے وظائف و اعمال موجودہ حواس سے حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ مین ایک حیرتناک تجربہ جو ہیلن کلر نامی عورت پر کیا گیا ہے خاص طور سے قابل ذکر ہے،

ہیلن کلر ۱۸۸۰ء مین پیدا ہوئی لیکن بدقسمتی سے دو سال کے اندر ہی اس نے باصرہ، سامعہ، اور قوت گویائی کو خیرباد کہدیا۔ علاج مین تمام امکانی کوششین صرف کی گئین مگر کامیابی نہوئی حتی کہ یہ عدیم المثال لڑکی اپنی عمر کے سات سال ختم کرچکی،

اس تاریک دور کے گذر جانے پر وہ ایک حیات تازہ کی مالک بنی۔ یعنی تعلیم و تربیت مین اسنے ایسی تعجب خیز دستگاہ پیدا کی کہ کسی دوسرے کو آسانی سے میسر نہو سکتی، اسنے مختلف علوم مین کمال پیدا کیا، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، زبانون پر عبور حاصل کرنیکے علاوہ، فلسفہ، ڈاکٹری وغیرہ کی ڈگریان لین اور چند کتابین تصنیف کین جنمین سے کئی مقبول بھی ہوئین، مگر آپ کو حیرت ہوگی، آپ کو تعجب ہوگا، جب آپ یہ معلوم کرینگے کہ اسنے یہ تمام باتین لامسہ اور شامہ کے ذریعہ حاصل کین اور انھین دو قوتون کے اندر ان سارے حواس کی طاقتین سلب کرلین جو بیکار ہوچکے تھے۔

اب یورپ و امریکہ کی باقاعدہ درسگاہین گونگون، بہرون کی تربیت و تدریس کی ذمہ دار ہین۔ اور صرف اشارون سے انھین سب کچھ سمجھا دیا جاتا ہے۔

کثرت مناکحت

ایک زمانہ تھا کہ ہندوؤں کے دوسری بیوی کرنے میں بہت سی رکاوٹیں تھیں شاستروں نے طرح طرح کی پابندیاں لگا دی تھیں۔ انگریزی زمانہ میں عدالتوں میں یہ فیصلہ ہوگیا کہ ہندو کے لئے کوئی تعداد بیویوں کی نہیں۔ جتنی ہدایتیں شاستروں میں درج ہیں وہ اختیاری ہیں۔ لابدی اور ضروری نہیں ہیں۔ عملاً ہندوؤں کے یہاں ایک سے زیادہ شادیاں بدون کسی خاص باعث کے نہیں کرتے۔ راجگان اور رؤسا رالبتہ شوقیہ ایک سے زیادہ شادیاں کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑا اور مسٹر مین نے اپنی تصانیف ہندو لا میں دکھلایا ہے کہ رفتہ رفتہ عدالتوں نے شاستروں کے قیود رفع کر دیئے۔ گویا اسوقت یہ قانون سمجھا جائے کہ ہندو کو کوئی پابندی نہیں۔ یعنی کثرت مناکحت جائز ہے۔ یہ زمانہ حال کی برکتوں میں سے ہے کہ قانون مُردہ بدست زندہ ہے۔ جس طرح سے شارح مقنن اور میر عدالت تعبیر کر دیں وہی مستند قانون بنجاتا ہے۔

ہمکو بعض اوقات حیرت ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے قانون کے مطابق جو چار بیویوں سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا اسکی کوئی تمثیل آیا اور جگہ بھی ہے۔ شارع اسلام نے ایسی پابندیاں لگا دی ہیں کہ درحقیقت ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ (اگر احکام کی پوری پابندی کی جاوے)۔ جب ہم پورانوں کا مطالعہ کر رہے تھے تو بعض میں یہ پڑھا کہ برہمن کے لئے بھی چار بیویاں تک جائز ہیں۔ پابندیاں کوئی درج نہیں۔ ہم ذیل میں حوالجات درج کرتے ہیں۔

اگنی پوران صفحہ ۵۹۲ } میں لکھا ہے کہ برہمن کے لئے چار۔ کھتری کے لئے ۳۔ ویش کے
استلک صفحہ ۸۷۳ } لئے دو اور شودر کے لئے صرف ایک بیوی جائز ہے۔

سانکھ سمرتی صفحہ ۱۶۱ - میں لکھا ہے کہ برہمن کے لئے ۳ - کھتری ۲ ویش اور شودر کے لئے صرف ایک بیوی جائز ہے۔

منوجی کے قانون کے رو سے تو پابندیاں بہت سخت تھیں مثلاً کوئی شخص ۸ برس تک انتظار کئے بغیر بصورت لاولدی کے دوسری بیوی نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ پہلی بیوی کے رضامندی کے بدون دوسری شادی نہیں کر سکتا تھا - موجودہ تعبیروں نے کل پابندیوں کو موقوف کر دیا ہے - کیا مصلیان ملک اس کمی کی طرف کچھ توجہ فرمائیں گے۔

شمیم

رباعیات محروم

(۱)

کس رجعۂ غم آخریں ہے عالم دل کا — ہمکو تو عدو ہے جان ہوا غم دل کا
دل ناکام آرزو میں مضطر تھا کبھی — اب ہم ہیں اور آہ! ناکام دل کا

(۲)

ایام شباب یاد آتے ہیں مجھے — وہ نقش بر آب یاد آتے ہیں مجھے
باتیں وہ ہو گئیں کبھی کی باتیں — بھولے ہوئے خواب یاد آتے ہیں مجھے

(۳)

دنیا میں برائے مردم کم مقدار — اہل شوکت ہیں باعث صد آزار
راہوں میں رہروان منزل کے لئے — اڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار

(۴)

معدوم اسے نہ جان جو ہے مستور — ظلمت کے مقابلے میں موجود ہے نور
اے منکر ذات حق ذرا کھول آنکھیں — فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرور

(۵)

ہنگامہ ترا ہی گرم ہر اک سو ہے — تیرے دم سے ہے جتنی ہاؤ ہو ہے
دل سے پیہم یہی صدا اٹھتی ہے — تو ہی تو ہے یہاں میں تو ہی تو ہے

شُدّھی

ایک جواب

مئی کے زمانہ مین ملکانہ راجپوت مسلمانون کی شُدّھی کے عنوان سے منشی پریم چند نے اُس تحریک پر کچھ نکتہ چینی کی ہے جو ہندوؤن کے ہر ایک طبقہ کو ایک پلیٹ فارم پر لے آئی ہے جسمین آریہ سماجی - سناتن دھرمی - جینی اور سکھ سب شریک ہین - اودھ کے تعلقہ دار آگرہ کے زمیندار - شہرون کے پڑھے لکھے ہندو - گانؤن کے ان پڑھ راجپوت - پنجاب کے جوشیلے کارکن - صوبہ جات متحدہ کے عام باشندے - دولت مند سیٹھ اور غریب پنڈت سب اسمین حصہ لینا فخر سمجھ رہے ہین - بھارت دھرم مہامنڈل - کاشی کی پنڈت منڈلی - امرت سر لاہور اور دوسری جگہون کے پنڈتون کی آشیرباد اِس مین شامل ہے - جس کی کارروائی پر کشتری مہاسبھا آگرہ - کشتری پراشنک سبھا فیض آباد اور راجپوتون کی اور بیشمار کانفرنسین صاد کر چکی ہین - منشی پریم چند کی نکتہ چینی دو تین باتون پر منحصر ہے - ایک تو وہ سرے سے مذہبی تبلیغ کے مخالف نظر آتے ہین - اسلئے وہ ہندوؤن کی اس کوشش کو مذموم قرار دیتے ہین - دوسرے وہ مردم شماری کے اندراجات کی بنا پر اس بات پر اصرار کر رہے ہین کہ یہ مسلمانون کی شُدّھی ہے - اسلئے ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے یہ تحریک ناموزون ہی نہین بلکہ ضرر رسان ہے - تیسرے وہ اس تحریک کو سوراجیہ کی جگہ ہندو راجیہ کا نشان قرار دیتے ہین - ضرورت ہے کہ آپ کی نکتہ چینی پر ذرا غور سے نظر ڈالی جائے تاکہ آپ کے دلمین اور کانگریس کے چند اور سرگرم کارکنون کے دلمین جو خیالات اِس تحریک کے بارے مین پیدا ہو گئے ہین - اُنکی جانچ ہو سکے - سب سے پہلے تبلیغ مذہب مین آپ کی بیرخی کا سوال ہے - آپ نے مذہب کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ ٹھیک سہی - لیکن اُس سے یہ لازم نہین آتا کہ تبلیغ کا کام بند کر دیا جائے - بلاشبہہ مذہب عبد و معبود کے رشتہ اتحاد کا نام ہے - لیکن کیا

اِس دقیق مسئلے کو بغیر کسی روشن دماغ پیشوا کی مدد کے عام طور پر لوگ سمجھ سکتے ہین - اگر آپ کی منطق ٹھیک مانی جائے تو دنیا کے سارے روشن خیال پادری، دقیقہ رس مولوی - اور نکتہ سنج پنڈت بیکار ٹھہرتے ہین - آپ یہ مانتے ہین کہ اس بارے مین ہندوؤن نے سبق مسلمانون سے سیکھا - لیکن اسپر بھی آپ مسلمانون کی ہدایت کے لیے ایک لفظ تک کہنے کو تیار نہین ہین - جن لوگون کی آپ وکالت کر رہے ہین اُنکا تو یہ خیال ہے کہ تبلیغ کا کام کسی حالت مین بھی (ہندو مسلم اتحاد ہو یا نفاق - غیر قوم کا راج ہو یا سوراجیہ) بند نہین کیا جا سکتا عیسائی بھی تو یہ کام کر رہے ہین - اُنکے لیے آپ کیا راستہ تجویز فرماتے ہین - ابھی ایک بدھ مشن مالابار مین آیا ہے - اُسکی آمد پر نہ تو آپ چراغ پا ہوتے ہین اور نہ کانگریس ہی نے ملامت کا کوئی لفظ استعمال کیا ہے - کیا غریب ہندو ہی اس ہندو مسلم اتحاد کے اس ہندوستانی اتفاق کے واحد ٹھیکہ دار ہین کہ اُنکا قول و فعل ہی ملامت کا نشانہ بنے - مسلمان بنگال کی پہاڑیون مین ہندوؤن کو مسلمان بنانے مین مصروف ہین - کیا آپ نے یا کانگریس کمیٹی یا خلافت کمیٹی نے اِس بات پر نوٹس لیا - اتحاد کی لکیر پیٹتے پیٹتے اتنے دن ہو گئے لیکن کیا کچھ کوشش ہندوؤن کے تحفظ کی بھی کی گئی ؟ آپ کو شائد معلوم نہو جسوقت کانگریس نے اچھوتون کے اُٹھانے کا ریزولیوشن پاس کیا تو پنجاب خلافت کمیٹی نے جملہ خلافت کمیٹیون نے ان اچھوت ہندوؤن کو مسلمان بنانے کی دعوت دی تھی - اسپر کانگریس نے کیا کیا تھا ؟ غضب تو اب ہوا - جب ہندوؤن نے بھارتیہ ہندو شدھی سبھا بنا کر اس کام مین ہاتھ ڈالا - آپ کہتے ہین کہ یہ کام اب اجتماعی طور پر ہو رہا ہے - اسلئے قابل ملامت ہے - کیا مسلمان اور عیسائی اجتماعی طور پر کام نہین کر رہے ہین ؟ اگر آپ اس معاملہ مین کم واقفیت رکھتے ہین - اسکا نزلہ غریب ہندوؤن پر نہ گرائیے -

آپ نے دوسرا الزام ہندوؤن کے سر پر یہ تھوپا ہے کہ جہان مسلمان سب دنیاوی خیالات کو دور کر کے ہندوؤن کو صرف جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے ہی اُنھین مسلمان بناتے ہین - وہان لامذہب ہندو ملکانون کو کوئی مذہبی بشارت تو دے نہین سکتے - صرف سیاسی اغراض کے لیے اپنی تعداد بڑھانی ضروری سمجھ کر شدھی کے کام مین لگے ہوئے ہین

بھلا شدھی کے کام کرنیوالون مین سے کتنے ایسے ہین جنھون نے پہلے سیاسی اغراض کیلئے کام کیا ہے - مہاتما ہنس راج اس میدان کے شاہ سوار ہین - یا سوامی دیانند - بی - اے - ذرا کام کرنے والون کی فہرست پر نظر توڈالئے اور پھر بتلائیے کہ یہ کام مذہبی دیوانے کر رہے ہین یا بیوقوف سیاست دان ؟ ایک بات صاف ظاہر ہے کہ ہندو حلقہ مین اس کام کی مخالفت وہی لوگ کر رہے ہین جنکے دماغ پر سیاسی اغراض کا بھوت بُری طرح سوار ہے - جنھون نے آج تک اس بات کی ذرا پروا نہین کی کہ ہندو دوزخ مین جاتے ہین یا جہنم مین - جنھون نے خلافت کمیٹیون کے کام کے لئے دھوان دھار لیکچر دئے ہین اور شاید روپیہ بھی اکٹھا کیا ہو - لیکن جنھون نے آج تک ہندوؤن کے لئے ہندو ہونے کی حیثیت مین کوئی کام نہین کیا ہے - ہان یہ وہی لوگ ہین جنھون نے آخیر دم تک مالابار مین آریہ سماج کے جانے کی مخالفت کی تھی اور جو موقع بے موقع موپلاؤن کے ظلم کی داستانون کی سچائی سے انکار کرتے رہے ہین - اسلئے کہ سیاسی اغراض سے بھرے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے ڈھونگ کو صدمہ نہ پہونچے معاف فرمائیے شدھی کے مسئلہ پر لکھنے کے پیشتر اگر آپ صورت حالات کا ملاحظہ شدہ شدہ کانون مین جاکر کر لیتے تو شاید آپ کو سیاسی اغراض کا بھوت نہ ڈراتا -

آپ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ملکانے مردم شماری کے کاغذون مین مسلمان درج ہین اسلئے وہ مسلمان ہی ٹھہرے اور اسلئے مسلمانون کو اُنکے ہندو ہونے سے صدمہ پہونچنا ضروری ہے - آپ کی معصومانہ ناواقفیت کا کوئی علاج نہین - آگرہ ضلع کے گزیٹیر سے اخبارون مین اقتباسات نکلے - مولانا آزاد سبحانی اور بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی تحقیقات نے اُنکو نہ ہندو اور نہ مسلمان قرار دیا - مولانا آزاد نے اس سوال پر بحث کرنے سے ہی انکار کر دیا - لیکن پھر بھی ملکانے مسلمان ہی رہے - آپ کہتے ہین کہ اُنکے رسم و رواج بھاڑ مین جائین - صرف مردم شماری کی بات صحیح ہے - ٹھیک بہت ٹھیک - نہ معلوم سرکار کی شائع کی ہوئی معلومات کے لئے آپ نے یہ محبت کب سے شروع کی ہے - ایک بات آپ اور بڑے پتہ کی بتاتے ہین - ہندوؤن مین بھی ایسے آدمی ہین جو کئی مسلمان نسلون کے پیرو ہین - اچھی بات ہے آپ ایسے لوگونکو کہان دیجئے - جو کبھی سید ہوتے ہوئے پھر ہندو کئے گئے ہون - جنکا سید دن سے

مجلسی تعلق قائم ہو جو اپنے فرقون کے نام ویسے ہی قائم رکھتے ہون - ایسے لوگون کو جب مسلمان اپنے مین شامل کر لینگے تو سچ مانئے وہ ہندو جو اس قسم کی باتون مین دلچسپی لیتے ہین - ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی دھمکی نہ دینگے اور نہ مسلمان مولویون کو غازی کا رتبہ دلانے کی کوشش کرینگے - لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایسے ہندو عدیم الوجود ہین - آپ جنکا ذکر مثال کے طور پر کر رہے ہین اُنکی اور ملکانون کی حیثیت مین زمین و آسمان کا فرق ہے - ملکانہ ٹانک راجپوت ہین تو دوسری طرف ہندو ٹانک راجپوت بھی ہین - یہی نہین اُنکی اندرونی شاخین بھی قائم ہین اور ایک ہندو ایک ملکانہ کو چچا مانتا ہے -

اب آپ الزام دیتے ہین کہ ہندوؤن نے اس تحریک کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے مین پہل کی - پھر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی معلومات نہ معلوم کتنی پرانی ہین اگر آپ مالابار کے فساد سے پہلے لکھتے جبکہ ہندوؤن کو زبردستی مسلمان نہین بنایا گیا تھا - اور پھر اُس پر ایک دو کو چھوڑ کر کسی ذمہ دار مسلمان لیڈر نے ہندوؤن سے ہمدردی کی ہوتی اور مسلمان علمانے موپلاؤن کو غازیون کا خطاب دیکر اُنکے لئے اپیل نہ کی ہوتی تو شاید آپ کا الزام بجا ہوتا - اگر آپ ملتان کے فسادات سے پیشتر لکھتے جبکہ ہندوؤن کی مقدس کتابین جلائی نہین گئی تھین - اُنکی مقدس عمارتون کو مسمار نہین کیا گیا تھا - اُنکی عورتون کی بے حرمتی نہین کی گئی تھی تو شاید ہندو آپ کی بات مان لیتے - اگر آپ پنجاب مین میان فضل حسین کی زیر سرپرستی مسلم راج کے عملاً شروع ہونے سے پہلے لکھتے تو بھی آپ کی بات قابل اعتبار ہوتی - لیکن اب تو آپ بے سُرا راگ الاپ رہے ہین - معلوم نہین آپ نے اِن باتون کو بھلا دیا ہے - یا آپ ایسی چار دیواری مین رہتے ہین جہان ہندوؤن کی شکایات پہونچ ہی نہین سکتین - لیکن نہین آپ خود لکھتے ہین -

"جن صوبون مین مسلمانون کی آبادی زیادہ ہے وہان ہندوؤن کو آسایش اور اطمینان میسر نہین - اُنکی لڑکیان - اُنکی بیوائین ہمیشہ اسلامی دست بُرد کا شکار ہوتی رہتی ہین" -

اگر ہندو مسلم اتحاد کے یہی معنی ہین تو ایسے اتحاد کو دُور سے سلام - ہندو بھی بڑے خوش قسمت ہین - مار بھی کھاتے ہین اور پھر ایسے ناصح بھی موجود ہین جو کہ صبر کا اُپدیش کر رہے ہین

گویہ اُنکی طاقت سے باہر ہے کہ صورت حالات کے بہتر ہونے کا کوئی پیغام ہندوؤن کو سنائین۔

آپ تیسرا الزام یہ دیتے ہین کہ شدھی کے سلسلے نے نہین بلکہ اسپر جملہ ہندوؤن کے اتفاق نے مسلمانون کو شبہہ مین ڈال دیا ہے۔ خوب فرمایا اگر مسلمانون کو راضی رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندو ہندو آپسمین بچھڑے رہین۔ اگر کانگریس سوراجیہ کو اُسوقت حاصل کرسکتی ہی۔ جب سناتن دھرمی آریہ سماجیون سے دور بھاگین۔ تو ہندوؤن کو سوچنا پڑیگا کہ اُنھین اپنے لئے کیا انتظام کرنا چاہئے۔ ایک بات آپ نے ٹھیک کہی تعداد ہی سب کچھ نہین ہے اگر یہی سب کچھ ہوتی تو ہندوؤن کی یہ دُردشا نہ ہوتی لیکن مخالفین تو اسی بات مین خوش ہین کہ ہندو اپنے آپ کو ایک نظام مین بھی نہ باندھ سکین۔ پنجاب کے مسلمان اخبارون نے مالوی جی کے اس معاملہ پر تقریرون پر جو شور مچایا تھا وہ صاف اس بات کا ثبوت ہے۔

آپ ہندوؤن سے مذہبی رواداری کے نام پر اپیل کرتے ہین کہ وہ اس تحریک کو بند کردین۔ یہ اپیل ایک مایوسانہ لہجہ مین ہے۔ ہم خوش ہین کہ آپ نے اس بات کو محسوس کیا ہے کہ شدھی مین حصہ لینے والے اس کام سے باز نہین آنے کے۔ لیکن آپ نے اسکے حامیون کی تعداد کا اندازہ غلط لگایا ہی۔ جن لوگون نے اسکے لئے ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ اکٹھا کرکے دیا۔ جس طبقہ مین سے اسکے دوسو سے زیادہ کارکن آئے ہین وہ شدھی کی اہمیت کو سمجھ چکا ہی۔ اُنکے لئے ہندو مسلم اتحاد کے نام پر گمراہ کُن اپیلین کسی کام کی نہین۔ اور سچ پوچھو تو یہی وہ لوگ ہین جنھون نے ہندوؤن کی مصیبتون مین آج تک اُنکا ہاتھ بٹایا ہے۔

آپ اس تحریک سے ہندو مسلم اتحاد کو صدمہ پہونچنے اور اُس سے کانگریس کا کام بند ہونے کی ناخوشگوار خبر سناتے ہین۔ کیا کانگریس کے لئے کام کرنا ہندوؤن پر احسان کرنا ہی؟ کیا سوراجیہ کے نزدیک ترین لانے کے لئے کوشش کرنا اُنکو شکرگزار بنانا ہے؟ اگر نہین تو پھر یہ ڈراوا کیسا۔

وقت ہی کہ سیاسی میدان مین کام کرنیوالے اور خاصکر سیاسی کامون مین حصہ لینے والے ہندو اس بات کو سمجھ لین کہ ہندوؤن کی کمزوری ملک کے لئے نقصان دہ ہی جب تک ہندو کمزور ہین اور مسلمانون کو یقین ہے کہ وہ کمزور ہین اُسوقت تک ہندو مسلم اتحاد بے معنی ہے۔

سہرام شرما۔ ایم۔ اے

طالب بنارسی

منشی ونایک پرشاد صاحب مرحوم طالب بنارسی بنارس مین پیدا ہوئے، بنارس ہی مین تعلیم پائی اور زندگی کی آخری گھڑیان بھی بنارس ہی مین گزرین، گو بسلسلۂ ملازمت اکثر آپ کا قیام بمبئی مین رہا لیکن جب وقت آپہونچا خاک وطن نے کشش کی، بنارس آئے اور وہین ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کو انتقال فرمایا، مرحوم کو اُردو شاعری کے اعتبار سے جو کامیابی نصیب ہوئی وہ محتاج بیان نہین، ادبی مذاق رکھنے والے اصحاب بخوبی جانتے ہین اور خود آپ کا کلام شاہد ہے، آپ کے طبیعت کی روانی خداداد تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ جو کچھ کہتے تھے خوب کہتے تھے۔ اُردو کے علمی رسالون اور اخبارون مین آپ کا کلام قدردانی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ فارسی، ہندی، اُردو، انگریزی زبانون مین آپ کو اچھی مہارت تھی اور قریب قریب سب زبانون مین آپ نے مشق سخن کی ہے۔

مرحوم اپنے وقت کے ایک پُرگو شاعر تھے۔ نظم کے علاوہ نثر مین بھی آپ نے خوب خوب مضامین لکھے ہین، جذبات انسانی کی تصویر کھینچنا اور اُس سے دلون کو متاثر کرنا آپکا خاص حصّہ تھا۔ نظم کے ہر صنف مین آپ کا کلام پایا جاتا ہے۔ غزل، رباعی، مثنوی، وغیرہ وغیرہ سب کچھ آپ کی تصانیف مین موجود ہین۔

عربی اور سنسکرت مین بھی آپ نے اپنے شوق علمی کے بدولت قابلیت حاصل کرلی تھی آپ کی گفتگو عالمانہ ہوتی تھی اور اس سے آپ کی ادبی دستگاہ کا پورا ثبوت ملتا تھا۔

آپ کے وسیع الخیالی اور خوش خلقی نے شاعرانہ خیالات کو اور بھی قابل قدر بنادیا تھا شاعری کے علاوہ آپ نے ملک کی ڈرامانویسی مین بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی، اس فن مین آپ نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج آپ کے لکھے ہوئے ڈرامون سے بڑی بڑی کمپنیان اپنی

اسٹیجوں کو زینت دے رہی ہیں، آپ کے ڈرامے مقبول خاص وعام ہوئے، آپ کا ایک ڈراما انگلستان میں بھی ترجمہ ہوکر کھیلا گیا ہے۔

آپ کا ظریفانہ کلام بھی ایک خاص شان رکھتا تھا، اور اہل ذوق کے دلوں میں چٹکیاں لیا کرتا تھا، ظرافت کے ساتھ بیان و زبان کی پاکیزگی اور بندش کی چستی بھی قابل قدر تھی۔

ارباب ذوق شاید یہ مژدہ مسرت کے ساتھ سنیں گے کہ آج کل آپ کے شاگرد رشید منشی بیلی رام صاحب آپ کی مفصل سوانح عمری لکھ رہے ہیں امید ہے کہ آپ کی کوششیں بارآور ہونگی، اور اس خدائے ادب کے ادبی کارنامے دنیائے ادب میں ایک خاص نظر سے دیکھے جائیں گے۔

جنگ بہادر نگم اکبرپوری

شراب محبت

اے محبوب میری آنکھوں اور سادہ لوح دلمیں اب سوائے تمھارے غم کے اور کچھ نہیں ہی۔ ہر جگہ ہوا سے بھرے ہوئے آسمانوں اور پھولوں سے بھری ہوئی زمین پر۔ میں تمھارے چہرہ کے تبدیل ہوتے حسن کو ہزاروں شکلوں میں دیکھتا ہوں۔

میری بیخود نظروں میں تمھیں سب سے بڑی اور مسرت بخش حقیقت ہو تمھیں صبح کے ستارہ کی رونق، اور سمندر کے نغموں کی روح ہو۔ تمھیں بہار کی عطر بیزی کے سبب اور خرمن زمانہ کے قیمتی سرمایہ ہو۔

اے محبوب میری سادہ لوح روح اور عقل کو اب سوائے تمھارے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اسکے نزدیک زندگی کے پاک سرچشمہ کی (جسمیں میری روح کو اب بھی مختلف اوقات میں آرام و آسائش حاصل ہی) کوئی قیمت نہیں۔

اے تیز دھار والی تلوار! اے بیش قیمت تاج، اور اے میرے رنج و خوشی کے مندر میرے تمام رنج و آلام کا انحصار تمھارے ایک ابرو کے اشارے میں پنہان ہی۔ اور میری تمام مسرتیں تمھاری ایک نگاہ میں محدود ہیں۔ تم میری حیات کا سرچشمہ ہو، اور میری موت کی حقیقت بے نقاب،

(ترجمہ) عالی لکھنوی

ریویو کتب

(مزدور کی بیٹی)

اس سبق آموز اور عبرت انگیز ناول کے مصنف مسٹر شمس الدین حسن ایڈیٹر ریلوے یونین نیوز ہین، یہ جسقدر دلچسپ ہے اُسیقدر تعجب انگیز بھی ہے، دلچسپی واقعات پر منحصر ہے لیکن تعجب انگیزی مصنف کی عبارت پر، مزدور کی بیٹی، دراصل روز ایلمبرٹ، کی ہو بہو نقل ہے۔ روز ایلمبرٹ، رینالڈ کا ناول ہے، اسکے مترجم جناب آنر لکھنوی ہین، مسٹر شمس الدین صاحب نے ستم یہ کیا ہے کہ اصل قصہ کے علاوہ قریب قریب عبارت بھی وہی آنر لکھنوی کی نقل کردی ہے۔ نام البتہ بدل دیئے ہین۔ کیا ادبی دنیا مین ایسی جرأت قابل ستائش قرار دیجاسکتی ہے ہم ذیل مین دونون کتابون سے چند سطرین نقل کرتے ہین، تاکہ ناظرین کو اندازہ ہو جائے کہ روز ایلمبرٹ اور مزدور کی بیٹی دونون ایک ہین صرف نام کا فرق ہے۔ روز ایلمبرٹ مین ایک پادری کی لڑکی کا قصہ لکھا ہے، ایک موقع پر اُس سے ایک دولتمند اور آوارہ مزاج نوجوان اظہار عشق کر رہا ہے، اُس واقعہ کے متعلق وہ خود یہ کہتی ہے۔

"یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے مجھ سے عشق آمیز گفتگو کی، میرے خیالات نے کبھی تو وہ سبز باغ دکھایا کہ جسکی انتہا نہین، مین سوچنے لگی، اگر مین نے ایک ایسے دولتمند رئیس سے عقد کیا تو اپنے باپ کو اس تہلکۂ افلاس سے نجات دلانے کے علاوہ سرل کو بھی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ عہدہ دلاسکون گی"

مزدور کی بیٹی مین بھی ہیروئن کو یہی موقع پیش آیا ہے اور وہ کہتی ہے۔

میری تمام زندگی مین یہ سب سے پہلا موقع تھا کہ مین نے اس قسم کی بیہودہ گفتگو کسی نامحرم سے کی ہو، اس گفتگو نے مجھے مسحور کردیا، میرے خیالات نے وہ سبز باغ تیار کئے کہ جنکی انتہا نہین ہوسکتی، مین نے خیال کیا اگر مین ایسے امیرزادے سے فی الواقع شادی کرلون

تومین اپنے باپ کو مفلسی سے نجات دلاسکتی ہون اور اپنے بھائی کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلاسکتی ہون"

ایک ایڈیٹر کے لئے یہ جرم ناقابل عفو ہے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۲۰۰ صفحہ قیمت ایک روپیہ عہ ملنے کا پتہ۔ منیجر یونین گزٹ بک ڈپو۔ اندرون موچی دروازہ (لاہور)

سیاحت ہوا

دائرۂ ادبیہ لکھنؤ کے سلسلۂ اشاعت مین علمی ناولون کی اشاعت بھی شامل ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی سیاحت ہوا ہے۔

سیاحت ہوا مین ہوائی پرواز کے متعلق ایک دلچسپ افسانہ ہے جسمین اس علمی مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سائنس کے خشک مسائل کو واقعات مین اس طرح سمو دیا ہے کہ جزو داستان بن گئے ہین، اصل ناول فرانس کے شہرۂ آفاق ناولسٹ جولیس ران کے زور قلم کا ممنون ہے، جسکو مولوی سید محمود اعظم صاحب فہمی نے اُردو مین ترجمہ کیا ہے، ترجمہ کی خوبی سے سیاحت ہوا مین ایک مستقل تصنیف کا رنگ پیدا ہوگیا ہے کاغذ نفیس کتابت وطباعت دیدہ زیب۔ ملنے کا پتہ۔ دائرہ ادبیہ لکھنؤ۔

آنند مٹھ

یہ سیاسی ناول بنگالی زبان کے سرمایۂ ناز فسانہ نگار بنکم چندر چٹرجی کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اسمین بنگال کے اُن سیاسی سادھوؤن کے حالات وخیالات بیان کئے گئے ہین جو افغانون کی حکومت کے خلاف سرگرم کار تھے۔ حقیقتاً یہ ناول قومی اور ملکی خدمات کا معلم ہے، اسکا مطالعہ ملک اور اہل ملک کے لئے بہت مفید ہوسکتا ہے، اسکو ڈاکٹر گوکل چند فارنک ایم اے۔ بی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا پنجاب نے بنگال سے اُردو مین ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ مین اکثر سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ موجود ہین اسوجہ سے بعض جگہ اُردو کی سلاست پر حرف آگیا ہے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۲۱۵ صفحہ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ ملنے کا پتہ۔ منیجر گیان پرکاش مندر پوسٹ ماچھرہ ضلع میرٹھ۔

چترا ولی

انڈین پریس الہ آباد نے چترا ولی کے نام سے ۱۶ تصویرون کا ایک مرقع نہایت عمدہ اور دیدہ زیب شائع کیا ہے۔ یہ تصویرین بہترین مصورون کی بنائی ہوئی ہین، حسن طباعت نے اور بھی چار چاند لگا دیئے ہین۔ بعض تصویرین خصوصیت سے قدر کے قابل ہین۔ تیسری تصویر مصوری کا بہترین نمونہ ہے، جسمین ایک مزار کے قریب ایک حسینہ سر بہ زانو بیٹھی ہے، اور دوسری عورت ہاتھ مین پھول لئے کھڑی ہے۔ اُسکے ہاتھ سے خود بخود پھول چھوٹ کر نیچے گر رہے ہین، قبر پر لکھا ہے، اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ہر تصویر کے متعلق آخر مین ایک نوٹ بھی دیا گیا ہے، جسکے پڑھنے کے بعد تصویر کی شان بڑھ جاتی ہے۔ لطف النسار کی تصویر بھی ایک مرقعۂ عبرت ہے، سراج الدولہ کی قبر کے پاس لطف النسار ایک عالم استغراق مین بیٹھی ہے، یہ تصویر عورت کی وفاداری اور شوہر پرستی کا آئینہ ہے،

چندر مکھی کے نام سے جو تصویر دی گئی ہے وہ خصوصیت سے قابل قدر ہے۔ واقعی مصوری خاموش شاعری ہے۔ اس مرقع کی قیمت عہ مقرر ہے۔

ملنے کا پتہ۔ انڈین پریس الہ آباد۔

(اعظمی)

الہلال

یہ مذہبی، سیاسی، علمی، اخلاقی اور ادبی مضامین کا قابل قدر رسالہ ہے۔ جو دہلی سے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا رہتا ہے۔ اسکے قلمی معاونین کا حلقہ وسیع ہے، جسمین ملک کے اکثر مشاہیر ارباب قلم شامل ہین۔

تقطیع ۱۸/۲۲ حجم ۳۲ جز، کاغذ عمدہ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، باوجود ان خوبیون کے قیمت سالانہ صرف عہ مقرر ہے۔

ملنے کا پتہ۔ دفتر الہلال دہلی۔

قریۂ ویران

اِس سے قبل کئی بار اس دلچسپ نظم کے مختلف ٹکڑے ہدیۂ ناظرین ہو چکے ہین۔
اصل واقعہ یون ہے کہ جب اُمرا و تجّار کے ظلم سے ادبرن کے کسان اُجڑ کر شمالی امریکہ مین چلے گئے تو اُنکو طرح طرح کی آفتون کا سامنا کرنا پڑا اور یہان آکر بلاؤن مین گھر گئے،
گولڈ اسمتھ نے اس نظم مین انھین غریبون کی مصیبتون کا مرقع پیش کیا ہے اور سید راحت حسین صاحب اسے اردو لباس پہنانے کی کوشش کر رہے ہین۔ ترجمہ کی روانی قابل داد ہے کاش جناب مترجم اس نظم کے ترجمے کو چھوٹے چھوٹے حصون مین منقسم کرکے بے لطف نہ بناتے۔

بند ۲۱

اے حسین ادبرن کیا تیری زنانِ مہ لقا
اپنی بدبختی سے ہین رنج و الم مین مبتلا
یخ کی ایذائین اُٹھا کر ہوکے فاقون سے نڈھال
خود پرستون سے کیا کرتی ہین روٹی کا سوال ۳۴۰
کچھ یہی حالت نہین جب سے چھٹا پیارا وطن
بلکہ اس سے بھی زیادہ اُنکے ہین رنج و محن
کالے کوسون اُس طرف دنیا کے ہین مرکز گزین
بیچ مین ہے نصف کرہ کی محدّب سرزمین
جادہ پیمانا تو ان قدمون نے ساتھ اُنکا دیا
چلتے چلتے حارہ خطے مین جا کر دم لیا

(منزلین ہین پُرخطر اور آفتون کا سامنا)
درد و غم پر اُن کے نوحہ خوان ہے نہرِ التما
دلربا منظر کہان دل چسپیان وہ اب کہان
کتنی درد انگیز ایذائین یہان ہین الامان
مشتعل سورج پھرا کرتا ہے سر پر جلوہ گر
شعلۂ جوالہ ہین اُسکی شعاعین سر بہ سر
کوئی لاسکتا نہین تابِ شعاعِ آتشین
دوڑتی ہین آگ برساتی ہوئی سوئے زمین
دھوپ کی شدّت سے مرغانِ چمن خاموش ہین
دم بخود ہین پیاس سے اور کنج مین روپوش ہین
وہ گھنے جنگل کی تاریکی جہان دبکے ہوئے
اونگھتے چمگادڑون کے جھنڈ ہین لٹکے ہوئے
دامنِ صحرا مین زہریلی فضا چھائی ہوئی
لہلہاتے سبز پودون پر بہار آئی ہوئی
زہر آلودہ وہ کالے بچھوؤن مین شانِ مرگ
کرتے پھرتے ہین فراہم چارسو سامانِ مرگ
ہر قدم پر دل دھڑکتا ہے یہ ہوتا ہے یقین
کینہ کش پھنکارتے افعی نہ جگ جائین کہین
گھات مین بیٹھا ہے شیرِ گرسنہ بھی بیقرار
ہر گھڑی ہے اُسکو صیدِ بیخبر کا انتظار
(ظالم و بے رحم اور سفّاک قاتل الامان)
شیر سے بھی بڑھکے ہین خونخوار باشندے یہان

خاک اُڑاتی مثلِ دیوانوں کے ہیں ہر سو دواں
چرخ کھاتی تند و پُرآشوب کالی آندھیاں
ایک کر دیتی ہیں دم میں عالمِ ارض و سما
جڑ درختوں کی نظر آتی ہے بالائے فضا
ہائے یہ روداد ہے اِک داستانِ دلشکن
آہ وہ دلکش مناظر آہ وہ پیارا وطن
(دامنِ کہسار میں بھولی ہوئی وہ شاخسار)
سرد جھرنے پر وہ سبزوں کے لہکنے کی بہار
پُرفضا وہ کُنج وہ گنجان شاخیں رازدار
چوم جاتے تھے جنھیں جھونکے ہوا کے بار بار
طائروں کی نغمہ سنجی چہچہوں کا وہ خروش
رازدارانِ محبت کے وہ پتے پردہ پوش
یعنی تھیں خلوت سرائے حُسن و اُلفت جھاڑیاں
دو محبت آفرین دل چھپ کے ملتے تھے جہاں

(باقی آیندہ)

سیّد راحت حسین بی اِل

جذباتِ بسمل

اِن دنوں حال عجب ہے ترے دیوانوں کا
دامنوں کا ہے ٹھکانہ نہ گریبانوں کا
اک نگاہِ غلط انداز اِدھر بھی ساقی
خون ہو جائے نہ ظالم مرے ارمانوں کا
سرِ محفل تری رنگینیٔ جلوہ کی بہار
خاتمہ آج کئے دیتی ہے ایمانوں کا
بل بجھے خاک ہوئے اُف بھی نہ نکلی منھ سے
تیری محفل میں عجب حال تھا پروانوں کا

فضل اللہ بسمل

جذباتِ ریاض

کلامِ تازہ لسان العصر حضرت ریاض

تا عمر مزے دور مے و جام کے اُٹھے
ہم قبر سے پیاسے مئے گلفام کے اُٹھے

ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جو خم و جام کے اُٹھے
میخانے سے کچھ ڈھیر مرے نام کے اُٹھے

ہم جا کے تہ دام دبے پاؤں پھر آئے
قسمت سے کنارے تھے کچھ اُس دام کے اُٹھے

کل اُسکی گلی مین کوئی سو بار گئے آئے
تا صبح نہ بیٹھے کہین، ہم شام کے اُٹھے

میخانے مین جا کر عوضِ دُرد لگا آئے
جب دام نہ کچھ جامۂ احرام کے اُٹھے

یہ کہہ کے شبِ وصل ہمین چھیڑ رہے ہین
پہلو سے ہمارے کوئی دل تھام کے اُٹھے

اِس قصد سے موسیٰ کو غش آیا ہے اُٹھا لائین
کچھ سایہ نشین آج ترے بام کے اُٹھے

بیتاب کیا لذتِ دُشنام نے ایسا
مُنھ چومنے عاشق تری دُشنام کے اُٹھے

فرہاد سے کوئی نہ بڑھا تیشہ زنی مین
اُٹھنے کو کئی آدمی اِس کام کے اُٹھے

ہم سائلِ میخانہ نہین کم کے وجم سے
چلو سے اگر پی تو مزے جام کے اُٹھے

جب کہہ کے ریاض اُسنے پکارا سرِ محفل
بن بن کے کئی آدمی اِس نام کے اُٹھے

بہارِ شفق

(از برق دھلوی۔ بی۔ اے۔ منشی فاضل۔ ایس۔ ایل۔ ایس)

ہے جلوۂ بہارِ شفق آسمان پر
صہبائے سُرخ یا یہ خمِ نیلگوں میں ہے
پردہ ہے مہر جلوہ فگن ہے جہاں پر
یا برق بیقرار تڑپ کر سکوں میں ہے

لایا ہے رنگ خونِ شہیدانِ نامراد
یا آگ لگ رہی ہے کسی لالہ زار میں
یا مشعلِ فرشتوں میں ہے آتشِ فساد
یا گرم کارزار ہے، یہ نور و نار میں

کیا آسماں کو لعل لگے ہیں خدا کی شان
پھیکا ہے جنکی آب سے رنگِ گلابِ سُرخ
یا ہے نظر کو شعلۂ جوالہ کا گماں
یا دامنِ فلک پہ گری ہے شرابِ سُرخ

لالے کے پھول دامنِ چرخِ بریں میں ہیں
یا معدنِ عقیق کی ضو ہے نظر فروز
یا پارہ ہائے آتشِ گل، گلرخ میں ہیں
یا آسماں پہ ہے کرۂ نار جلوہ سوز

پہنے قبائے سرخ کوئی مشعلہ فام ہے
یا روئے آتشیں کا ہے جلوہ نقاب میں
یا چرخ فتنہ ساز یہ آتش بجام ہے
یا آفتاب ڈوب گیا ہے شہاب میں

پہونچا ہے اُڑ کے تا فلکِ اخضری گلال
یا کاسۂ فلک میں یہ ہولی کا رنگ ہے
یا روئے مہر پر ہے، یہ سُرخیٔ انفعال
غصّے سے لال، روئے حسینِ فرنگ ہے

لیلائے شب ہے محملۂ زرّیں میں جلوہ گر
رکھے ہیں آس پاس مئے آتشیں کے جام
مستِ مئے نظارہ نہو برق کیوں نظر
جوشِ شباب پر ہے عروسِ بہارِ شام

برق دھلوی

تو کہاں ہے

نور پاشی کر رہی ہے چاندنی مہتاب کی — اور سکوتِ محویت سے آسماں معمور ہے
ہو گیا فرشِ زمیں گویا کہ دریا نور کا — جسکا ہر ذرہ تحیر خیزیٔ صد طور ہے

شیوۂ صبر و سکوں سے پھر بھی میں بیگانہ ہوں
تو کہاں ہے جلد آ تیرے لئے دیوانہ ہوں

کرتی ہے بادِ سحر پھولوں سے جب اٹکھیلیاں — بامِ گردوں سے نمایاں ہوتے ہیں آثارِ صبح
ننھے ننھے طائروں کی پیاری پیاری بولیاں — جنکے نغموں سے ہے افزوں گرمیٔ بازارِ صبح

ڈھونڈتی ہیں میری آنکھیں تجھکو اے رہرو جبیں
کر رہی ہے یاد تیری دل مرا اندوہگیں

اور سکوتِ شام میں باہم ملیں جب پیار سے — چھوٹی چھوٹی لہریں پانی کی وہ نازک نازنیں
صاف اور شفاف پانی پر مقدس آفتاب — ڈالتا ہے بامِ گردوں سے شعاعِ دلنشیں

تیرے جلوے کے لئے آنکھیں ہیں وقفِ جستجو
تیرے عارض تک پہونچنے کی انھیں ہے آرزو

وہ چٹکنا باغ میں غنچوں کا ہنگامِ سحر — اور شاخِ گل پہ بلبل کی ترنم ریزیاں
حیرت افزا سبزۂ نوخیز کا نظارہ جب — فرشِ بستاں پر کرے پیدا تحیر خیزیاں

تو کہاں ہے راحتِ دل مایۂ صبر و سکوں
آ کہ دکھلاؤں تجھے میں داغہائے لالہ گوں

اے مرے مہرِ درخشاں اے مجھے جاں سے عزیز — تجھ سے روشن ہے مرا یہ خاکدانِ زندگی
اے مرے درمانِ دردِ دل سکونِ اضطراب — اے مرے عیسیٰ نفس روحِ روانِ زندگی

اے مسیحا کچھ تسلی دے دلِ بیمار کو
ہاں مری آنکھیں ترستی ہیں ترے دیدار کو

احمد شیر حسرت

داستانِ غم

غم سے نجات ہو چکی، ہستیٔ ناگوار کو
موت اب اختصار کر، مدّتِ انتظار کو

بھول گئے تھے عیش میں، کل جو مآلِ کار کو
آج وہ رو رہے ہیں کیوں، گردشِ روزگار کو

اب نہیں دل میں رنگِ خون، گریۂ غم کو کیا کروں
خون کہاں سے لاکے دوں، دیدۂ اشکبار کو

راحت و غم سے کیا غرض، اُنکی خوشی سے ہے خوشی
ہمنے نثار کر دیا، جبر پہ اختیار کو

جلوہ گہِ حیات ہے، اصل میں منظرِ فنا
مرگ ہے جانِ زندگی، دیدۂ اعتبار کو

غم کہ ہے جانِ زندگی اسکو کبھی فنا نہیں
لاؤ بدل لوں اِس سے میں ہستیٔ مستعار کو

شام سے مضطرب ہے دل رات پہاڑ ہو گئی
آج قرار آگیا! گردشِ روزگار کو

کشمکشِ حیات سے، مر کے نجات ہو نہ ہو
خیر اک آسرا تو ہے، قلبِ اُمیدوار کو

ضبط ہی مایۂ سکون، ہاں اسے مانتا تو ہوں
آہ مگر میں کیا کروں، اس دلِ بیقرار کو

رنگ اُڑیگا مثلِ بُو، بھول بنینگے داغِ دل
دورِ خزاں میں دیکھنا مست مئے بہار کو

حاصلِ کیفِ انبساط، نشۂ غم ہے یاد رکھ
خونِ جگر سمجھ کے پی، بادۂ خوشگوار کو

ایک تمھارے واسطے، سب سے وہ ہاتھ اُٹھا چکا
تم نہ اُٹھاؤ بزم سے احسنِ خاکسار کو

احسن سنبھلی

لطف سخن

مرزا جعفر علیخان اثر لکھنوی

کنکھیون سے دل پر نظر کرنیوالے
یہ ناوک نہین ہین اثر کرنیوالے

شب غم تڑپ کر بسر کرنیوالے
اِدھر کی ہین دنیا اُدھر کرنیوالے

تپکنے لگے دل کے سب داغ کہنہ
مری بیکسی پر نظر کرنے والے

تم آئے مگر ہائے کسوقت آئے
کہ تیار ہین جب سفر کرنیوالے

ذرا بیکسون سے خبردار رہنا
زمانے کو زیر و زبر کرنے والے

کہین اُٹھ بھی جائے یہ پردہ دوئی کا
اِدھر دیکھ! اودل مین گھر کرنیوالے

جنھین سانس لینے کی طاقت نہین ہے
مہمات اُلفت ہین سر کرنیوالے

مجھے شوق تقریر لایا یہان تک
خطاؤن سے اے درگذر کرنیوالے

کبھی جن سے تسکین ہوتی تھی دل کو
وہی نالے اب ہین ضرر کرنیوالے

مسیحا بنے پھر رہے ہین جہان مین
مرے خون سے دامن کو تر کرنیوالے

خلش سے تمنا کی آزاد کردے
دعاؤن مین پیدا اثر کرنیوالے

یہ کیا ہی نہین دیکھتے آنکھ اُٹھا کر
لحد پر اثر کی گذر کرنیوالے

غزل منشی جگت موہن لال رواں

وہ خوش ہو کے مجھ سے خفا ہو گیا
مجھے کیا اُمید ین تھین کیا ہو گیا

کوئی چارہ سازون سے کہدے مرے
کہ میرا مرض لا دوا ہو گیا

مرے جذب دل کی کمی کھل گئی
اگر تیر اُنکا خطا ہو گیا

کسی غیر سے کیا توقع کہ جب
میرا دل ہی دشمن مرا ہو گیا

کہان سے کہان لائی قسمت مری
کس آفت مین مین مبتلا ہو گیا

کسی نے جو پوچھا مرا حال درد
مرا درد اس سے سوا ہو گیا

رواں تو کہان اور کہان زندگی
مجھے کیا یہ مرد خدا ہو گیا

علمی نوٹ اور خبریں

فارسی کی قدردانی راجہ مہندر پرتاپ نے تجویز پیش کی ہے کہ ایشیا کے لئے ایک مخصوص زبان ہونی چاہیے، موصوف کی رائے مین موجودہ زبانون مین صرف ایک فارسی زبان ہے، جو اِس ضرورت کے لئے انتخاب کیجاسکتی ہے۔ کیونکہ ایشیا کی زبانون مین اسکو ایک خاص امتیاز اور تفوق حاصل ہے۔

ایران جیسے قدیم ملک کی مادری زبان فارسی ہے، سنسکرت سے اسکا گہرا تعلق ہی، افغانستان اور بخارا مین اسکو ملکی زبان کی حیثیت حاصل ہی، ہندوستان اور ترکی مین بھی فارسی مدتون سرکاری زبان رہ چکی ہے، آج بھی اُن ممالک مین کچھ نہ کچھ اسکا رواج ہے، ترکستان کے چینی بھی فارسی زبان کا مطالعہ نہایت ذوق شوق سے کرتے ہین، جاپان کا ایک محقق کہتا ہے کہ جاپانی بھی فارسی زبان سے نکلی ہے۔ اِنھین خصوصیات کی بنا پر راجہ مہندر پرتاپ صاحب نے یہ رائے پیش کی ہے۔

اسمین شک نہین کہ فارسی دنیا کی اکثر زبانون سے سہل ہے، اِسکے صرف و نحو کے قواعد آسان ہین۔ اسلئے عام طور پر اسکا حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہین، چونکہ فارسی مین عربی کے الفاظ بھی کثرت سے شامل ہو چکے ہین، اسلئے ممکن ہے کہ مصر اور شمالی مغربی افریقہ مین بھی یہ بین الاقوامی زبان تسلیم کر لیجائے، مگر اسکا یہ مطلب نہین کہ اسکی تعلیم تمام پبلک اسکولون مین بھی عام کر دیجائے بلکہ صرف بین الاقوامی سیاسات مین جانیوالون کو پڑھنی پڑیگی، دیکھئے اِس تجویز کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

ہندوستان مین اندھون کی تعلیم بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہندوستان مین اندھون کی تعلیم کو رواج دینا چاہیے، بعض مقامات پر اسکے متعلق کچھ کوشش بھی ہوئی لیکن کوئی خاص

کامیابی نہین ہوئی،

اسمین شک نہین کہ علم کی روشنی ہی ایک ایسی چیز ہے جو ان غریبون کو ظلمات سے نکال سکتی ہے، لیکن ابھی ہندوستان مین آفتاب علم کی کرنین ایسی مدھم ہین کہ اندھے تو اندھے خدا نے جنھین دو آنکھین دی ہین وہ بھی ایک حد تک اس جہان افروز روشنی سے محروم ہین، سب سے پہلے تو یہان تعلیم کو عام بنانے کی کوشش ہونی چاہئے، علم کی روشنی عام ہوگی تو اندھون کی آنکھون پر بھی اسکا اثر پڑیگا۔

بعض مغربی ملکون مین جہان اندھون کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہے، وہان تعلیم بالکل عام ہے، اور قریب قریب ہر شخص تعلیم یافتہ ہے۔ اندھون کی تعلیم کے لئے بھی مدارس قائم ہین اور باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے، چنانچہ امریکہ مین اندھون کے لئے کتابین چھاپنے کے دو بڑے کارخانے قایم ہین، ایک بمقام بوسٹن قایم ہی جو غیر سرکاری ہے، اور دوسرا جسکا نام "امریکن پرنٹنگ ہاؤس فور دی بلائنڈ" ہے، بمقام لوئس وائل قائم ہے، اس مطبع کو گورنمنٹ سے دو لاکھ روپیہ سالانہ امداد ملتی ہے۔ اس مطبع مین اُبھرے ہوئے حرفون مین رسالے اور کتابین چھپتی ہین اور اندھون کو تعلیم دینے والے مدرسون مین مفت تقسیم ہوتی ہین، اُبھرے ہوئے حرفون مین چھپنے کی وجہ سے ضخامت بہت بڑھ جاتی ہے، اور اسی اعتبار سے قیمت بھی، جو کتاب معمولی ٹائپ مین چھپکر پانچ روپیہ کو بکتی ہے، وہی اُبھرے ہوئے حرفون مین چھپکر پچاس روپیہ کی ہو جاتی ہے اور ضخامت چھ گنی بڑھ جاتی ہے۔

جو رسالے اندھون کے لئے چھپتے ہین اُن سب مین "ویلگر میگزین" بہت مشہور ہے، جو اندھون کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے، کتابون کی قیمت چونکہ گران ہوتی ہین، اسلئے ہر اندھا نہین خرید سکتا، بلکہ لائبریریون سے لیکر اپنی ضرورت پوری کرتا ہے، درخواست کرنے پر لائبریریون سے کتابین اُسکے پاس بھیجدی جاتی ہین، اور ڈاکخانہ اُن کتابون کے لئے محصول ڈاک معاف کردیتا ہے۔

لندن مین اندھون کا سب سے بڑا اور بہترین کتبخانہ ہے، کتابین اُبھرے ہوئے حروف (برنی) مین چھپی ہین، برنی وہ حروف تہجی ہین جنکو ۱۸۲۱ء مین برنی صاحب نے ایجاد کیا ہے،

برنی صاحب فرانس کے رہنے والے تھے، اور خود بھی اسی بلائے تاریک مین مبتلا تھے۔

اِن حروف تہجی سے الفاظ بنانے کا یہ طریقہ ہے کہ چھ نقطون کو ایک قطار مین جما لیتے ہین جو تین نقطون کے برابر گہرے، اور دو نقطون کے برابر چوڑے ہوتے ہین، انھین نقطون کے مختلف اتصال سے تمام الفاظ بنتے ہین جنھین اندھے ہاتھ رکھکر معلوم کر لیتے ہین۔

امریکہ مین متعدد مدرسے اندھون کی تعلیم کے لئے قائم ہین، اور انھین سے بہت سے اندھے فارغ التحصیل ہوکر نہایت فارغ البالی سے زندگی بسر کر رہے ہین، ایک اندھون کے سکول کی رپورٹ مین لکھا ہے کہ ہمارے یہان تقریبًا ایکہزار سے زیادہ اندھے مندرج رجسٹر ہین جنھین سے دوسو سند حاصل کر چکے ہین، اور باقی کامیابی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہے ہین، پاس شدہ اندھے مختلف کام انجام دے رہے ہین، اور بعض بعض دوسرے مدرسون مین معلم ہین،

اِن حالات کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوسکتا ہے کہ امریکہ مین اندھون کی تعلیم کے لئے جو انتظامات ہین، اُس پیمانے پر یہان آنکھ والون کے لئے بھی نہین ہین۔ تا بکوران چہ رسد،

مئی نمبر مین کلام جوہر، جو تنقید شائع ہوئی ہے، اُسکے متعلق مولوی عبدالماجد صاحب بی اے تحریر فرماتے ہین۔

کلام جوہر پر جو ریویو شایع ہوا ہے اُسمین یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے، کہ مولانا کے بعض مصرعون کا حرف بحرف دوسرے شاعرون کے کلام سے توارد ہوگیا ہے۔

اِس غلط فہمی کی تصحیح ضروری ہے، دوسرے شاعرون کے جو مصرعے کلام جوہر مین نظر آتے ہین، وہ بر بنائے توارد نہین، بلکہ حضرت جوہر نے بالقصد انھین اپنے کلام مین ضم کیا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح طور پر یون کہنا چاہیئے کہ دوسرون کے بعض مصرعہ لیکر اُنھین پر اپنی غزل تیار کی ہے، اور جا بجا اُن مصرعون کو اپنے کلام مین شامل کرتے گئے ہین۔ چھندوارہ کی نظر بندی کے زمانہ مین متعدد غزلین کہی تھین، اور اُنھین سب سے اول بار میرے نام کے عنایت ناموں مین تحریر فرمایا تھا ان مین دوسرون کے مصرعون کو بہیئے علامات اقتباس کے اندر درج فرمایا ہے۔

غالب کی مشہور غزل اس زمین مین ہے، خدا اور سہی، جفا اور سہی، ایک شعر یہ ہے ؎

بُت ہو تم پھر بھی تمھین سپندارِ خدائی کیون ہے — تم خداوندہی کہلاؤ خدا اور سہی

جوہر اپنے مکتوب گرامی مین عنوان پر یہ مصرعہ لکھتے ہین، "تم خداوندہی کہلاؤ خدا اور سہی۔ نیچے اپنی غزل درج کرتے ہین اور اس مین اس مصرعہ پر پیش مصرعہ اپنی طرف سے لگاتے ہین،

رب عزت کے لئے ابھی کوئی رہنے دو خطا — تم خداوند الخ

اور اپنے اسی خط مین اس دوسرے مصرعہ کو علامات اقتباس کے اندر تحریر کرتے ہین۔

یہ ایک مثال مین نے لکھدی۔ اس طرح کی متعدد مثالین میرے نام کے خطوط مین محفوظ ہین۔

سلام کے بعد" والے حضرت آسی کے جس مطلع توارد کا ذکر کیا گیا ہے، اُسکی بھی بعینہٖ یہی صورت ہے یعنی یہ مطلع حضرت جوہر کا کسی معنی مین بھی نہین، حضرت آسی ہی کا ہے، جوہر نے اسے اپنی غزل کا عنوان بنا کر اسپر اپنی غزل کہی ہے۔ یہ محض چھاپنے والون کی بے توجہی اور غلطی ہے کہ اُنھون نے اس قسم کے اقتباسات کو کتابت مین جوہر کے کلام سے ممتاز نہین کیا۔ مولانا اگر آزاد ہوتے، اور پروف اُنکی نظر سے گذرے ہوتے تو اُنھون نے یقیناً ان غلطیون کی اصلاح کردی ہوتی۔ والسلام۔ عبدالماجد

ریاست بڑودہ کی علم دوستی،،

سنہ ۱۹۱۱ء ریاست مین ۲۷۵ کتبخانے تھے مگر اب انکی تعداد ۶۲۸ ہے، کتابین پہلے ۵۵۷۳۶ تھین لیکن اب ۲۹۳۶۹۸ ہین، اسی نسبت سے ناظرین کی تعداد مین بھی اضافہ ہورہا ہے، خاص بڑودہ کے کتبخانے مین ۹۰ ہزار سے زیادہ کتابین ہین۔ ناظرین کے ذوق وشوق کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۱۹۲۲ء مین ۸۰ ہزار کتابین لائبریری سے مطالعہ کے لئے باہر گئین، مرکزی کتب خانہ بڑودہ مین عورتون کے لئے الگ کتبخانہ ہے، اس کتبخانہ سے دس ہزار سے زیادہ کتابین مطالعہ کے لئے باہر جاچکی ہین۔

یہان سفری کتب خانے بھی ہین جو ذوق مطالعہ کے حقیقی رہنما ہین، ان کتبخانون نے ایک سال مین دس ہزار سے زیادہ کتابین مطالعہ کے لئے تقسیم کی ہین، کاش دوسرے والیان ریاست اور ذی حوصلہ رؤسا کتب خانون کی ضرورت اور اہمیت پر نظر فرمائے اور ہندوستان کے ہر گوشے مین اس قسم کے کتبخانے قایم ہوجاتے۔

علمی حوصلہ افزائی

تاریخ عالم شاہد ہے کہ اکثر ارباب ہنر ناقدردانی زمانہ کا شکار ہوئے، علم حاصل کیا،

شہرت نصیب ہوئی، مگر دولت سے بے بہرہ اور افلاس مین مبتلا رہے، انجام کار اپنے ابنا جنس کی ناقدردانیون کا گلہ کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وہ ممتاز اہل قلم جنھین اپنے زمانہ مین معراج کمال نصیب ہو چکی تھی (اور آجتک جنکے کمالات سے دنیا فیض اٹھا رہی ہے) عموماً مفلسی و تنگدستی مین گرفتار تھے، عمر بھر دنیاوی دولت و ثروت سے متمتع نہوئے، اکثر یہ بھی ہوا کہ جیتے جی اُنکا نام بھی مشہور نہ ہوا، البتہ مرنے کے بعد اُنکے کارنامے قدر کی نگاہون سے دیکھے جانے لگے اور اُنھین وہ عزت نصیب ہوئی جسکے وہ زندگی مین آرزومند تھے

واقعات کا مطالعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ علم کو دنیاوی دولت سے زیادہ لگاؤ نہین، اسباب کچھ ہون لیکن ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آتا ہے کہ ارباب علم ناقدردانیٔ زمانہ کو عمر بھر روتے رہے۔

ہندوستان کے نامور شعراء و اہل علم بھی ہمیشہ تقدیر کا شکوہ کرتے رہے، اگر کسی ذی حوصلہ اُولوالعزم شخص نے اُنکی حوصلہ افزائی بھی کی تو اُنکے کمالات کے مقابلے مین اُسکی کچھ حقیقت نہ تھی

یہان وہی پرانی روش آج بھی قائم ہے، اور علم کی ویسی ہی کساد بازاری ہے، لوگ مزدوری کرنا اچھا سمجھتے ہین لیکن ایک عالم اور ادیب بننا پسند نہین کرتے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج سنسکرت زبان قریب قریب ہندوستان سے رخصت ہو چکی ہے، اُردو زبان جسنے بادشاہون کے محلون مین پرورش پائی ہے، فنا ہو رہی ہے، اگر کسی نے بدقسمتی سے اُردو ادب مین آگے بڑھنے کی جرأت بھی کی تو زمانہ کی ناقدردانیون نے اُسے پیچھے ڈھکیل دیا اور ابنائے زمانہ کو ایک مضحکہ کا موقع ملگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بجز قدردانی و حوصلہ افزائی کے علم کی اشاعت نہین ہوتی، یورپ جسکی علمی ترقی آج ساری دنیا کو محو حیرت بنا رہی ہے اسی کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہان اہل علم کی حوصلہ افزائی اسقدر عام ہے جسکی مثال دنیا کے اور خطون مین نہین مل سکتی۔

خان بہادر شمس العلماء مولوی محمد یوسف صاحب جعفری لکچرار عربی فارسی کلکتہ یونیورسٹی کا پٹنہ مین ۹ جون کو طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی تیار کردہ ۱۹۲۳ء کی کافوری جنتری نہایت خوبصورت چکنے کاغذ پر چھپی ہے اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ بھیج دیجئے۔ مذکورۂ بالا جنتری آپکی خدمت میں روانہ کر دیجائیگی۔

خاص ڈاکٹر ایس کے برمن کے کیمیا خانہ کا تیار کردہ کیشراج تیل

فائدہ اور خوشبو کے لحاظ سے یہ ایک ہی تیل ہے

آجکل سیکڑوں قسم کے خوشبودار تیل بازار میں بکتے ہیں جو ظاہری چمک دمک اور خوشبو میں ایکدوسرے سے بڑھکر ہوتے ہیں مگر ان تیلوں میں وائٹ آئل عموماً مضر ہوتا ہے۔ جو بجائے فائدہ کے دماغ اور بالوں کو سخت نقصان پہونچاتا ہے ایسے تیلوں کے چند روزہ استعمال سے بال بوقت سفید ہو جاتے ہیں آنکھ اور دماغ سے خاص تعلق ہے اسلئے ایسے تیل دماغ میں گرمی پہونچا کر آنکھ کو بھی نقصان پہونچاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آجکل کے نوجوانوں کو بوقت چشمہ کی ضرورت ہو جاتی ہے ان سب خرابیوں کو مدنظر رکھ کر کیشراج تیل کی تیاری میں خوشبو سے زیادہ فائدہ کا خیال رکھا گیا ہے اسکے لگانے سے جڑیں مضبوط اور بال شیل بھونرے کے سیاہ اور گھونگھر والے ہو جاتے ہیں یہ دماغ کو ٹھنڈک اور دلکو فرحت پہونچاتا ہے قیمت خہ محصول ۱۔

ھیلک

یہ ہر قسم کے گھاؤ۔ درد۔ باتھ۔ پیچ۔ گانٹھ۔ گلٹی۔ جھائیں۔ محاسہ۔ چکتہ۔ ہاتھ پیروں کا پھٹنا۔ روکھاپن۔ بواسیر آگ سے جلے ہوئے گھاؤ۔ جلن چوٹ کی وجہ سے درد یا فون کا بہنا وغیرہ وغیرہ کے لیے حکمی دوا ہے۔ چوٹ۔ بی۔ مکڑی برنی۔ بچھو کے کاٹے ہوئے جگہ سے زہر دور کرنے کے لیے ھیلک ایک شرطیہ دوا ہے۔ فٹ بال۔ کرکٹ۔ جمناسٹک کے کھلاڑیوں کے لیے ھیلک روزانہ استعمال کی چیز ہے۔ اسکے لگانے سے کسی قسم کی جلن وغیرہ نہیں ہوتی۔ فی زمانہ اس قسم کی تمام دواؤں کے تجربہ کرنے پر ھیلک سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے۔ ہر گھر گرہست کو ھیلک کی ایک ڈبیہ ضرور رکھنا چاہیے۔ قیمت فی ڈبیہ ۱۰ر محصول ڈاک ۶ر

ایجنٹ۔ دیبی دین اینڈ سنز۔ کلکٹر گنج۔ کانپور۔

پتہ۔ ڈاکٹر ایس۔ کے برمن نمبر ۵ تارا چند اسٹریٹ۔ کلکتہ

اخبار آزاد کانپور

اردو کا بہتر ملکی اخبار جو ایڈیٹر زمانہ کی زیر نگرانی ہر پنجشنبہ کو کانپور سے شایع ہوتا ہے آزاد ملکی واقعات کا ایک مکمل آئینہ ہے۔

قیمت سالانہ للہ ششماہی ۸ء نمونہ مفت۔ منیجر آزاد کانپور

بابتمام منشی دیابرائن نگم زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قوت بڑھانیوالی عجیب طاقت دینے والی تمام قسم کے جریان اور سلسل البول
دور کرنیوالی ہمالیہ پربت کی اکسیر اعظم دوا

شدھ سلاجیت

اسکے استعمال سے خواب میں احتلام ہونا اور دھات کا پتلا پڑ جانا تمام قسم کے جریان اور پیشاب کا بار بار آنا ہمت کی سستی دور کر تھکاوٹ۔ بھوک کم لگنا۔ داعی طاقت کا کم ہو جانا۔ کھانسی اور معدے سے خون آنا۔ کھٹا ہو جانا۔ تمام بدن میں درد ہونا۔ بواسیر خونی و بادی۔ سفید کوڑھ۔ سوزاک جدید و کہنہ اور مرگی کی بیماریوں کو دور کرتا ہے۔

قیمت ۵ تولہ ۱۰ تولہ ۱۵ تولہ خرچہ ڈاک ۵ر
قیمت ۲۰ تولہ ۴۰ تولہ ۵۰ تولہ " " ۱۰ر

برہمی بوٹی ٹبکا

اسکے تھوڑے ہی دن استعمال کرنے سے یادداشت بہت تیز ہو جاتی ہے اور حافظہ کو جسم کی خوبصورتی اور گٹھن کو۔ آنکھوں کی روشنی بڑھانے کو بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ وکیل۔ بیرسٹر۔ طلبہ۔ ڈاکٹر۔ انجینیر۔ انجینیر غرض یہ کہ دماغ کا کام کرنے کے لیے ہر انسان کو ضرور استعمال کرنی چاہیے۔ یہ گویائی کو بڑھ۔ یرقان۔ بواسیر۔ کھانسی نزلہ سوجن وغیرہ کو آرام کرتی ہے اور موٹی آواز کو صاف اور باریک کرتی ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ بغیر خرچ ڈاک ۵ر تین ڈبیوں کے خریدار کو خرچ ڈاک معاف۔

سوزاک کی دوا

اس دوا کے سات روز استعمال کرنے سے کیسا ہی پرانا سوزاک ہو فوراً آرام ہو جاتا ہے دو خوراک دوا کھاتے ہی پیشاب کی جلن۔ کرک اور پیلی رنگت جاتی رہتی ہے دھار کے ساتھ پیشاب ہونے لگتا ہے مواد اور خون بند ہو جاتا ہے سات روز استعمال کرنے سے سوزاک بالکل صحت ہو جاتی ہے قیمت صرف دو روپیہ خرچہ ڈاک ۵ر (نوٹ) پرچہ ترکیب استعمال ہر دوا کے ہمراہ روانہ کیا جاتا ہے۔

المشتہر

منیجر ہمالیہ ڈپو۔ مراد آباد۔ یوپی

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔